تاریخ دارالعلوم دیوبند

برصغیر کے مسلمانوں کا سب سے بڑا دینی کارنامہ

اسلامی تعلیم وثقافت اور ملت کی نشاۃِ ثانیہ کا سرچشمہ
دارالعلوم دیوبند کی عظیم دینی وعلمی خدمات اور سیاسی سرگرمیوں کا تاریخی جائزہ

مقدمہ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ

مصنف

سید محبوب رضویؒ

تاریخ دارالعلوم دیوبند

برصغیر کے مسلمانوں کا سب سے بڑا دینی کارنامہ

اسلامی تعلیم وثقافت اور ملت کی نشاۃ ثانیہ کا سرچشمہ

دارالعلوم دیوبند کی عظیم دینی وعلمی خدمات اور سیاسی سرگرمیوں کا تاریخی جائزہ

مقدمہ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رح

مصنف

سید محبوب رضوی رح

المیزان ناشران و تاجران کتب

الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور پاکستان فون: ۰۴۲-۷۱۲۲۹۸۱، ۷۲۱۲۷۶۲

bestu...books.wordp...s.com

المیزان

عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ

سلسلہ مطبوعات - ۱۰۰

سن اشاعت ۲۰۰۵ء

محمد شاہد عادل نے

حاجی حنیف پرنٹرز سے چھپوا کر

المیزان اُردو بازار لاہور سے شائع کی۔

فہرست مضامین

باب چہارم

باب پنجم

اربابِ اہتمام ۲۲۱

دارالعلوم کے مفتیانِ کرام ۲۴۵

باب ششم

باب ہفتم

باب ہشتم

پیش لفظ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دار العلوم دیوبند

تیرھویں صدی ہجری کے برصغیر میں مسلمانوں کے سامنے دو اہم مسئلے تھے جن کا آغاز حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے عہد سے ہو چکا تھا، ایک مسئلہ مسلمانوں کے عقائد و اعمال کے تحفظ کا تھا اور دوسرے کی نوعیت سیاسی تھی جس کا مقصد ہندوستان کو انگریزوں کے اقتدار سے نجات دلانا تھا، شاہ صاحب کے بعد حضرت سید احمد شہید، حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اسلامی قدروں کی حفاظت کی تحریک کو آگے بڑھایا۔ یہ حضرات اقتصادی اور معاشرتی اصلاح کی زبردست جدوجہد میں مصروف رہے، انھوں نے تباہ کن رسم و رواج کی مخالفت کی۔ اسلامی عقائد و مسائل کو عقلی دلائل سے واضح کیا، بیواؤں کے نکاح، عورتوں کے حقِ وراثت اور معاشرتی اونچ نیچ کو درست کرنے کی بھرپور کوشش کی اور دوسرے مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے دینی مدارس قائم کئے اور حقیقت یہ ہے کہ اُن کی مساعی کا برِصغیر کے ہر گوشے پر بڑا اثر پڑا اور مسلمانوں کی بڑی تعداد اس سے متاثر ہوئی۔

بایں ہمہ یہ امر واقعہ ہے کہ باہر کی دنیا بالخصوص ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ دار العلوم کی ان خصوصیات سے بڑی حد تک ناواقف ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ دار العلوم شروع سے جس جماعت کے ہاتھوں میں رہا اس کا اصول یہ تھا کہ کام زیادہ ہو اور اظہار کم، لیکن اب مصالح کا

تقاضا ہے کہ دارالعلوم نے جو کچھ کیا ہے اس سے باہر والوں کو بھی روشناس کرایا جائے اور ہندوستان بالخصوص مسلمانوں کی آئندہ لکھی جانے والی تاریخ کے لئے مواد فراہم کیا جائے اور ان غلط فہمیوں کو دور کیا جائے جو دارالعلوم کے متعلق مختلف وجوہ سے جدید تعلیم یافتہ طبقے یا عام مسلمانوں میں پھیلی ہوئی ہیں، یہ دور لٹریچر اور تصنیف کا دور ہے، اگر خدام دارالعلوم اپنی قناعت پسندانہ اور متواضعانہ روش کے مطابق اس دور کے تقاضے سے بے اعتنائی برتتے رہے تو ممکن ہے کہ ہمارے مزاج اور وضع کے اعتبار سے تو یہ چنداں نقصان دہ نہ ہو، مگر آنے والی نسلوں اور خود موجودہ دور میں بھی یہ بات رسائل وجرائد اور کتب کے ذریعہ اداروں شخصیات اور تحریکوں کو جاننے پہچاننے والے بیشمار افراد کے حق میں یقیناً مفید نہ ہوگی اور وہ برِصغیر کے مسلمانوں کے اس وقیع دینی علمی اور ثقافتی کارنامے کو صحیح طور پر پہچاننے سے قاصر رہینگے، جسکی قدر وقیمت آج سے زیادہ کل محسوس کیجانیوالی ہے، کیونکہ یہ اسلامی اور دینی مرکز برِصغیر کے مسلمانوں کا عظیم ملّی سرمایہ ہے!

میری مدت دراز سے یہ دلی تمنا تھی کہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ پر کوئی تحقیقی اور مؤرخانہ انداز کی وقیع چیز تیار ہو، دوسری یہ کہ مسلک دارالعلوم دیوبند کا تعارف نہایت بلیغ مستند اور جامع طریق پر کرایا جائے، تیسری یہ کہ دارالعلوم دیوبند کی ایک مکمل مبسوط اور مؤثر تاریخ لکھی جائے۔

ابتدائی دونوں موضوعات پر احقر نے کچھ مواد ترتیب دیا ہے، مگر وہ ابھی مسودہ سے مبیضہ کی شکل اختیار نہیں کرسکا اور کتابی صورت میں اشاعت کا منتظر ہے۔

تاہم میری یہ تیسری آرزو اللہ تعالیٰ نے سید محبوب رضوی صاحب جیسے شگفتہ نگار اہلِ قلم اور صاحبِ نظر مؤرخ کے ذریعہ پوری کرادی جنہیں ذمہ داران دارالعلوم دیوبند نے اس خدمت کے لئے منتخب کیا، انھوں نے تاریخ دارالعلوم دیوبند پر نہایت خوش اسلوبی جامعیت اور تحقیق کے ساتھ قلم اٹھا کر اپنی سعی و محنت کی حد تک اس موضوع کا حق ادا کردیا ہے اور اتنی تندہی، لگن اور برق رفتاری کے ساتھ اس عظیم خدمت کو انجام دے دیا

کہ ابھی پہلی جلد کی تکمیل کو تھوڑا ہی عرصہ گذرا ہے کہ دوسری جلد ہدیۂ ناظرین کی جارہی ہے، ان کی اس محنتِ شاقّہ پر اللہ تعالےٰ انھیں اجرِ عظیم عطا فرمائے، اس پر وہ ہم سب کی طرف سے یقیناً خراجِ تحسین کے مستحق ہیں۔ اُمید ہے کہ جلد اوّل کی طرح دوسری جلد بھی اربابِ نظر کے لئے ایک وقیع علمی سوغات ثابت ہو گی۔

محمد طیّب غفرلہٗ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۵ ربیع الاوّل ۱۳۹۸ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد اوّل گزشتہ سال طبع ہوئی تھی، جسے علمی اور ادبی حلقوں میں عام طور پر پسند کیا گیا، اس قبول عام کے لئے راقم سطور بارگاہِ ایزدی میں سراپا نیاز اور شکر گذار ہے کہ اُس نے اپنے ایک ناتواں بندے کو دارالعلوم دیوبند کی اس عظیم خدمت کے انجام دینے کی توفیق عطا فرمائی۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ، قادر ذوالجلال جس سے جو کام چاہے لے لیتا ہے، وہ تنکے سے چاہے تو شہتیر کا کام لیلے اور ذرّے کو چٹان کی قوت بخش دے، دادِ اُو را قابلیت شرط نیست!

تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد اوّل کا عربی اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ شروع ہو چکا ہے، اُمید ہے کہ دونوں ترجمے انشاء اللہ تعالےٰ ایک سال میں پورے ہو جائیں گے۔

اب جلد دوم آپ کے سامنے ہے، اللہ تبارک وتعالےٰ اسے بھی شرفِ قبولیت بخشے۔

دارالعلوم دیوبند کی تاریخ اس زمانے میں درحقیقت مسلمانوں کے سب سے بڑے دینی کارنامے کی ایک اہم دستاویز ہے، یہ تاریخ اسلامی علوم وفنون اور مسلمانوں کے عقائد واعمال کے بہت ہی نازک دَور کی تاریخ ہے، علوم اسلامیہ کے انحطاط وزوال کے زمانے میں صرف دارالعلوم دیوبند ہی تھا جس نے علم نبوت کے

چراغ کو بادِ مخالف کے پیہم تھپیڑوں کے باوجود روشن رکھا اور برِّ اعظم ایشیا کے طالبانِ علم نبوی کو اپنی آغوش میں لے کر انھیں علمی انتشار اور پراگندگی کی حالت سے نکال کر اس قابل بنادیا کہ وہ علمی حیثیت سے اسلام کی تبلیغ واشاعت کا فریضہ انجام دے سکیں!

دارالعلوم دیوبند محض ایک تعلیم گاہ ہی نہیں بلکہ ایک وسیع تر دینی تحریک ہے جو اپنے عظیم مقصد اور طریقۂ تعلیم میں انفرادی شان لئے ہوئے ہے، علمائے دارالعلوم دیوبند ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ" پر عمل پیرا رہے ہیں اور انھوں نے ہمیشہ "مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي" کی ترجمانی کی ہے انھوں نے صراطِ مستقیم پر چلنے کے لئے اس طریق کو اپنایا ہے جو اسلام کے مزاج کے عین مطابق ہے۔

دارالعلوم دیوبند دینی علوم میں کامل رسوخ اور اتباعِ سنت میں پختگی کی بنا پر برِّ صغیر میں اپنی ایک امتیازی شان رکھتا ہے، خصوصاً علم حدیث کی تعلیم و تدریس میں اس کا ایک منفرد اسلوب ہے جو اسے تمام دوسرے مدارسِ دینیہ سے ممتاز بناتا ہے، اس کا درسِ حدیث بین الاقوامی شہرت اور عظمت کا حامل رہا ہے، چناں چہ آج بے شمار اسلامی مدارس طریقِ تعلیم اور نظم و نسق میں دارالعلوم دیوبند ہی کے نقشِ قدم پر قائم ہیں!

دارالعلوم دیوبند نے مسلمانوں کے قابلِ فخر ماضی کو زندہ رکھنے، حال کو دینی توانائی بخشنے اور مستقبل کو اسلامی قدروں کے مطابق روشن اور تابناک بنانے کے لئے جو قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے، وہ اس کا ایسا سرمایۂ افتخار ہے جسے ملّتِ اسلامیہ کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی، دارالعلوم دیوبند برِّ صغیر میں اسلامی زندگی کا بے خوف علم بردار، امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کا داعی، شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر کا

مبلّغ، شاہ عبدالعزیزؒ کے علم کا شارح اور مولانا محمد اسمٰعیل شہید کے جذباتِ حریت کا سب سے بڑا امین رہا ہے، دارالعلوم دیوبند دینی علوم کی ایک مؤثر اور فعال تحریک ہے، اس تحریک نے مُسلمانوں کے عقائد و اعمال کے خس و خاشاک کو جُدا کر کے اُنھیں دینِ خالص سے روشناس کرایا، شرک و بدعات کے رسم و رواج اور باطل توہّمات سے اُنھیں نجات دلائی، اور اسی کے ساتھ مُسلمانوں کے دلوں سے برطانوی حکومت کا ڈر اور خوف و ہراس دُور کر کے انھیں سیاسی اعتبار سے اس لائق بننے میں مدد دی جس سے وہ آزادیٔ ملک کی تحریک میں قائدانہ طور پر حصّہ لیکر مُسلمانوں کے ملّی وقار کو بلند کر سکیں، غرض کہ تعلیمی، تبلیغی، اصلاحی اور سیاسی لحاظ سے زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں دارالعلوم نے اپنی گراں قدر خدمات کا نقش نہ بٹھایا ہو، اسی کے ساتھ یہ بات بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی کہ اس تحریک کا دائرہ صرف برِّصغیر تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ دور دور تک اس کا حلقۂ اثر وسیع ہو گیا، چنانچہ دارالعلوم دیوبند صرف برِّصغیر ہی کا نہیں بلکہ برِّاعظم ایشیا کا علمی اور دینی مرکز بن گیا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے فیضِ تعلیم سے ہزاروں علمار مشائخ، مفکر و مبلغ، قائد و مصنّف اور اہلِ قلم پیدا ہوئے، جنھوں نے برِّصغیر کی اسلامی تاریخ میں انقلاب آفریں مقام حاصل کیا ہے، ان کے علمی، دینی، تعلیمی، تصنیفی، تبلیغی اور اصلاحی کارنامے بڑی اہمیت رکھتے ہیں، خصوصاً رُشد و ہدایت، تعلیم و تدریس اور وعظ و تبلیغ کے میدانوں میں یہ سب سے آگے نظر آتے ہیں، اُنھوں نے مُسلمانوں کی رہنمائی میں کبھی کوتاہی سے کام نہیں لیا، ان کی عظیم خدمات مُسلمانوں کی زندگی کے کسی خاص گوشے یا کسی ایک پہلو میں محدود نہیں ہیں بلکہ علمائے دارالعلوم دیوبند نے ہر سطح پر اسلام اور مُسلمانوں کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے، یہ ہر دَور میں اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے کمربستہ رہے ہیں، اسلام کو دیئے جانے والے ہر چیلنج کا اُنھوں نے سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا ہے، دارالعلوم دیوبند اور اسکے

نقش قدم پر چلنے والے دوسرے دینی مدارس نے جن کا پورے برِ صغیر میں جال پھیلا ہوا ہے، ملّتِ اسلامیہ کی جو مہتم بالشان خدمات انجام دی ہیں انھیں مسلمانوں میں غیر معمولی مقبولیت اور عظمت حاصل ہے۔

علمائے دارالعلوم دیوبند کے مختلف النوع کارناموں کو چند محدود اوراق میں سمیٹنا بڑا مشکل ہے، ان خدمات کی تفصیل کے لئے کئی ضخیم جلدیں چاہئیں، خصوصاً اس سلسلے میں فرزندانِ دارالعلوم دیوبند کا تذکرہ لکھے جانے کی بڑی ضرورت ہے جن کی تعداد بارہ ہزار کے قریب ہے۔

میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور علمائے دارالعلوم کے سب نہیں تو کم از کم اہم پہلو ضرور سامنے آجائیں، اب جب کہ دارالعلوم دیوبند پر لکھنے کا آغاز ہو چکا ہے تو اُمید رکھنی چاہیے کہ آئندہ اس موضوع پر وقتاً فوقتاً اور بھی مفید تحریریں سامنے آتی رہیں گی، اہلِ قلم فضلائے دارالعلوم دیوبند کا یہ اہم فریضہ ہے کہ وہ اپنی مادرِ علمی کو اپنی نگارشات کا موضوع بنالیں اور دارالعلوم دیوبند کے مختلف گوشوں کو زیادہ بہتر طور پر پیش کرنے کی کوشش کریں۔ اُمید ہے کہ اس موضوع پر کام کرنیوالوں کیلئے یہ آغاز بہتر ثابت ہوگا، نیز یہ کہ تمام مدارسِ دینیہ کی ایک جامع تاریخ مدون ہونی چاہئیے جس میں مدارسِ دینیہ کے کارناموں کا دقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے، یہ ایک بہت ضروری کام ہے جس پر مدارسِ دینیہ کے اہلِ قلم حضرات کو توجہ دینی چاہیے۔

اس جلد کے آخر میں مثنوی فروغ کا ایک طویل اقتباس شامل ہے اس مثنوی کی نسبت یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ مثنوی دارالعلوم دیوبند کی ایک قدیم ترین منظوم تاریخ ہے، مگر یہ عجیب بات ہے کہ مدّت سے یہ گمنامی میں پڑی ہوئی تھی، حالانکہ مثنوی فروغ دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی حالات کا ایک دلچسپ مرقع ہے، اور چشم دید شہادت ہونے کی وجہ سے مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے، مثنوی فروغ اُس وقت لکھی گئی تھی جب دارالعلوم دیوبند

اپنی عمر کے ابتدائی دَور سے گزر رہا تھا اور "مدرسہ اسلامی عربی" کے نام سے موسوم تھا مگر اس زمانے ہی میں اس کی غیر معمولی مقبولیت اور شہرت سے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ مدرسہ ایک عظیم دارالعلوم کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے، مثنوی کے مصنف نے اس کا اظہار مثنوی کے ایک مصرع میں یوں کیا ہے:

دیوبند، اب ہو گیا دارالعلوم

مثنوی فروغ سے دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی زمانے کے حالات، درس و تدریس تعلیم و تعلّم کی کیفیت، اس کی شہرت و مرکزیت کے علاوہ اکابرِ دارالعلوم کے علم و فضل، زُہد تقویٰ، کارکنوں کی امانت و دیانت کی نسبت عام مُسلمانوں کے دلوں میں جو تصورات اُس وقت قائم تھے اُن کا ایک ایسا مرقع اس میں نظر آتا ہے جو کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتا۔ اس لئے مثنوی فروغ کے ضروری حصّے تاریخ دارالعلوم دیوبند میں شامل کرلئے گئے ہیں۔

آخر میں دارالعلوم دیوبند کے سالانہ آمد و صَرف، تعمیرات، اساتذہ اور کارکنوں کے گوشوارے دیئے گئے ہیں، اعداد و شمار سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اُمید ہے کہ یہ گوشوارے کارآمد اور معلومات افزا ثابت ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ ان اوراق کو قبول فرمائے اور قارئین کے لئے مفید کارآمد اور نفع بخش بنائے! وما توفیقی اِلّا باللہ!

مولانا عبدالحق صاحب معتمد دفتر اہتمام نے تاریخ دارالعُلوم دیوبند کی جلد اوّل و دوم کی کاپیوں کی تصحیح جس محنت اور توجہ سے کی ہے اس کے لئے میں مولانا موصوف کا بصمیم قلب ممنون اور شکر گزار ہوں۔

سیّد محبوب رضوی
دارالعُلوم دیوبند

۲۷ محرم الحرام ۱۳۹۸ھ — ۷ جنوری ۱۹۷۸ء

باب چہارم

علمائے مشاہیر

اگر برِصغیر میں گزشتہ سَو سال کی علمی، دینی، ملّی اور سیاسی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اکابر علمائے دارالعلوم دیوبند نے کس طرح کتاب وسنّت کی حفاظت کا اہم ترین فرض ادا کیا ہے، علمائے دارالعلوم دیوبند نے اس دَور میں جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں وہ بلاشبہ آپ اپنی مثال ہیں۔ ان کا اوّلین عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سلطنت کی امداد اور تعاون سے محروم ہو جانے کے باوجود عام مُسلمانوں کے تعاون اور چندے کے ذریعے سے دینی علوم اور اسلامی مدارس کے قیام کی عالمگیر تحریک شروع کی[1]۔ اللہ تعالےٰ کے

---

[1] دارالعلوم دیوبند نے چندے کا جو نظام قائم کیا وہ نہایت آسان اور سہل تھا، اس کی کسی قدر تفصیل اوپر گزر چکی ہے، پہلے سال کی جو روداد شائع ہوئی ہے اس میں چندے کے بارے میں یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ "چندے کی کوئی حَد مقرر نہیں ہے اور نہ مذہب وملّت کی کوئی خصوصیت ہے"! اس کا یہ مطلب ہے کہ ایک پیسہ بھی چندے میں دیا جا سکتا ہے، چندے کے لئے نقد ہونا بھی ضروری نہیں ہے، بلکہ غیر منقولہ اشیاء کھانا، کپڑا اور کتابیں وغیرہ دوسری چیزیں بھی دی جا سکتی ہیں، چندے میں یہ سہولت (باقی آئندہ صفحہ پر)

فضل وکرم سے ان کی یہ تحریک مسلمانوں میں مقبول ہوئی، چنانچہ برِصغیر میں جگہ جگہ دینی مدارس جاری ہو گئے، جن میں اُس وقت سے اب تک برابر اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ ہمارے اکابر دینی تعلیم کو حکومت کے اثر سے آزاد رکھ کر ذہنی آزادی کو برقرار رکھنا چاہتے تھے، تاکہ آزاد تعلیم کے ذریعے سے ایک ایسی نسل عالم وجود میں آئے جس کا دل و دماغ حکومت کی امداد کا مرہونِ احسان نہ ہو، اور جو ہر حیثیت سے آزاد فکر کے ساتھ علم و عمل کی زندگی بسر کر سکے۔ مولانا سیّد محمد میاں صاحب نے لکھا ہے کہ :-

"درحقیقت ان مدارسِ عربیہ کا قیام مسلمانوں کے لئے نعمتِ عظمیٰ ثابت ہوا، اسلامی تہذیب و معاشرت کے جو کچھ آثار آج ہندوستان میں نظر آ رہے ہیں وہ انہیں مدارس کی برکت ہے، علمِ دین اور پابندئ شریعت کی وہ روشنی جو دوسرے آزاد ممالک کو ابھی تک نصیب نہیں، ہندوستان کو اس امتیازی شان کے ساتھ صرف انھیں مدارس کے ذریعے سے حاصل ہوئی ہے، اور جب تک ان مدارس کا نظام ہندوستان میں آزادانہ طور پر باقی ہے اس روشنی کی ضیاء پاشیوں کو کوئی طاقت نقصان نہیں پہنچا سکتی"[1]

سیّد رشید رضا لکھتے ہیں :-

"میں نے مدرسہ دیوبند میں جس کو ازہر الہند کا خطاب دیا جاتا ہے ایک علمی تحریک دیکھی جس سے نفع عظیم کی توقع ہے"[2]

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) بہت مفید کارآمد اور اندازے سے بڑھ کر نتیجہ خیز ثابت ہوئی، اس سہولت کے تحت جو لوگ نقد پیش کرنے کی گنجائش نہ رکھتے تھے، اُنکو بھی اس کارِ خیر میں شرکت کا موقع مل گیا، یہ بات دینی مدارس کے قیام اور ترقی کے لئے بڑی سودمند ثابت ہوئی، اکابرِ دارالعلوم کی یہ بصیرت اور دور اندیشی آگے چل کر دوسرے اداروں اور انجمنوں کے لئے بھی مشعلِ راہ بن گئی، اگر غور کیا جائے تو چندے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ چندہ دہندگان کی خوش قسمتی سے انکی کمائی ایک ایسے صحیح ترین مَصرف میں صرف ہوتی ہے جس سے بڑھ کر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے!

[1] ہفت روزہ الجمعیۃ دہلی ۱۲ر نومبر ۱۹۷۱ء [2] ماہنامہ القاسم ذیقعدہ ۱۳۳۰ھ بحوالہ "المنار" - سید محبوب رضوی

۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء سے ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء تک ۱۱۴ سال کی مدت[1] میں دارالعلوم دیوبند نے صرف برِّ صغیر ہی میں نہیں بلکہ بہت سے ایشیائی اور افریقی ممالک میں اپنے فرزندوں کو پہونچا دیا ہے، جنھوں نے ہندوستان اور بیرونی ملکوں میں نمایاں دینی خدمات انجام دے کر نہ صرف دین وملت کی خدمات انجام دی ہیں بلکہ ہندوستان کا نام بھی روشن کیا ہے، چنانچہ شام (سوریا) کے ایک جلیل القدر عالم شیخ عبدالفتاح ابوغُدّہ جو ۱۳۸۲ء میں یہاں تشریف لائے تھے، اُنھوں نے اکابر علمائے دیوبند سے ملاقات کے بعد بڑے شدّ و مد سے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ علمائے دیوبند کی تصانیف کو عربی زبان میں منتقل کرنے کی بڑی ضرورت ہے، یہ اس لئے کہ ان کی تصانیف میں جو چیزیں ملتی ہیں وہ علمائے متقدمین کے یہاں بھی دستیاب نہیں ہیں، شیخ موصوف لکھتے ہیں:-

"ان علمائے کرام کا فریضہ ہے کہ اپنے متفردانہ عقول کے نتائجِ فکر اور بیش بہا علمی فیوض وتحقیقات کو عربی زبان کا جامہ پہنا کر عالمِ اسلام کے دوسرے علماء کے لئے استفادے کا موقع فراہم کریں، یہ فریضہ ان حضرات پر اس لئے عائد ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص ہندوستان کے علمائے محققین کی کوئی تصنیف پڑھتا ہے تو اس میں اس کو وہ نئی متفردانہ تحقیقات ملتی ہیں جن کا مدار گہرے علم اور وسیع مطالعے کے علاوہ تقویٰ وصلاح اور روحانیت ہوتی ہے اور چونکہ ہندوستان کے علماء وشیوخ کرام نیکی وصلاح اور روحانیت اور استغراق فی العلم جیسی شروط پر نہ صرف یہ کہ پورے اترتے ہیں بلکہ سلفِ صالحین کے صحیح وارث اور اُن کے نمونے ہیں اسلئے ان کی کتابیں نئی اور کارآمد چیزوں سے خالی نہیں ہوتیں ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔ بلکہ ان حضرات کی بعض کتابیں تو وہ ہیں جن میں ایسی چیزیں ملتی ہیں جو متقدمین علمائے اکابر مفسّرین ومحدّثین اور حکماء کے یہاں بھی دستیاب نہیں ہوتیں۔

---

[1] ۱۱۴ سال کی یہ مدت قمری حساب سے ہے، دارالعلوم دیوبندؔ کا مالی اور تعلیمی نظام قمری حساب پر مبنی ہے۔

یہ سب کتابیں اُردو زبان میں لکھی ہوئی ہیں، یہ علوم وبیش قیمت تحقیقات جو ہمارے علمائے ہند کا خصوصی حصّہ اور کارنامہ ہیں، اگر اُردو ہی کے قالب میں محبوس رکھی گئیں تو ہم عربی بولنے والوں سے مخفی رہکر محرومی کا باعث بنی رہیں گی۔ اس لئے یہ نہ صرف ہمارے ساتھ ہی بے انصافی ہوگی بلکہ علم دین کے حق میں بھی ایک بڑا نقصان ہوگا۔[1]

اس حقیقت کے اظہار میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ علمائے دیوبند کے علمی و دینی اور دوسری نوع کے عظیم کارنامے دارالعلوم کی تاریخ کا ایک مستقل موضوع ہے، تیرھویں صدی کے اواخر سے دارالعلوم دیوبند دینی علوم وفنون اور اسلامی تہذیب وثقافت کا گہوارہ بنا ہوا ہے۔ اسے ملک کے سب سے بڑے دینی تعلیمی مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے، چنانچہ ملک میں جب بھی کوئی مسئلہ پیدا ہوا اور مُسلمانوں نے کوئی مشکل محسوس کی تو ان کی نظریں خود بخود دارالعلوم دیوبند کی طرف اُٹھتی رہی ہیں، دارالعلوم کی آغوشِ علم سے ایسے ایسے علماء ومشائخ اور اصحابِ کمال اُٹھے ہیں جن کے علمی اور روحانی فیض سے بلاشبہ پورا ایشیا سیراب ہورہا ہے، علماء دیوبند ایک صدی سے زیادہ مدّت سے برِّصغیر کے مُسلمانوں کی علمی ودینی رہنمائی کے فرائض انجام دے رہے ہیں، دارالعلوم پورے ایشیا میں دینی تعلیم کی ایک مثالی درسگاہ ہے، یہ ایک ایسا چشمۂ صافی ہے جو کئی برِّ اعظموں کے تشنگانِ علم کو سیراب کر رہا ہے، ایک سو چودہ سال پہلے یہ ایک ننھا منا سا پودا تھا، مگر آج ایک ایسا تناور اور فیض بار درخت ہے جس کی شاخیں ایشیا کے مختلف ملکوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔

چنانچہ دارالعلوم دیوبند مُسلمانوں کے مذہبی حلقوں میں کسی مقام یا ادارے کے بجائے اپنے مسلک کی خصوصیات کے باعث زیادہ روشناس ہے، برِّصغیر کے مُسلمانوں کی دینی و ملّی بیداری میں علمائے دیوبند نے جو کردار پیش کیا ہے اُس کو بیان کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب

---

[1] روداد دارالعلوم دیوبند ۱۳۸۲ھ ص ۱۳

کی ضرورت ہے، کاش! کوئی باہمت شخص اس مہتم بالشان کام کو انجام دے سکے، دارالعلوم دیوبند کی حقیقی تاریخ اور اس کے فرزندوں کے عظیم کارناموں کو بیان کرنے کے لئے اس قسم کے تذکرے کی بڑی ضرورت ہے، اس تذکرے کے بغیر دارالعلوم کی تاریخ کے خدّو خال کا کما حقہٗ منظرِ عام پر آنا ناممکن ہے، یہاں صرف کچھ نامور علماء کے مختصر حالات پیش کئے جارہے ہیں، اُن میں سے بہت سے حضرات کی خدماتِ جلیلہ کا شہرہ برِّصغیر سے گزر کر دوسرے بہت سے بیرونی ملکوں تک پہنچ چکا ہے، ان کی علمی اور دینی خدمات نے عالمِ اسلام سے بھرپور خراجِ تحسین حاصل کیا ہے، دینی مدارس میں درس و تدریس کے علاوہ آپ کو یہ حضرات کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی مصروفِ تعلیم ملیں گے، رُشد و ہدایت، تصنیف و تالیف دعوت و تبلیغ، افتاء و مناظرہ، صحافت و سیاسی قیادت اور طبابت کے علمی میدانوں کے علاوہ بعض حضرات کو آپ وزارت اور قاضی القضاۃ کی کرسیوں پر بھی رونق افروز دیکھیں گے، اسی طرح کچھ حضرات دستور ساز اسمبلیوں میں دستوری اور آئینی مباحث میں حصّہ لیتے ہوئے نظر آئیں گے، غرض کہ برِّصغیر کے مُسلمانوں کے جمود و سکوت کو ختم کرنے اور ان میں حرکت و احساس اور جوشِ عمل کو پیدا کرنے میں فرزندانِ دارالعلوم دیوبند کی مخلصانہ کوششوں کا جو حصّہ ہے وہ معلوم و معروف ہے۔

دارالعلوم دیوبند کو اس وقت دنیائے اسلام خصوصاً ایشیا کے مُسلم ملکوں میں علم و عرفان اور روحانیت کے عظیم مرکز کی حیثیت حاصل ہے، مذہبی رفعت، تعلیمی ثقافت اور سادہ اسلامی معاشرت کے لحاظ سے کوئی دوسرا مذہبی ادارہ اس کا حریف نہیں کہا جاسکتا، آج دیوبند کے فضلاء دنیا کے بہت سے ملکوں میں پھیل چکے ہیں اور مفید اسلامی خدمات انجام دے رہے ہیں، دارالعلوم دیوبند کی اصل تاریخ اور اس کا حاصل سرمایہ درحقیقت یہی فضلاء ہیں[1]، یہ حضرات اپنے علم و فضل کے لحاظ سے اعاظم رجال کی حیثیت رکھتے ہیں۔

---

[1] تذکرہ فضلائے دارالعلوم دیوبند کی تدوین اربابِ دارالعلوم کی توجہ فرمائی کی منتظر ہے۔

انھوں نے ہندوستان میں اسلامی اور دینی زندگی کے قیام اور بقاء و استحکام کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اس کا سبھی نے اعتراف کیا ہے، تذکرہ مولانا سید محمد علی مونگیری کے مصنف سید محمد الحسنی لکھتے ہیں :-

"اس حقیقت سے کوئی ہوش مند اور منصف مزاج انسان انکار نہیں کر سکتا کہ دیوبند کے فضلاء نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل کر دینِ خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے، اور اس کو بدعت، تحریف اور تاویل سے محفوظ رکھا ہے اس سے ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام اور بقاء و استحکام میں بیش قیمت مدد ملی ہے، اور آج جو صحیح اسلامی عقائد، دینی علوم، اہلِ دین کی وقعت اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے، اس میں بلاشبہ اس کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے[1]۔

اگر یہ سچ ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم کے پھل اپنے ذائقے میں لذت آفریں اور خاصیت میں صحت بخش ثابت ہوئے ہیں، فضلائے دارالعلوم نے مِلّت کی مُردہ رگوں میں صالح خون اور جسم کو نئی توانائی دی ہے، ان حضرات نے مایوس قلوب میں عزم و اعتماد کی شمع روشن کی ہے، اور ان کی دینی و روحانی زندگی کے لئے حیاتِ تازہ بخشی ہے، درحقیقت دارالعلوم دیوبند ایک ایسا فانوس ہے جس کی روشنی ایشیا سے گزر کر برِّ اعظم افریقہ تک پہونچ رہی ہے، عالم اسلام کا اگر کوئی ادارہ یہ فخر کر سکتا ہے کہ وہ گزشتہ سو سال میں دینی علوم کا محافظ اور پاسبان رہا ہے تو وہ صرف دارالعلوم دیوبند اور اس کے فرزندانِ رشید ہیں جن کا بہت ہی مختصر تذکرہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے، ان کے علمی و دینی اور اصلاحی کارناموں اور سیاسی خدمات کی تفصیل کیلئے ایک مستقل کتاب کا انتظار کرنا ہوگا۔

---

[1] تذکرہ مولانا سید محمد علی مونگیری ؒ ص ۳، مطبوعہ شاہی پریس لکھنؤ ۱۹۶۴ء۔

تذکرہ فضلائے دارالعلوم دیوبند

مولانا میر باز خاں تھانویؒ

مولانا میر باز خاںؒ ۱۲۵۵ھ میں بھوجپور ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے، مولانا محمد بن احمد اللہ تھانوی۔ مولانا محمد منصہر نانوتوی وغیرہ علماء سے تحصیلِ علم کی، اوائل ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے، انھوں نے سب سے پہلے دارالعلوم سے فراغت حاصل کی، تھانہ بھون کے رہنے والے تھے، زمانۂ طالب علمی ہی میں پڑھانے کی خدمت بھی انجام دیتے تھے، انھیں تعلیم وتدریس کا اچھا ملکہ تھا، انھوں نے سالِ اوّل میں شرح وقایہ، نورالانوار، مُسلم شریف بیبذی، شرح عقائد نسفی، مقاماتِ حریری اور سبعہ معلقہ کی تحصیل کی، اُن کی سند میں لکھا ہے کہ ایامِ تحصیل میں بعہدۂ نیابت بھی کام کرتے رہے، روداد میں مرقوم ہے:۔

"فی الحال اس مدرسہ میں چند طلباء ایسے قریب اتمام تحصیل کے ہیں کہ کارِ مدرسی عربی کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں، چنانچہ حسب الطلب مہتمم صاحب مدرسہ عربی سہارن پور مولوی میر باز خاں طالب علم مدرسۂ ہذا مدرس دوم مدرسہ عربی سہارن پور بھیجے گئے۔

(روداد ۱۲۸۴ھ ص ۶)

۱۲۸۲ھ کی روداد میں مدرسین کی تعلیمی کارگزاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"دیگر مدرسان مولوی محمد فاضل ومولوی میر باز خاں ومولوی فتح محمد وحافظ احمد حسن نے بہت سرگرمی سے اپنے کام کو انجام دیا۔" (روداد ۱۲۸۳ھ ص ۲)

۱۲۸۵ھ میں حضرت مولانا محمد مظہرؒ صدر مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کی علالت کے زمانے میں انھوں نے دو مرتبہ قائم مقام صدر مدرس کے فرائض انجام دیئے۔

شیخ عبدالرحیم سہارن پوریؒ خلیفہ شیخ عبدالغفور صواتی المعروف باخوند صاحب سے بیعت کا شرف حاصل تھا۔[۲]

تاریخ مظاہر علوم سہارن پور اور نزہتہ الخواطر میں ان کا نام امیر باز خاں لکھا ہے، مگر روداد دارالعلوم ۱۲۸۴ھ میں میر باز خاں تحریر ہے۔

مولانا میر باز خاں صاحب کا خود نوشت مجموعہ مکاشفات اسندراک الامیر من اسرار اللطیف الخبیر کے نام سے بلالی اسٹیم پریس ساڈھورہ میں طبع ہوا ہے۔

۱۳۲۵ھ میں وفات پائی، دیوبند میں ان کے کھانے کا انتظام حکیم مشتاق احمد مرحوم[۳] (وفات ۱۳۱۰ھ) کے یہاں تھا (روداد ۱۲۸۳ھ ص ۱۱)

---

[۱] تاریخ مظاہر علوم سہارن پور جلد ۱ ص ۲۲ و ۲۴ ، [۲] نزہتہ الخواطر جلد ۸ ص ۲۴ ، [۳] حکیم مشتاق احمد دیوبند کے رئیس اور طبیبِ حاذق تھے، دارالعلوم کے قریب بجانبِ شرقی قاضی مسجد کے متصل حکیم صاحب کا شاندار مکان اور بیٹھک واقع ہے، قاضی مسجد کی تعمیر انھی کا کارنامہ ہے، ۱۲۹۸ھ میں مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے، حضرت نانوتویؒ سے شرفِ بیعت حاصل تھا، حضرت نانوتویؒ کی وفات پر قبرستانِ قاسمی کے لئے ایک قطعۂ آراضی وقف کیا، دارالعلوم کے ایک طالب علم کا مستقل طور پر اُن کے یہاں کھانے کا نظم تھا، ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء میں وفات پائی اور اپنے موقوفہ قبرستانِ قاسمی میں دفن ہوئے، ان کی نسبت حضرت نانوتویؒ کا مقولہ بزرگوں سے سُنا ہے کہ دیوبند میں ڈیڑھ ذہین ہیں پورے ذہین حکیم مشتاق احمد اور آدھے ذہین شیخ نہال احمد جو شاعر اور ادیب بھی تھے، حضرت نانوتویؒ فرمایا کرتے کہ جب ان میں سے کوئی بھی میرے وعظ میں سامنے بیٹھ جاتا ہے تو طبیعت کھل جاتی ہے اور مضامین کی آمد شروع ہوجاتی ہے کہ سمجھنے والے موجود ہیں۔"

مولانا فتح محمد تھانویؒ

مولانا فتح محمد تھانویؒ بھی قیامِ دارالعلوم کے پہلے سال ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں دارالعلوم میں داخل ہوئے ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں پہلی مرتبہ جن تین طلبہ نے دارالعلوم سے فراغت حاصل کی اُن میں سے ایک مولانا فتح محمد صاحب بھی تھے، دارالعلوم سے اُن کو جو سند دی گئی اُس میں لکھا ہے:۔

"۱۲۸۳ھ میں داخل ہوئے بلاغت میں مختصرِ معانی، منطق میں قطبی میر قطبی، حکمت میں میبذی، کلام میں شرح عقائد اصول میں شاشی نورالانوار، فقہ میں ہدایہ، حدیث میں نسائی مسلم، بخاری شریف، مؤطا، تفسیر میں بیضاوی شریف، ہیئت میں تصریح شرح تشریح ادب میں نفحۃ الیمن، مقاماتِ حریری، دیوان متنبی، یہاں تحصیل کیں، سالانہ امتحان میں عددِ کامل حاصل کر کے انعام پایا، استعداد کامل، مناسبت تام طبع سلیم، فکر صائب ذہن رسا رکھتے ہیں، اور عہدۂ نیابت پر کارگزاری بخوبی تمام کرتے رہے، ان کی خوبیٔ اخلاق اور عمدہ چال چلن سے مدرسین اور مہتمم راضی اور سب طلبا رسبق یاب و ہم سبق مداح ہیں۔"

مولانا فتح محمد دارالعلوم میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ پڑھانے کی خدمت بھی انجام دیتے تھے، جیساکہ سند کے آخری جملے سے معلوم ہوتا ہے، روداد میں مزید اس کی صراحت ملتی ہے، مدرسین کی تعلیمی کارگزاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"دیگر مدرسان مولوی محمد فاضل و مولوی میر باز خاں و مولوی فتح محمد و حافظ احمد حسن نے بھی بہت سرگرمی سے اپنے کام کو انجام دیا[1]۔ دیوبند میں ان کے کھانے کا بند وبست چودھری

---

[1] روداد سال اوّل ۱۲۸۳ھ ص ۲

امداد علی کے یہاں تھا[1]۔

مولانا فتح محمد کا وطن تھانہ بھون تھا، دارالعلوم سے فراغت کے بعد تھانہ بھون کی حوض والی مسجد میں جس مدرسہ کا آغاز حافظ عبدالرزاق مرحوم نے کیا تھا، مولانا موصوف اُس کے سب سے پہلے مدرس مقرر ہوئے۔

حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی (وفات ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء) کی فارسی شرح حزب البحر کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے، ترجمے کی زبان آسان اور عام فہم ہے، وحدت الوجود والشہود کے اُردو ترجمے میں لکھا ہے:۔

"مولانا فتح محمد تھانہ بھون کی چند ممتاز ہستیوں میں سے ایک تھے، جن کی نسبت سے اس قصبے کو دائمی شہرت نصیب ہوئی، علوم ظاہری و باطنی دونوں سے بہرۂ وافی رکھتے تھے صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھے، مولانا محمد عمر خلف الرشید حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی نے بعض کتابیں اُنہی سے پڑھی تھیں، اُنھوں نے اپنے پیرِ طریقت حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی کی مرتبہ شرح حزب البحر کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا[2]۔

مولانا فتح محمد صاحب کے حصولِ علم کے شوق اور جذبے کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے اُن کو جب یہ معلوم ہوتا کہ فلاں جگہ فلاں عالم فلاں علم میں ماہر ہے تو پا پیادہ سفر کر کے تشریف لے جاتے، ایک مرتبہ انھیں معلوم ہوا کہ جھنجھانے میں فلاں عالم مثنوی مولانا روم بہت اچھی پڑھاتے ہیں جمعرات کے روز پا پیادہ جھنجھانہ تشریف لے جاتے اور جمعہ کے روز سبق پڑھ کر ہفتہ کے دن واپس تھانہ بھون آجاتے، مثنوی کا جب تھوڑا سا حصہ رہ گیا تو مدرسہ سے چند روز کی رخصت لے کر اس کو بھی ختم کر دیا[3]۔

---

[1] روداد سال اوّل ۱۲۸۳ھ ص ۱۱ [2] وحدت الوجود والشہود ص ۸۸ ترجمہ نثار الحق ایم۔اے مطبوعہ ایجوکیشنل پریس کراچی [3] ارواح ثلاثہ حکایت ۴۰۵۔

مولانا فتح محمد صاحب آخر تک تھانہ بھون کے مدرسہ سے وابستہ رہے افسوس ہے کہ اُن کے سنِ وفات کا پتہ نہ چل سکا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ بھی ان کے تلامذہ میں شامل ہیں۔

مولانا قاضی محی الدّین خاں مرادآبادی

حضرت نانوتوی ؒ کے مخصوص تلامذہ اور جلیل القدر علماء میں سے تھے، ریاست بھوپال میں قضاء کے عہدے پر فائز رہے، رُوداد دارالعلوم میں اُن کی نسبت لکھا ہے کہ:۔

"جناب مولانا قاضی محی الدّین خاں صاحب مرادآبادی رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم قدس سرہٗ کے قدیم تلامذہ میں سے تھے، اور حضرت نانوتوی ؒ کے مخصوص لوگوں میں شمار ہوتے تھے، آپ عرصہ دراز تک ریاست بھوپال[1] کے عہدۂ قضاء پر فائز رہے، نہایت وقار اور حشمت کے ساتھ عمر پوری فرمائی۔

اُن کے والد ماجد بہادر شاہ ظفر کے مصاحبینِ خاص میں تھے، حضرت نانوتوی ؒ سے اُن کو ارادت حاصل تھی، حضرت نانوتوی ؒ نے شاملی کے معرکہ میں اُنہی کے ذریعے سے بہادر شاہ ظفر تک اپنی تجاویز پہنچائی تھیں۔

۱۳۱۳ھ میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے، اور آخر تک مجلس شوریٰ کو اپنے قیمتی مشوروں سے مستفید فرماتے رہے، ۱۳۴۷ھ میں وفات پائی۔

مولانا عبدالحق پورقاضوی

قصبہ پورقاضی[2] ضلع مظفر نگر وطن تھا، تقریباً ۱۲۵۸ھ میں پیدا ہوئے، ۱۲۸۳ھ میں

---

[1] رودادِ دارالعلوم ۱۳۴۸ھ ص ۵ [2] پورقاضی مظفر نگر کے شمال میں شرفاء کی ایک قدیم بستی ہے۔

دارالعلوم میں داخل ہوئے، اور ۱۲۸۶ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔ ۱۲۹۰ھ میں دستار بندی کے سب سے پہلے جلسے میں اُن کو حضرت شیخ الہندؒ اور دوسرے علمائے اکابر کے ساتھ دستارِ فضیلت باندھی گئی، دارالعلوم سے سندِ فراغ ملنے کے بعد ریاست رتلام میں اکاونٹینٹ جنرل مقرر ہوئے، اور تادم واپسیں اس عہدے پر فائز رہے، والئی ریاست کی نظر میں ہمیشہ معتمد رہے، علمائے سلف کا نمونہ تھے، آپکی چھوٹی صاحبزادی اسعدی خاتون کی شادی مولانا حافظ عبداللطیف صاحبؒ[1] ناظم مظاہر علوم سہارن سے ہوئی تھی، اپنی صاحبزادی کو اُنھوں نے بوقتِ رخصت جو قیمتی ہدایتیں اور نصیحتیں لکھ کر دی تھیں اُنھیں بعد میں حضرت تھانویؒ نے "بہترین جہیز" کے نام سے بہشتی زیور میں شائع فرمادیا ہے، مولانا عبدالحقؒ نے ۸ صفر ۱۳۴۲ھ / ۱۹۲۳ء کو رتلام میں وفات پائی۔

---

[1] حافظ صاحب کا سالِ ولادت ۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۹ء ہے وطن پور قاضی تھا، اُن کے والد مولانا جمعیت علی حضرت مولانا خلیل احمد انبٹھویؒ کے ہم درس تھے، حافظ صاحبؒ نے قرآن شریف وطن میں حافظ امانت علی بگھروی سے حفظ کیا، پھر مظاہر علوم میں داخل ہو کر جملہ علوم کی تکمیل کی درمیان میں تین ماہ کے قریب دارالعلوم دیوبند میں بھی پڑھا، ذکاوت و ذہانت اور سلامت روی میں اپنے معاصرین سے ممتاز تھے، حضرت مولانا خلیل احمد انبہٹویؒ سے تلمذ کے علاوہ بیعت کا شرف بھی حاصل تھا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مظاہر علوم سہارن پور میں مدرس مقرر ہوئے، درس نظامی کی تقریباً سبھی کتابیں پڑھانے کا موقع ملا معقولات و منقولات پر یکساں نظر تھی ۱۳۴۴ھ میں مظاہر علوم کے ناظم مقرر ہوئے، اُنکے عہدِ نظامت میں مظاہر علوم نے نمایاں ترقی حاصل کی چنانچہ کتب خانہ کی عمارت انہی کے زمانہ میں مکمل ہوئی۔ جدید دارالاقامہ کی تاسیس اور اس میں مسجد کی تعمیر اور دارالتجوید کی عمارت بھی اُنہی کے زمانے کی یادگاریں ہیں غرض کہ مظاہر علوم کو ترقی دینے اور اس کی عمارتوں کے اضافے میں اُنکا بڑا حصہ ہے، زمانۂ تعلیم سے لیکر آخر تک ان کی زندگی کے ۶۵ سال مظاہر علوم میں پڑھنے پڑھانے اور اس کی تعمیر و ترقی میں گزرے ۲ ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۴ء کو وفات پائی، حافظ صاحبؒ کے فرزندِ رشید مولانا عبدالرؤف عالی عرصہ سے دارالعلوم دیوبند میں مجلس معارف القرآن سے وابستہ ہیں۔

سید محبوب رضوی

مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی ؒ

انبہٹہ ضلع سہارن پور وطن تھا۔ ۱۲۸۵ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۱۲۸۷ھ میں یہاں سے فراغت حاصل کی، ابتدائی تعلیم اپنے وقت کے جلیل القدر عالم حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی ؒ سے حاصل کی۔ مکہ مکرمہ میں شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ؒ کی خدمت میں ایک عرصے تک مقیم رہے، اسی دوران میں حضرت شیخ المشائخ سے مثنوی مولانا روم پڑھی، حضرت شیخ المشائخ ؒ سے اُنھیں خلافت حاصل تھی۔

۱۲۸۷ھ میں جب گلاؤ ٹھی میں منشی مہربان علی مرحوم نے مدرسہ منبع العلوم قائم کیا تو اس کے صدر مدرس بنائے گئے۔ بعدازاں ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں سرسید مرحوم نے اُن کو علی گڈھ بلاکر اُس وقت کے ایم اے او کالج (موجودہ مسلم یونیورسٹی) میں ناظم دینیات مقرر کیا، جہاں وہ آخر تک اس منصب پر فائز رہے، اُن کے بعد اُن کے فرزند مولانا احمد میاں انصاری ناظم دینیات مقرر ہوئے، ان کے دوسرے فرزند مولانا محمد میاں منصور انصاری حضرت شیخ الہند ؒ کی آزادیٔ ہند کی سیاسی تحریک کے ایک اہم رکن تھے، اُن کے فرزند مولانا حامد الانصاری غازی صاحب ہندوستان کے مشہور صحافی ہیں۔

مولانا عبداللہ انصاری ؒ نے انبہٹہ میں وفات پائی۔ نزہۃ الخواطر جلد ہشتم میں اُنکا سالِ وفات ۱۳۴۴ھ لکھا ہے جو درست نہیں ہے، اگرچہ اُن کے انتقال کا صحیح سن معلوم نہیں ہوسکا، مگر اتنی بات یقینی ہے کہ ۱۳۴۴ھ سے بہت پہلے اُن کا انتقال ہوچکا تھا، انبہٹہ میں اپنے آبائی قبرستان میں آسودۂ خواب ہیں، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی صاحبزادی اکرام النساء انہی سے منسوب تھیں۔

مولانا محمد مراد فاروقی مظفرنگری

۱۲۶۲ھ ۱۸۴۵ء میں پاک پٹن کے ایک قریبی گاؤں امب میں پیدا ہوئے، حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کی اٹھارویں پشت میں تھے، چار سال کی عمر تھی کہ یتیم ہو گئے، اُن کے ماموں اُنکی والدہ کے ساتھ اُن کو اپنے یہاں لے گئے، سنِ شعور کو پہنچے تو ماموں نے تعلیم سے بے توجہی پر سرزنش کی، اس پر کبیدہ خاطر ہو کر بلا اجازت ۱۲۷۹ھ میں لاہور چلے گئے، وہاں اُردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی، لاہور سے دہلی پہنچ کر حافظ غلام رسول ویراں سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، پھر علی گڈھ جا کر حضرت مفتی لطف اللہ علیہ الرحمۃ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے، رام پور میں مولانا ارشاد حسین صاحب سے بھی بعض کتابیں پڑھیں، آخر میں دارالعلوم کی کشش یہاں کھینچ لائی مولانا محمد مرادؒ دارالعلوم کے ابتدائی طلبا میں سے تھے، یہاں پانچ سال رہ کر علوم کی تکمیل کی، اور ۱۲۸۸ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔

انھوں نے زمانۂ طالب علمی ہی میں اپنی خداداد ذہانت، حصولِ علم میں غیر معمولی محنت وکاوش و علمی استعداد کے لحاظ سے ممتاز حیثیت حاصل کر لی تھی، حضرت نانوتویؒ سے بیعت و خلافت حاصل تھی، حضرت نانوتویؒ نے ۱۲۹۴ھ میں جب مظفرنگر کی جامع مسجد حوض والی میں مدرسہ کا افتتاح فرمایا تو اُسکا صدر مدرس اُنھی کو بنایا گیا، چنانچہ آگے چلکر یہ مدرسہ مرادیہ کے نام سے موسوم ہو گیا، اور اب تک جاری ہے۔

مولانا محمد مراد صاحب نے اپنی پوری زندگی درس و تدریس اور مدرسہ مرادیہ کی بقا و ترقی کے لئے وقف کر دی تھی، مظفرنگر ہی میں سادات بارہہ کے خاندان میں اُن کی شادی ہو گئی تھی، مدرسہ مرادیہ میں ۴۰ سال تک اُن کی مسندِ درس بچھی رہی، ۳ رجب ۱۳۳۲ھ ۱۹۱۴ء کو عین جمعہ کی اذان کے وقت وفات پائی مظفرنگر میں مسجد شاہ اسلام کے احاطے میں مدفون ہوئے، اُن کے چھوٹے صاحبزادے مولوی محمد رشید فریدی

سے حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی بڑی صاحبزادی فاطمہ منسوب ہیں۔

مولانا خلیل احمد انبھٹویؒ

وطنِ مالوف انبہٹہ[1] تھا، ۱۲۶۹ھ ؍ ۱۸۵۲ء سالِ ولادت ہے، ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوایوب انصاریؓ پر منتہی ہوتا ہے، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مملوک علیؒ کے نواسے اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے تھے، پانچ سال کی عمر میں بزرگ نانا نے بسم اللہ کرائی، قرآن شریف وطن میں پڑھا، اُردو فارسی کی تعلیم انبہٹہ اور نانوتہ میں حاصل کی، عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے چچا مولوی انصار علی (والد ماجد مولانا عبداللہ انصاری انبہٹویؒ) سے اور کچھ کتابیں اپنے قصبے کے مشہور عالم مولوی سخاوت علی سے پڑھنے کے بعد آپ کو انگریزی پڑھنے کے لئے سرکاری اسکول میں داخل کر دیا گیا، اسی زمانہ میں دارالعلوم قائم ہوا تھا، یہاں اُن کے ماموں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ صدر مدرس تھے اس لئے ۱۲۸۵ھ[2] میں آپ کو دارالعلوم میں داخل کر دیا گیا، اُس وقت

---

[1] انبہٹہ ضلع سہارنپور کا ایک تاریخی قصبہ ہے، یہ سہارنپور کے جنوب میں گنگوہ جانے والی سڑک پر واقع ہے، کہا جاتا ہے کہ فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ۔ ۷۹۰ھ) کے سپہ سالار سعد اللہ بیگ نے ۷۷۰ھ میں اس قصبے کو آباد کیا تھا، انبہٹہ ایک مردم خیز بستی ہے، شیوخ کی آبادی ہے، صدیقی، فاروقی اور انصاری خاندان یہاں آباد ہیں، گیارھویں صدی ہجری کے اواخر میں مشائخ چشت میں ایک بزرگ شاہ ابوالمعالیؒ یہاں اقامت گزیں ہوئے، ان کی خانقاہ منبع فیوض و برکات تھی، ۱۱۱۲ھ میں وفات پائی حضرت مولانا خلیل احمدؒ شاہ ابوالمعالیؒ کی دختری اولاد میں ہیں۔

[2] تذکرۃ الخلیل اور تذکرہ مشائخ دیوبند وغیرہ میں ۱۲۸۳ھ میں داخل ہونا بتایا گیا ہے (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

آپ کافیہ پڑھتے تھے، دارالعلوم میں شرح تہذیب وغیرہ کتابیں پڑھنے کے بعد مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں چلے گئے، وہاں حدیث وتفسیر، فقہ اور عقائد وکلام وغیرہ کی تحصیل کے بعد ۱۲۸۹ھ میں دارالعلوم میں آکر منطق و فلسفہ اور ادب و تاریخ کی اعلیٰ کتابیں پڑھ کر تعلیم سے فراغت حاصل کی دورانِ تعلیم ہی میں ایک سال میں قرآن شریف حفظ کر کے محراب سنائی۔

دارالعلوم دیوبند سے تکمیل علوم کے بعد مظاہر علوم سہارنپور میں مدرس ہوگئے، اس زمانے میں بھوپال میں مولوی جمال الدین صاحب مدارالمہام تھے، ان کی خواہش تھی کہ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کو ریاست میں گراں قدر مشاہرے پر جگہ دیں، مگر مولاناؒ نے دارالعلوم کو چھوڑنا پسند نہیں فرمایا، بعد میں مدارالمہام صاحب کے اصرار پر ۱۲۹۳ھ میں مولانا خلیل احمد صاحب کو وہاں بھیجدیا گیا۔ مگر آپ کا بھوپال میں دل نہیں لگا اور چند ماہ کے بعد حج

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اسی طرح سے اُن کے دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کرنے کی نسبت بھی کچھ نہیں لکھا، مگر مولاناؒ کو دارالعلوم سے جو سند دی گئی ہے اُس میں مرقوم ہے۔

"مولوی خلیل احمد ساکن انبہٹہ نبیرہ جناب مولانا مولوی مملوک علی صاحب مرحوم ۱۲۸۵ھ میں اس مدرسہ میں داخل ہوئے، اس وقت کافیہ پڑھتے تھے، قریب ایک سال کے عرصہ میں کتب مفصلۂ ذیل تحصیل کیں، کافیہ شرح ملّاجامی، ایساغوجی، قال اقول، میزان منطق، مرقات، شرح تہذیب بعداس کے بضرورت قربِ وطن مدرسہ سہارن پور میں کتبِ درسیہ حدیث فقہ وتفسیر واصول وعقائد ومعانی ومنطق تکمیل کو پہنچائیں، آخر ۱۲۸۹ھ میں پھر اسی مدرسہ میں آکر میرزاہد رسالہ، شمس بازغہ، مقامات حریری، دیوان متنبی وحماسہ وتاریخ یمینی میں کچھ پڑھا، استعداد درست اور ذہن وذکا خوب اور مناسبت مناسب ہے۔ اخلاق واوضاع پسندیدہ اور مزاج سنجیدہ ہے، بطور نیابت بعض طلباء کو تعلیم بھی دیتے رہے، اب بسبب ضرورتِ معاش مدرسہ کو چھوڑا ۲۳ / جمادی الثانی ۱۲۸۹ھ رجسٹر نقول اسناد جلد اول ص ۵)

کے لئے چلے گئے، واپسی کے بعد حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے ان کو بھاول پور بھیج دیا ۱۲۹۶ھ میں انھوں نے دوبارہ حج کا ارادہ فرمایا، اس موقع پر حضرت گنگوہی نے جن سے آپ کو شرفِ بیعت حاصل تھا، حضرت حاجی صاحب مہاجر مکی کو لکھا کہ مولوی خلیل احمد حاضرِ خدمت ہو رہے ہیں آپ ان کی حالت پر مطلع ہو کر مسرور ہوں گے، حضرت حاجی صاحب نے جب آپ کی باطنی حالت دیکھی تو بہت خوش ہوئے اور سر سے دستار اُتار کر آپ کے سر پر رکھدی اور اسی کے ساتھ اپنی جانب سے تحریری خلافت عطا فرمائی، بعد میں اس اجازت نامہ پر حضرت گنگوہی نے بھی دستخط فرمائے۔

حج سے واپسی کے بعد حضرت گنگوہی نے ان کو مدرسہ مصباح العلوم بریلی کا صدر مدرس مقرر فرمایا، ۱۳۰۸ھ میں آپ کو دارالعلوم دیوبند میں مدرس مقرر کیا گیا، ۱۳۱۴ھ میں یہاں سے بحیثیت صدر مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں تشریف لے گئے، ۱۳۲۵ھ میں ان کو مظاہر علوم کا ناظم منتخب کیا گیا، اور آخر عمر میں ۱۳۴۴ھ میں بقصدِ ہجرت مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے۔

آپ کو اگرچہ تمام علوم متداولہ میں مہارتِ تامہ حاصل تھی، لیکن حدیث سے بہت زیادہ شغف تھا، اسی شغف کے سبب سے آپ نے ابوداؤد کی شرح فرمائی جو بذل المجہود کے نام سے پانچ جلدوں میں طبع ہوئی ہے، بذل المجہود علم حدیث میں آپ کا عظیم الشان کارنامہ ہے، اس کے علاوہ بھی آپ نے کئی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، بذل المجہود کا آغاز ۱۳۳۵ھ میں سہارنپور میں ہوا تھا اور ۱۳۴۵ھ میں مدینہ منورہ میں اختتام کو پہونچا، اور اسی کے ساتھ آپ کی عمر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا، ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ کو بمرضِ فالج مدینہ منورہ میں وفات پائی، حضرت عثمان ذوالنورین کے جوار میں آسودہ خواب ہیں۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن

حضرت شیخ الہند دارالعلوم کے سب سے پہلے شاگرد ہیں، اُن ہی کی نسبت کہا گیا ہے

کہ جس نے سب سے پہلے استاد کے سامنے کتاب کھولی وہ محمود تھا، حضرت شیخ الہندؒ کی پیدائش ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء میں بریلی میں ہوئی، جہاں ان کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علیؒ سرکاری محکمۂ تعلیم سے وابستہ تھے، ابتدائی تعلیم اپنے مشہور عالم چچا مولانا مہتاب علی مرحوم سے حاصل کی، قدوری اور شرح تہذیب پڑھ رہے تھے کہ دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا، آپ اس میں داخل ہو گئے، نصابِ دارالعلوم کی تکمیل کے بعد حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں رہ کر علمِ حدیث کی تحصیل فرمائی، فنون کی بعض اعلیٰ کتابیں والد ماجد سے پڑھیں، ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء میں حضرت نانوتویؒ کے دستِ مبارک سے دستارِ فضیلت حاصل کی۔[1] زمانۂ تعلیم ہی میں آپ کا شمار حضرت نانوتویؒ کے ممتاز تلامذہ میں ہوتا تھا، اور حضرت نانوتویؒ خاص طور سے شفقت فرماتے تھے، چنانچہ ان کی اعلیٰ علمی اور ذہنی صلاحیتوں کے پیشِ نظر دارالعلوم کی مدرسی کے لئے اکابر کی نظرِ انتخاب آپ کے اوپر پڑی اور ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء میں مدرس چہارم کی حیثیت سے آپ کا تقرر عمل میں آیا، جس سے بتدریج ترقی پاکر ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۰ء میں صدارت کے منصب پر فائز ہوئے۔

ظاہری علم وفضل کی طرح باطن بھی آراستہ تھا، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے خلافت حاصل تھی، دارالعلوم میں صدارتِ تدریس کا مشاہرہ اس وقت ۷۵ روپیہ تھا، مگر آپ نے ۵۰ روپے سے زیادہ کبھی قبول نہیں فرمائے، بقیہ ۲۵ روپے دارالعلوم کے چندے میں شامل فرما دیتے تھے، آپ کی زبردست علمی شخصیت کے باعث طلباء کی تعداد ۲۰۰ سے بڑھ کر ۶۰۰ تک پہنچ گئی تھی، آپ کے زمانے میں ۸۶۰ طلباء نے حدیثِ نبویؐ سے فراغت حاصل کی، حضرت شیخ الہندؒ کے فیض تعلیم نے مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا منصور انصاری، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا سید اصغر حسین دیوبندی، مولانا سید فخر الدین احمد، مولانا محمد

---

[1] روداد دارالعلوم ۱۲۹۰ھ ص ۱۰۔

اعزاز علی امروہی، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہم اللہ جیسے مشاہیر اور نامور علماء کی جماعت تیار کی۔

بہت سے ذی استعداد اور ذہین و ذکی طالب علم جو مختلف اساتذہ کی خدمتوں میں استفادہ کرنے کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے اپنے شکوک و شبہات کے کافی وشافی جواب پانے کے بعد حضرت مولانا کی زبان سے آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویّہ کے معانی اور مضامینِ عالیہ سُن کر سرِ نیاز خم کر کے معترف ہوتے کہ یہ علم کسی میں نہیں ہے اور ایسا محقق عالم دنیا میں نہیں دیکھا۔

آخر عمر میں جب جنگ طرابلس و بلقان کی وجہ سے مسلمانوں میں ہیجان پھیلا ہوا تھا، حضرت شیخ الہندؒ نے ہندوستان سے برطانوی حکومت کے اقتدار کو ختم کرنے کے لئے ایک اسکیم تیار کی، یہ ۱۳۳۰ھ ۱۹۱۲ء کا زمانہ تھا، انھوں نے مسلّح انقلاب کے ذریعہ سے برطانوی گورنمنٹ کا تختہ اُلٹ دینے کا نقشہ تیار کیا اس کے لئے انھوں نے نہایت منظم طور پر اپنا پروگرام مرتب کیا تھا ان کے شاگردوں اور رفقاء کار کی ایک بڑی جماعت جو ہند و بیرونِ ہند کے اکثر ممالک میں پھیلی ہوئی تھی، ان کے مجوزہ پلان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نہایت سرگرمی اور جاں بازی کے ساتھ کوشاں تھی، شاگردوں میں مولانا عبید اللہ سندھی مولانا محمد میاں منصور انصاری اور دوسرے بہت سے تلامذہ اس میں شامل تھے، جنھوں نے حضرت شیخ الہندؒ کے سیاسی اور انقلابی پروگرام کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اُسوقت عام خیال یہ تھا کہ طاقت کے بغیر ہندوستان سے انگریزوں کا نکلنا ممکن نہیں ہے، اس کیلئے سپاہ اور اسلحہ کی ضرورت ہے، ان چیزوں کی فراہمی کے لئے افغانستان اور ترکی کا انتخاب کیا گیا۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی مجوزہ اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے پیرانہ سالی کے باوجود ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء میں حجاز کا سفر فرمایا، وہاں کے ترکی گورنر غالب پاشا اور انور پاشا سے جو اس وقت ترکی کے وزیر جنگ تھے ملاقات فرماکر بعض اہم امور طے کئے آپ حجاز سے براہِ بغداد بلوچستان ہوتے

ہوئے سرحد کے آزاد قبائل میں پہنچنا چاہتے تھے کہ اچانک جنگِ عظیم کے دوران میں شریف حسین والیٔ مکہ نے انگریز حکام کے ایما پر آپ کو گرفتار کر کے اُن کے حوالے کر دیا، حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عُزیر گل، حکیم نصرت حسین اور مولانا وحید احمد کی گرفتاری بھی عمل میں آئی۔ آپ کو پہلے مصر اور پھر وہاں سے مالٹا لے جایا گیا، جو برطانوی قلمرو میں جنگی مجرموں کے لئے محفوظ ترین مقام سمجھا جاتا تھا، جنگ کے ختم ہونے پر آپ کو ہندوستان آنے کی اجازت ملی اور ۲۰ر رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء کو آپ نے ساحلِ بمبئی پر قدم رنجہ فرمایا، اگرچہ مالٹا سے واپسی کے بعد صحت بگڑ چکی تھی اور قویٰ پیرانہ سالی کے باعث نہایت ضعیف ہو گئے تھے، مگر بایں ہمہ آپ نے شدّ و مد کے ساتھ سیاسی کاموں میں حصہ لیا، طبیعت اس بارِ گراں کی متحمل نہ ہو سکی جب حالت زیادہ تشویشناک ہو گئی تو بغرضِ علاج ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے یہاں دہلی لے جایا گیا، حکیم اجمل خاں بھی شریکِ علاج تھے، مگر وقتِ موعود آ چکا تھا ۱۸ر ربیع الاول ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۱ء کی صبح کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا، جنازہ دیوبند لایا گیا اور اگلے روز حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی قبرِ مبارک کے قریب یہ گنجینۂ فضل و کمالات دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہو گیا۔[1]

---

[1] حضرت شیخ الہندؒ کے تفصیلی حالات کے لئے باب پنجم ملاحظہ ہو۔

مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ

وطن گنگوہ تھا، حضرت نانوتویؒ کے شاگردوں میں تین حضرات بہت مشہور ہیں، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت مولانا احمد حسن امروہیؒ اور تیسرے حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ، وہ ۱۲۸۴ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۱۲۹۰ھ میں اُنھوں نے حضرت مولانا احمد حسن امروہیؒ کے ساتھ دارالعلوم سے فراغت حاصل کی، سفر اور حضر میں اپنے استاذ حضرت نانوتویؒ کے ساتھ رہتے تھے، مناظرے سے بڑی دلچسپی تھی، دہلی میں حکیم محمود خاں صاحب سے طب کی تعلیم حاصل کی، گفتگو اور تقریر شریں اور دل کش تھی۔

فراغت کے بعد ۱۲۹۴ھ میں خورجہ کے مدرسہ میں صدر مدرس مقرر ہوئے، پھر دہلی کے مدرسہ عبدالرب میں چلے گئے، حضرت نانوتویؒ کی بعض تصانیف شائع کرائیں، مباحثہ شاہجہان پور انہی کا مرتب کیا ہوا ہے، اس کا اصل نسخہ دارالعلوم میں موجود ہے، انھوں نے حدیث میں ابو داؤد کا ایک مبسوط حاشیہ "التعلیق المحمود" کے نام سے لکھا ہے، یہ حاشیہ مطبع مجیدی کانپور میں چھپا ہے، اور عام طور پر متداول ہے، اس کے علاوہ اُنھوں نے ابنِ ماجہ کا بھی حاشیہ لکھا ہے جو مطبع نامی کانپور میں چھپا تھا، ان کا ایک حاشیہ تلخیص المفتاح پر بھی ہے، اُنھوں نے اپنے استاذ حضرت مولانا نانوتویؒ کی ایک مفصل سوانح حیات بھی لکھی تھی، جو کم و بیش ایک ہزار صفحات پر مشتمل تھی۔

حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ اپنی بعض خانگی مجبوریوں کی وجہ سے گنگوہ کی سکونت ترک کرکے کانپور چلے گئے تھے، اور وہیں مطب اور مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی تھی، کان پور میں اُن کے مکان میں آگ لگ گئی جس میں کتابوں کے ساتھ سوانح حیات کا مسودہ بھی جل گیا۔

۱۳۱۵ھ میں کان پور میں وفات پائی، اور وہیں مدفون ہیں، اُن کے حالات تفصیل سے دستیاب نہیں ہیں۔

مولانا صدیق احمد انبہٹوی

حضرت مولانا خلیل احمدؒ کے چچیرے بھائی تھے، انبہٹہ وطن تھا، ۱۲۸۳ھ میں اپنے بھائی حضرت مولانا خلیل احمدؒ کے ساتھ دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۱۲۹۲ھ میں یہاں سے فراغت حاصل کی، کچھ مدت تک دارالعلوم میں معین المدرسین رہے، اُن کا طرزِ تعلیم بہت سہل اور آسان تھا، چنانچہ ایک ہفتہ میں نحومیر اپنے شاگردوں کو حفظ یاد کرادیا کرتے تھے، علوم عقلیہ ونقلیہ میں مہارتِ تامہ حاصل تھی بالخصوص صرف ونحو میں یدِطولیٰ حاصل تھا۔

مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی اور مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی میں مدرس رہے، آخر میں مالیرکوٹلہ میں ریاست کی جانب سے افتاء کا عہدہ تفویض ہوا، ان کا شمار مشاہیر اہلِ افتاء میں ہوتا تھا، مالیرکوٹلہ میں زندگی بھر افتاء کے منصب پر فائز رہے۔

حضرت گنگوہیؒ سے سلوک ومعرفت کے مقامات طے کئے، حضرت گنگوہیؒ نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے:۔

"طریقِ سلوک میں اصل مقصود احسان ہے، سو وہ بفضلہ تعالےٰ آپ کو حاصل ہے، اس مکتوب سے آپ کے مقامات کی طرف اشارہ ہوتا ہے، بالآخر حضرت گنگوہیؒ سے اجازت بیعت حاصل ہوئی، صاحبِ بیعت وارشاد اور صاحبِ کشف بزرگوں میں سے تھے، اُن کا زُہد وتقویٰ مسلّم تھا، معاصرین میں صاحبِ اسرار ومعارف سمجھے جاتے تھے، مدت تک مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم دیوبند کے ممتحن رہے، حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ نے حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد اُنہی سے تربیت باطنی حاصل کی۔

تاریخ وصال ۲۸ صفر ۱۳۴۴ھ، شب جمعہ ہے، مالیرکوٹلہ میں آپ کو سپردِ خاک کیا گیا۔

❊

مولانا عبد القدیر دیوبندیؒ

مولانا عبد القدیرؒ دیوبند میں پیدا ہوئے، دیوبند کے مشہور بزرگ شاہ رمز الدینؒ (وفات ۱۱۲۲ھ) کی اولاد میں سے تھے، ۱۲۸۷ھ میں دار العلوم میں داخل ہوئے، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، حضرت مولانا سید احمد دہلویؒ، حضرت مولانا محمود حسنؒ دیوبندی وغیرہ اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اور ۱۲۹۳ھ میں فراغت پائی، پھر سہارن پور میں حضرت مولانا احمد علی سہارن پوریؒ سے حدیث پڑھی۔

لکھنؤ میں نول کشور پریس میں تصحیح کے کام پر مامور تھے، علم الحیوانات میں علامہ کمال الدین دمیری کی مشہور کتاب حیات الحیوان کا دو جلدوں میں ترجمہ کیا ہے جو مطبع نول کشور لکھنؤ میں چھپا ہے، ۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۸ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔

مولانا سیّد احمد حسن امروہیؒ

امروہہ کے مشہور خاندان ساداتِ رضویہ سے تعلق تھا، ان کے اجداد میں حضرت شاہ ابن اکبری دَور کے مشائخ میں تھے، ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم امروہہ کے بلند پایہ عالم مولانا سیّد رافت علی، مولانا کریم بخش اور مولانا محمد حسین جعفری سے حاصل کی، طب کی کتابیں امروہہ کے مشہور طبیب حکیم امجد علی خاں سے پڑھیں، بعد ازاں حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں رہ کر علمِ حدیث اور دوسرے علوم و فنون کی تکمیل کر کے ۱۲۹۴ھ میں فراغت پائی، حضرت مولانا احمد علی محدّث سہارن پوری اور مولانا عبد القیوم بھوپالی سے بھی اجازتِ حدیث حاصل کی اور آخر میں مدینہ منورہ حاضر ہو کر حضرت شاہ عبد الغنی مجدّدی دہلویؒ سے سندِ حدیث حاصل کرنے کا شرف پایا۔ شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت اور خلافت بھی حاصل تھی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اولاً خورجہ کے مدرسہ میں درس دیا، پھر سنبھل اور دہلی کے مختلف مدارس میں صدر مدرس رہے، جب ۱۲۹۶ھ میں مرادآباد میں حضرت نانوتویؒ کے ایماء سے مدرسہ شاہی قائم ہوا تو اس کے صدر مدرس بنائے گئے، ۱۳۰۳ھ میں مدرسہ شاہی سے مستعفی ہوگئے، اور اپنے وطن امروہہ کی جامع مسجد میں ایک پرانے مدرسہ کی تشکیلِ جدید کی، یہ مدرسہ پہلے معمولی حالت میں تھا، آپ نے اس کو باقاعدہ طور پر قائم کرکے اس میں جملہ علوم وفنون کی تعلیم جاری کی، مولانا امروہیؒ کی شخصیت کی بنار پر بہت جلد دور ونزدیک کے طلبہ سے مدرسہ معمور ہوگیا، انھوں نے جامع مسجد میں مدرسے کے لئے مزید عمارتیں تعمیر کرائیں، دارالحدیث، درسگاہیں اور مدرسین وطلبار کے لئے حجرے بنوائے، اور اس طرح انھوں نے امروہہ کی قدیم دَور کی علمی روایات کو ازسرِنو نشاۃِ ثانیہ بخشی، اُن کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ علم الادیان کے ساتھ علم الابدان کی تعلیم بھی دیتے تھے، بہت سے لوگوں نے اُن سے طب کی تعلیم حاصل کی جو آگے چل کر ملک میں طبیبِ حاذق کی حیثیت سے مشہور ہوئے، چنانچہ مشہور حکیم فریداحمد عباسی انہی کے تلامذہ میں سے تھے۔

حضرت مولانا امروہیؒ کی تقریر نہایت جامع، شستہ اور پُرمغز ہوتی تھی جس سے طلبار کا دامن طلب گلہائے مقصود سے بھر جاتا تھا، تقریر میں وہ اپنے اُستاذؒ کا مکمل نمونہ تھے اور اپنی مخصوص صلاحیتوں کے لحاظ سے علوم قاسمی کے امین اور مجسم تصویر تھے، علوم قاسمی کی ترویج میں عمر بھر مشغول رہے، اُن کا علمی فیضان دور دور تک پہنچا اور سیکڑوں طالبانِ علم اُن کے درس سے فاضل ہوکر نکلے، صاحبِ تذکرۃ الکلام نے اُن کے طریقۂ تعلیم اور افادۂ درس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"آپ اُن جملہ علوم کی جو درسِ نظامیہ کے نظامِ تعلیم میں شامل ہیں تعلیم دیتے، لیکن زیادہ توغل حدیث وتفسیر وفقہ کی تدریس سے تھا، آپ کے تلامذہ سے سنا گیا کہ بیان ایسا واضح اور پرشوکت ہوتا کہ دقیق سے دقیق مسائل طلبار کی سمجھ میں بہت سہولت سے آجاتے تھے،

اور اس کے ساتھ مضمون کی عظمت بھی ذہن نشین ہو جاتی ہے۔[1]

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے حضرت مولانا امروہیؒ کی جامعیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"ہر شخص جس کو کچھ بھی تجربہ ہو یہ جانتا ہے کہ دنیا میں بہت کم علمائے ایسے ہوئے ہیں جن کو علمی شعبوں کی ہر شاخ میں پوری دست گاہ حاصل ہو، مثلاً جن حضرات کو وعظ کہنے میں ملکہ ہوتا ہے وہ تدریس پر پورے قادر نہیں ہوتے، اور جو تدریس کے کام میں مشغول ہوتے ہیں انکو کسی مجمع میں وعظ یا تقریر کرنا مشکل ہوتا ہے، دینیات میں انہماک رکھنے والے اکثر معقول و فلسفہ سے ناآشنا ہوتے ہیں، اور معقولات کے ماہرین کو علوم دینیہ سے بے خبری ہوتی ہے لیکن قدرت نے اپنی فیاضی سے ہمارے مولانا میں یہ سب اوصاف اعلیٰ طور پر جمع کر دیئے تھے، مولانا کی تقریر، تحریر، ذہانت، تبحر، اخلاق اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں کامل دست گاہ ضرب المثل تھی، اور سب سے زیادہ قابلِ قدر اور ممتاز کمال مولانا کا یہ تھا کہ حضرت قاسم العلوم والخیرات کے دقیق اور غامض علوم کو اُن ہی کے لب و لہجہ اور طرزِ ادا میں صفائی اور سلاست کے ساتھ بیان فرماتے تھے۔"[2]

۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں مناظرۂ نگینہ جس میں مولانا ثناء اللہ امرتسری نے فریقِ مخالف سے مناظرہ کیا تھا، اس مناظرہ میں مولانا امروہیؒ نے جو تقریر فرمائی افاداتِ احمدیہ میں یہ تقریر دعوت الاسلام کے عنوان سے شائع ہوئی ہے، اس میں توحید، رسالت، مقصودِ زندگی، تبشیر رسول اور سیرتِ صحابہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اس تقریر میں حضرت نانوتویؒ کی تقریروں کا پورا پورا رنگ جھلک رہا ہے، تقریر کا یہ اثر تھا کہ مجمع میں بعض نو مسلموں نے تقریر سن کر کہا کہ اگر کسی تقریر

---

[1] تذکرۃ الکرام بحوالہ مجلہ دار العلوم دیوبند جمادی الاول ۱۳۶۳ھ ص ۴۴ -

[2] مجلہ "القاسم" ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ -

پر ایمان لے آنا چاہیئے تو یہ تقریر ایسی ہی تھی۔

۱۳۲۹ھ میں موتمر الانصار کا جو پہلا جلسہ مراد آباد میں ہوا وہ اُنہی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ پوری عمر درس و تدریس، وعظ و پند، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں گزاری، علم کا وقار اور دین کی عظمت قائم رکھنے کے لئے نہایت خودداری کے ساتھ رہتے تھے۔ اُن کے مضامین کا ایک مجموعہ افاداتِ احمدیہ کے نام سے شائع ہوا ہے۔

۲۸، ۲۹ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ کی درمیانی شب میں بمرضِ طاعون انتقال ہوا، حضرت مولانا حافظ محمد احمدؒ نے نمازِ جنازہ پڑھائی، جامع مسجد امروہہ کے صحن کے جنوبی گوشے میں دفن کیا گیا، انتقال سے کچھ دیر پہلے لیٹے لیٹے وعظ فرمایا، جب روح نے قفسِ عنصری سے پرواز کی تو یہ کلمات زبان پر جاری تھے، سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم، مولانا امروہیؒ نے جو مدرسہ جامع مسجد امروہہ میں قائم فرمایا تھا وہ اب تک جاری ہے۔

مولانا عبدالعلی میرٹھیؒ

حضرت نانوتویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، وطن عبداللہ پور ضلع میرٹھ تھا، ۱۲۹۴ھ میں حضرت مولانا احمد حسن امروہی کے ساتھ دارالعلوم سے فراغت پائی، اور دارالعلوم میں مدرس مقرر ہوئے، ۱۲۹۷ھ تک دارالعلوم میں رہے، پھر مدرسہ شاہی مراد آباد کے مدرس اول مقرر ہوئے، ۱۳۰۶ھ تک وہاں قیام رہا۔ بعد ازاں دہلی کے مدرسہ عبدالرب کے صدر مدرس مقرر ہوئے، اور طویل مدت تک اسی مدرسہ میں حدیث کا درس دیتے رہے، زہد و تقویٰ اور پرہیزگاری میں آپ اپنی مثال تھے، آخری سانس تک جماعت میں صفِ اولیٰ ترک نہیں ہوئی، آخری عمر میں فالج کی وجہ سے نقل و حرکت سے معذور ہو گئے تھے، تلامذہ وہ گدا جس پر بیٹھے رہتے تھے اُٹھا کر صفِ اولیٰ میں لا کر رکھدیتے تھے، اُن کے تلامذہ کا ایک وسیع حلقہ تھا، جس میں حضرت تھانویؒ اور حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ جیسے اکابر شامل ہیں،

مدرسہ عبدالرب کے سالانہ جلسوں میں حضرت تھانویؒ پابندی سے تشریف لے جایا کرتے تھے حضرت تھانویؒ کے سفر سے معذور ہوجانے پر حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کو پابندی سے بلاتے اور تقریر کرایا کرتے تھے، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم اُن کا یہ مقولہ نقل فرمایا کرتے تھے کہ قاسمی ہوجاؤ بھوکے ننگے نہ رہو گے، مجھ ایا ہج کو دیکھو نہ اُٹھ سکتا ہوں نہ بیٹھ سکتا ہوں مگر رزق کی یہ بہتات ہے کہ میرا حجرہ ہمہ قسم نعمتوں سے ہمہ وقت بھرپور رہتا ہے۔" رحمہ اللہ رحمۃ واسعہ۔ پوری عمر خدمتِ حدیث میں گذاری، جنازے میں اسقدر ہجوم تھا کہ گویا پوری دلی اُمنڈ آئی تھی۔

مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوریؒ

بجنور کے رہنے والے تھے، حکیم صاحبؒ کے والد مولانا علیم اللہ صاحب جو اپنے وقت کے جید عالم تھے، انھوں نے دہلی میں حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ سے پڑھا تھا حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ساتھیوں میں سے تھے۔

حکیم رحیم اللہ صاحب حضرت نانوتویؒ کے آخری دَور کے ارشد تلامذہ میں تھے، اُستاد کے ساتھ والہانہ تعلق تھا، حضرت نانوتویؒ کی شان میں اُنھوں نے عربی میں کئی قصیدے لکھے ہیں، نصاب کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں ۱۲۹۵ھ میں کی اس سے پہلے منطق، فلسفہ، کلام اور ریاضی کی تعلیم مولانا عبدالعلی رام پوری سے پائی، طب کی کتابیں حکیم ابراہیم لکھنوی سے پڑھیں اور طویل مدّت تک لکھنؤ میں استاد کی خدمت میں حاضر رہے، گھر پر مطب کرتے تھے، خدمت خلق کے طور پر یہ مشغلہ اختیار کیا تھا، صاحبِ نسبت اور پابند اوقات بزرگ تھے۔

عقائد و کلام اور مناظرے میں خاص دست گاہ حاصل تھی، ان علوم میں اُنھوں نے عربی اور فارسی زبانوں میں ایک درجن کے قریب کتابیں لکھی ہیں، باوضع اور اوراد و وظائف کے بڑے پابند تھے سفرِ حج کے دَوران مکّہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی سے بیعت کی تھی۔

حکیم صاحب نے ۱۴ اگست ۱۹۲۹ء ۱۳۴۸ھ کو جمعہ کے روز وفات پائی، مرض کی وجہ سے صاحبِ فراش ہو گئے تھے، بیٹھ کر ظہر کی نماز پڑھی اور سلام پھیرتے ہی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب۔ رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند جو بجنور کے قومی و ملی رہنما اور بااثر شخصیت ہیں، حکیم صاحبؒ کے اخلاف میں سے ہیں۔

تصانیف کے نام یہ ہیں:۔

الاقتصاد فی الضاد

جوابات الاعتراضات الواہیہ

تہدید المنکرین لقدرۃ رب العالمین

احسن الکلام فی اصول عقائد الاسلام

اظہار الحقیقۃ

زجر المناع لکشف انتفاع عن وجوہ الوجود والامتناع

الکافی للاعتقاد الصافی

اثبات القدرۃ الالٰہیہ باقامۃ الحجۃ الالہامیہ

ابطال اصول الشیعہ بدلائل العقلیہ والنقلیہ

مولانا منصور علی خاں مرادآبادی

مرادآباد کے رہنے والے تھے ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی ہندوستان کے مشہور عالموں میں سے ہیں، حضرت نانوتویؒ کے شاگرد تھے ایک عرصے تک آپ کے ساتھ رہے، پھر ۱۲۹۶ھ میں حدیث حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ سے حاصل کی اور دکن چلے گئے، جامعۂ طبیہ حیدرآباد میں تدریس پر مامور ہوئے۔ ایک مدت تک وہاں رہے، آخر میں مکہ مکرمہ چلے گئے۔ اور اسی کو وطن بنانے کی سعادت حاصل کی۔

آپ کی تین کتابیں ملتی ہیں:۔

مذہب منصور ۲ دو جلدوں میں، فتح المبین اور معیار الادویہ۔

مکہ مکرمہ میں ۱۳۴۶ھ میں وفات ہوئی۔

مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ

سالِ ولادت ۱۲۷۵ھ ہے، تاریخی نام "ظفر الدین" رکھا گیا، والد ماجد کا اسم گرامی حضرت مولانا فضل الرحمٰن تھا، ۱۲۸۴ھ کے اواخر میں جب دارالعلوم میں درجۂ قرآن شریف جاری ہوا تو حضرت مفتی صاحب کو درجۂ حفظِ قرآن میں داخل کیا گیا، اور ۱۲۸۷ھ میں انھوں نے پورا قرآن شریف حفظ کر لیا[1]، اس وقت درجۂ قرآن شریف کے اُستاد حافظ نامدار خاں صاحب تھے۔ ۱۲۹۵ھ میں اُنھوں نے بخاری شریف و مُسلم شریف اور شرح عقائد کا امتحان دے کر دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔

اُس وقت دارالعلوم کے اساتذہ یہ تھے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، حضرت مولانا سید احمد دہلویؒ، حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا عبدالعلی رحمہم اللہ تعالیٰ ۱۲۹۸ھ کے جلسۂ دستار بندی میں آپ کو سند و دستار حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے دستِ مُبارک سے عطا ہوئی۔

فراغتِ تعلیم کے بعد کچھ عرصے دارالعلوم میں معین المدرس رہے، اور اسی کے ساتھ فتویٰ نویسی کی خدمات بھی حضرت مولانا محمد یعقوبؒ صدر المدرسین کی نگرانی میں انجام دیتے رہے، پھر اُن کو میرٹھ بھیجدیا گیا، وہاں مدرسہ اسلامیہ اندر کوٹ میں کئی سال تک درس و تدریس میں مصروف رہے، ۱۳۰۹ھ میں اکابر دارالعلوم نے نائب مہتمم کے عہدے کے لئے اُن کا انتخاب کیا، پھر ایک سال کے بعد اُن کو مفتی و مدرس مقرر کیا گیا، ۱۳۲۳ھ کی روداد میں لکھا ہے کہ:-

"مولوی عزیز الرحمٰن صاحب نے فراغت کے بعد بطور معین المدرس دارالعلوم میں

---

[1] روداد دارالعلوم دیوبند ۱۲۸۷ھ ص ۱۳۔

درس دیا، اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی نگرانی میں افتاء کا کام بھی کیا، اُسی زمانے میں اُن کو داعیۂ طریقت پیدا ہوا، خاندان نقشبندیہ میں حضرت مولانا رفیع الدینؒ مہتمم ثانی دارالعلوم دیوبند کے ہاتھ پر بیعت کی، چند سال کی ریاضت و مجاہدہ کے بعد اجازتِ سلسلہ حاصل ہوئی چند سال تک میرٹھ کے مدرسہ اسلامیہ واقع اندرکوٹ میں مدرس رہے، اُس زمانے میں آپ کو دوبارہ داعیہ حج پیدا ہوا، اس سفر میں آپ کا حج کے ساتھ یہ بھی مقصد تھا کہ شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کی خدمت میں قیام فرمائیں، چنانچہ ڈیڑھ سال آپکا اس سفر میں صرف ہوا، اور حضرت حاجی صاحب نے بھی آپ کو مجاز فرمایا، شوال ۱۳۰۵ھ میں تشریف لے گئے تھے اور صفر ۱۳۰۷ھ میں واپس تشریف لائے، ۱۳۰۹ھ میں آپ کو میرٹھ سے دیوبند بلا لیا گیا، اُس وقت سے برابر دارالعلوم کی خدمت میں مصروف ہیں آپ اس وقت مفتیٔ مدرسہ ہیں لیکن حدیث وتفسیر اور فقہ کے چند سبق آپ سے متعلق رہتے ہیں[ا]،

حضرت مفتی صاحبؒ بڑے بڑے اہم اور معرکۃ الآراء استفتاء کا جواب قلم برداشتہ اور مراجعت کتب کے بغیر بلا تکلّف تحریر فرمایا کرتے تھے، چالیس سال کے قریب آپ نے دارالعلوم کے دارالافتاء کی خدماتِ جلیلہ انجام دیں، اس دور میں بے شمار ایسے مشکل فتاوے بھی لکھے جو نہ صرف فتویٰ بلکہ معرکۃ الآراء مُہمّات میں محاکمہ کی حیثیت رکھتے ہیں مگر چند لفظوں میں ان کا جواب تحریر فرما دیتے تھے، سفر میں دارالافتاء کی ڈاک ساتھ رہتی تھی، مراجعتِ کتب کے بغیر محض حذاقت و مہارت اور کمالِ استعداد سے بے تکلّف فتاویٰ تحریر فرماتے رہتے تھے، نصوص فقہ اکثر و بیشتر حفظ یاد رہتی تھیں، ان کے فتاویٰ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ عام فہم بھی ہوتے ہیں، اُن کے فتاویٰ کی زبان سہل اور سلیس ہوتی ہے، یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو اُس دَور کے فتاویٰ میں اور کہیں نہیں پائی جاتی۔

[ا] روداد دارالعلوم ۱۳۲۳ھ ص 19۔

فتویٰ نویسی علوم شرعیہ میں بڑا مشکل کام ہے اس کام میں حالات کے بدلنے سے جس قدر نزاکتیں پیدا ہو جاتی ہیں، ان کو صرف اہلِ علم ہی سمجھ سکتے ہیں، یوں تو فتاویٰ ہر زمانے میں لکھے گئے ہیں، مگر فتاویٰ نویسی کا جو کمال حضرت مفتی صاحبؒ کو حاصل تھا یہ کمال جماعت دیوبند میں صرف تین ہی شخصوں کے حصے میں آیا ہے، ایک حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور دوسرے حضرت مفتی صاحبؒ اور تیسرے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، فتویٰ نویسی میں حضرت مفتی صاحبؒ کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ زمانے کے تقاضوں سے کبھی صرفِ نظر نہیں کرتے تھے، اس پر اُن کی نظر بہت گہری پڑتی تھی، اگر کسی مسئلہ کے دو مختلف مفتیٰ بہ پہلو ہیں تو ایسے موقع پر وہ آسان پہلو کو اختیار کرتے اور اُسی پر فتویٰ دیتے تھے، ایسی صورت ہرگز اختیار نہیں کرتے تھے جو عوام کے لئے مشکلات پیدا کرنے والی ہو، اُن کے فتاویٰ میں جا بجا اِس کی مثالیں موجود ہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ صرف عالم اور مفتی ہی نہ تھے بلکہ عارف باللہ اور صاحبِ باطن اکابر میں سے تھے، بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی مستقلاً قائم رہتا تھا، ہزارہا بندگانِ خدا اطرافِ ہندوستان میں آپ کی باطنی تلقین وتربیت سے فیضیاب ہو کر مراد کو پہونچے۔

نقشبندیت کے مشہور معمولات میں ختم خواجگان ہے، حضرت مفتی صاحبؒ کی مسجد میں (جو دیوبند میں چھوٹی مسجد کے نام سے مشہور ہے) پابندی کے ساتھ روزانہ صبح کی نماز کے بعد ہوتا تھا، اسی کے ساتھ جذبۂ خدمتِ خلق بدرجہ کمال تھا، محلّے کی بے سہارا اور ضرورتمند عورتوں کا سودا سلف بے تکلف لادیا کرتے تھے۔

ان علمی مجاہدات کے ساتھ درس کی علمی باریک بینیاں مستزاد تھیں، افتاء کے ساتھ درس کا شغل مستقل رہتا تھا، فقہ وحدیث اور تفسیر کے اونچے اسباق آپ کے یہاں ہوتے تھے بڑی بڑی اہم تحقیقات جو آپ کے ذہن رسا کی پیداوار ہوتی تھیں کبھی بھی اپنی طرف منسوب کرکے دعوے کے انداز میں ان کا اظہار نہیں فرماتے تھے، مستقل تصانیف کا موقع کم ملا

جلالین شریف کا اُردو میں ترجمہ کیا اور اپنے شاگرد مولانا قاضی بشیر الدین مالک مطبع مجتبائی میرٹھ کی فرمائش پر حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ کے رسالہ "میزان البلاغۃ" کا حاشیہ لکھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ حضرت مفتی صاحبؒ بھی دار العلوم سے مستعفی ہو گئے تھے۔ ۱۳۴۶ھ میں حضرت شاہ صاحبؒ علالت کے باعث جب دیوبند تشریف لائے تو بخاری شریف کے چودہ پارے باقی تھے، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے ذمہ داروں کے اصرار پر حضرت مفتی صاحبؒ وسط ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ میں ڈابھیل تشریف لے گئے اور بخاری شریف کا درس شروع کرا دیا اور صرف ڈیڑھ ماہ کی قلیل ترین مدت میں بخاری شریف کے باقی ماندہ چودہ پارے ختم کرا دیئے۔

جمادی الثانی ۱۳۴۶ھ کے اوائل میں آپ دیوبند تشریف لائے راستے میں طبیعت علیل ہو گئی، دیوبند پہنچنے پر علاج شروع ہوا مگر افاقہ نہ ہو سکا، وقتِ موعود آچکا تھا، بالآخر ۱۷ جمادی الثانی ۱۳۴۶ھ ۱۹۲۸ء کی شب میں داعئ اجل کو لبیک کہا، ۱۰ بجے دن میں حضرت مفتی صاحب کے جنازے کی نماز حضرت مولانا سیّد اصغر حسینؒ نے پڑھائی اور ۱۱ بجے آپ دار العلوم کے قبرستانِ قاسمی میں سپردِ خاک کئے گئے۔

مولانا حکیم محمد حسن دیوبندیؒ

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے چھوٹے بھائی تھے، شروع سے آخر تک دار العلوم دیوبند میں پڑھا، ۱۲۹۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے، بعد ازاں دہلی میں حکیم عبد المجید خاں صاحب سے طب کی تعلیم حاصل کی، اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت کا شرف حاصل کیا۔

۱۳۰۲ھ میں دار العلوم میں مدرس عربی و طبیب کی حیثیت سے تقرر ہوا، اور تعلیم و مطلب کا کام تفویض ہوا، طلبائے دار العلوم کو طب کی تعلیم کے ساتھ طلباء کے علاج و

معالجے کا کام بھی سپرد تھا، اسی کے ساتھ تفسیر و حدیث اور فقہ کی اعلیٰ کتابیں بھی اُن کے اسباق میں رہتی تھیں، ۱۳۳۳ھ کی روداد میں ان کی نسبت تحریر ہے:۔

"دارالعلوم کو ایک ایسے عالم کی ضرورت تھی جو علوم درسیہ کے علاوہ طب کی تعلیم بھی دے سکے اور حسبِ ضرورت طلبار کی مدارات بھی کر سکے، اس ضرورت کے تحت ۱۳۰۲ھ میں ان کا تقرر ہوا اور اس وقت سے برابر ہر قسم کی درسی کتب کے درس میں مشغول ہیں اور اسی کے ساتھ تعلیم طب اور مطب کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں"

آپ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کے اصحاب و خدام خاص میں سے ہیں، اور طریقہٗ سلف پر علماً و عملاً قائم ہیں، کتبِ طب کی تعلیم اور مدارات طلبار آپ کا مستقل کام ہے، مگر اس کے ساتھ ہی علم حدیث و فقہ و تفسیر کی کئی بڑی جماعتوں کا درس بھی آپ کے متعلق رہتا ہے"

دارالعلوم میں ۴۳ سال تک علمی اور طبی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۵ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ کو وفات پائی، قبرستانِ قاسمی میں مدفون ہیں۔

مولانا ناظر حسن دیوبندیؒ

دیوبند کے عثمانی خاندان سے تھے، ۱۲۸۷ھ سے ۱۲۹۶ھ تک دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی، حدیث حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ سے پڑھی، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سے بھی کتب حدیث کی تکمیل کی، ۱۳۰۱ھ میں حضرت مولانا تھانویؒ کے ساتھ ان کی دستار بندی ہوئی، جیّد عالم تھے، اولاً چھتاری کے مدرسے میں کچھ عرصے پڑھایا، پھر مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی کے صدر مدرس رہے۔ بعد ازاں ۱۳۳۸ھ میں مدرسہ عالیہ ڈھاکہ میں صدرالمدرسین کے منصب پر فائز ہوئے، یکم ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ ۱۹۲۳ء میں ڈھاکہ میں انتقال ہوا، وہیں اُن کی قبر ہے سلسلۂ نقشبندیہ سے منسلک تھے۔

قرأت خلف الامام پر ایک کتاب الفرقان فی قرأة ام القرآن تصنیف فرمائی، ان کی دوسری کتاب کشف الغطاء عن مسئلة الربا ر کے نام سے ہے، صورتاً وجیہہ اور سیرةً فقیہہ تھے، نزہتہ الخواطر جلد ہشتم میں ان کا تذکرہ موجود ہے

مولانا عبدالرحمن امروہیؒ

ان کا سالِ ولادت تقریباً ۱۲۷۷ھ ہے، بمبئی میں پیدا ہوئے، مکہ مکرمہ میں قرآن شریف حفظ کیا، ابتدائی تعلیم بھی مکہ مکرمہ میں پائی، حضرت مولانا احمد حسن امروہیؒ سے تحصیل علوم کی، آخر میں دیوبند آکر تفسیر و حدیث کے کچھ اسباق حضرت نانوتویؒ سے پڑھے۔ ان دونوں بزرگوں کے علمی فیوض سے ان میں تفسیر و حدیث کے اسباق میں متکلمانہ رنگ غالب تھا، دورانِ درس ان کی ذات ہر علم و فن خصوصاً علم کلام و عقائد میں یگانۂ روزگار تھی، اکثر و بیشتر حضرت نانوتویؒ کے علوم و معارف کے حوالے دیتے تھے۔

حضرت نانوتویؒ کے آخری شاگردوں میں سے تھے، تفسیر میں انکو خاص کمال تھا، مدرسہ شاہی مراد آباد، بمبئی، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل اور مدرسہ جامعہ اسلامیہ امروہہ میں ۶۰ سال تک علوم دینیہ کی خدمت میں گزارے، اس لئے ان کے فیض یافتگان کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے ۱۳۶۲ھ میں کچھ عرصہ کے لئے دارالعلوم دیوبند میں بھی تفسیر و حدیث کے اسباق پڑھائے، آخر میں جامعہ اسلامیہ امروہہ کے شیخ الحدیث والتفسیر ہو گئے تھے، حدیث و فقہ کے ممتاز علماء میں سے تھے، تفسیر بیضاوی پر آپ کا ایک حاشیہ ہے، مطول اور مختصر المعانی پر بھی حواشی لکھے ہیں۔ شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے اجازتِ بیعت حاصل تھی ۹۰ سال کی عمر میں ۲۲ جمادی الثانی ۱۳۶۷ھ کو واصل بحق ہوئے، اپنے استاذ حضرت مولانا احمد حسن امروہیؒ کے پہلو میں آسودۂ خواب ہیں۔

☆

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

آپ کا سالِ ولادت ۱۲۸۰ھ ہے، تاریخی نام کرم عظیم ہے، تھانہ بھون کے شیوخ فاروقی میں سے تھے، قرآن شرف حافظ حسین علی سے حفظ کیا، فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں وطن میں حضرت مولانا فتح محمد تھانویؒ سے پڑھیں جو دارالعلوم کے اوّلین فارغین میں سے تھے، ۱۲۹۵ھ کے اواخر میں تکمیل علوم کی غرض سے دارالعلوم میں داخلہ لیا، ۱۲۹۹ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی، تجوید وقرأت کی مشق مکہ مکرمہ میں قاری محمد عبداللہ[1] مہاجر مکی سے کی۔

ذکاوت وذہانت کے آثار بچپن ہی سے نمایاں تھے، ۱۳۰۱ھ میں اولاً مدرسہ فیضِ عام کان پور میں صدر مدرس مقرر ہوئے اور پھر مدرسہ جامع العلوم کی مسندِ صدارت کو زینت بخشی، کان پور میں آپ کے درس حدیث کی شہرت سُن کر دُور دور سے طلبار کھنچے چلے آتے تھے، ۱۳۱۵ھ میں ملازمت ترک کر کے خانقاہِ امدادیہ[2] تھانہ بھون میں متوکلاً علی اللہ

---

[1] دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مجود قاری عبدالوحید خاں صاحب انہی قاری عبداللہ کے تلمیذ تھے قاری عبدالرحمٰن کے شاگرد تھے، قاری عبداللہ صاحب مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ میں تجوید کے استاذ

[2] خانقاہِ امدادیہ کسی باقاعدہ اور مستقل عمارت کا نام نہیں ہے۔ تھانہ بھون کے شمال مغرب میں ایک مسجد ہے جو ابتداً پیر محمد والی مسجد کے نام سے موسوم تھی، مسجد کی جنوبی سمت میں ایک سہ دری تھی جس میں ایک حجرہ تھا، شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ نے اس مسجد کو اپنی قیام گاہ بنایا تھا، یہیں بیٹھ کر وہ طالبین کو مستفیض فرماتے تھے، یہی وہ تاریخی خانقاہ ہے جہاں سے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف شاملی کے جہاد کی تیاری کی گئی تھی، جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، بعد میں حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کی نسبت سے یہ خانقاہ امدادیہ کے نام سے (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

قیام فرمایا، جہاں تا دم واپسیں، ۴۰ سال تک تبلیغ دین، تزکیہ نفس اور تصنیف و تالیف کی ایسی عظیم الشان اور گراں قدر خدمات انجام دیں جس کی مثال اُس دور کی کسی دوسری شخصیت میں نہیں ملتی، علم نہایت وسیع اور گہرا تھا، جس کا ثبوت آپ کی تصانیف کا ہر ہر صفحہ دے سکتا ہے، دین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں تصانیف موجود نہ ہوں وہ اپنی تصانیف کی کثرت اور افادیت کے لحاظ سے ہندوستانی مصنفین میں اپنا جواب نہیں رکھتے، آپ کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد ساڑھے تین سو کے قریب ہے، ان کے علاوہ تین سو سے زائد مواعظ ہیں جو چھپ چکے ہیں، برِ صغیر کے پڑھے لکھے مسلمانوں کے کم گھر ایسے ہوں گے جہاں حضرت تھانویؒ کی کوئی تصنیف موجود نہ ہو، ان میں بہشتی زیورؒ کی مقبولیت کا تو یہ عالم ہے کہ ہر سال مختلف مقامات سے ہزاروں کی تعداد میں چھپتی ہے اور ہاتھوں ہاتھ نکل جاتی ہے اگر یہ کہا جائے کہ اُردو زبان میں اتنی بڑی تعداد میں دوسری کوئی اور کتاب شائع نہیں ہوتی تو اس میں قطعاً مبالغہ نہ ہوگا، کئی زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں حضرت تھانویؒ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اپنی تصانیف سے کبھی ایک پیسہ کا فائدہ حاصل نہیں کیا، تمام کتابوں کے حقوقِ طبع عام تھے اور جس کا جی چاہے انھیں چھاپ سکتا تھا، آپ کا ترجمہ قرآن شریف بہت سلیس، سہل اور عالمانہ ہے، تفسیر میں بیان القرآن ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے، اسی طرح حدیث میں اعلاء السنن میں فقہ حنفی کی مستدل احادیث کا جو زبردست ذخیرہ مرتب کرادیا ہے وہ خود اپنی مثال آپ ہے۔

حضرت تھانویؒ شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مجاز و خلیفہ تھے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) موسوم ہوگئی، تھانہ بھون کے مشہور عالم حضرت مولانا شیخ محمدؒ کا قیام بھی اسی مسجد میں رہتا تھا حضرت حکیم الامت نے اسی خانقاہ (مسجد، درس و حجرہ) سے شریعت و طریقت کے دریا بہائے اور تقریباً نصف صدی تک ان کا فیض یہاں سے جاری رہا۔

اُن کی بیعت وارشاد کا سلسلہ بہت وسیع ہے برّصغیر اور اس کے باہر بھی ہزاروں اشخاص نے ان سے اصلاح و تربیت حاصل کی، چنانچہ حکیم الامت کے لقب سے آپ کی زبردست شہرت تھی، اُن کی تصانیف و مواعظ سے لاکھوں افراد کو علمی و عملی فیض پہنچا، عوام اور خواص کا جتنا بڑا طبقہ بیعت وارشاد کی راہ سے اس دور میں ان سے مستفیض ہوا اس کی مثال کم ہی ملے گی، اُن کی رفعت و بلندی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ غیر منقسم ہندوستان کے بڑے بڑے صاحبِ علم وفضل اور اہلِ کمال اُن کے حلقۂ بیعت میں شامل تھے، اُن کی ذات والاصفات علم و حکمت اور معرفت و طریقت کا ایک ایسا سرچشمہ تھی جس سے نصف صدی تک برّصغیر کے مُسلمان سیراب ہوتے رہے، دین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں اُن کی عظیم خدمات تقریری اور تصنیفی صورت میں نمایاں نہ ہوں، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے الفاظ ہیں:۔

"اصلاحِ امّت کی کوشش میں علمی و عملی زندگی کے ہر گوشے پر ان کی نظر تھی، بچّوں سے لیکر بوڑھوں تک، عورتوں سے لیکر مردوں تک، جاہلوں سے لیکر عالموں تک، عامیوں سے لے کر صوفیوں ، درویشوں اور زاہدوں تک، غریبوں سے لے کر امیروں تک اُنکی نظر مصروفِ اصلاح و تربیت رہی، پیدائش، شادی بیاہ، غمی اور دوسری تقریبوں اور اجتماعوں تک کے احوال پر اُن کی نظر پڑی، اور شریعت کے معیار پہ جانچ کر ہر ایک کا کھرا کھوٹا الگ کیا، رسوم و بدعات اور مفاسد کے ہر روڑے اور پتھر کو ہٹا کر صراطِ مستقیم کی راہ دکھائی، تبلیغ، تعلیم، سیاست، معاشرت، اخلاق و عبادات اور عقائد میں دینِ خالص کے معیار سے جہاں کوتاہی نظر آئی اُس کی اصلاح کی، فقہ کے نئے نئے مسائل اور مسلمانوں کی نئی نئی ضرورتوں کے متعلق اپنے نزدیک پورا سامان مہیّا کر دیا، اور خصوصیت کے ساتھ احسان و سلوک کی جس کا مشہور نام تصوّف ہے، تجدید فرمائی۔ ان کے سامنے دین کی صحیح تمثال تھی، اسی کے مطابق مُسلمانوں کی موجودہ زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں نقائص تھے

اُن کے درست کرنے میں عمر بھر مشغول رہے، انھوں نے اپنی زندگی اس میں صرف کردی کہ مُسلمانوں کی تصویرِ حیات کو اُس شبیہ کے مطابق بنادیں جو دینِ حق کے مُرقع میں نظر آتی ہے[1]

اللہ تعالیٰ نے آپ کو استغنار کے ساتھ فیاضی کے جوہر سے بھی نوازا تھا، ان کے قیام کانپور کا واقعہ راقم سطور نے والد مرحوم سے سُنا ہے، جو حضرت تھانوی کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے، چونکہ اس واقعے کا عام طور پر لوگوں کو علم نہیں ہے، اس لئے اس کا ذکر کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کان پور میں حضرت تھانویؒ کو جامع العلوم سے پچیس روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی، اس میں سے وہ پانچ روپے ہر مہینے والد مرحوم کو دیا کرتے تھے تاکہ وہ اپنے طور پر اس رقم کو طلبار پر صرف کردیں، اس رقم کے ساتھ یہ تاکید بھی تھی کہ کسی کو اس کی خبر نہ ہو کہ اس کا مُعطی کون ہے، یہ ایک رازدارانہ بات تھی، حضرت تھانویؒ کی زندگی میں والد مرحوم کے علاوہ کسی کو اس کا علم نہ تھا، انھوں نے یہ واقعہ حضرت تھانویؒ کی وفات کے بعد اُن کے محاسن کا ذکر کرتے ہوئے راقم سطور کو سُنایا تھا۔

حضرت حکیم الامتؒ کی زندگی بڑی منظم تھی، کاموں کے اوقات مقرر تھے اور ہر کام اپنے وقت پر انجام پاتا تھا، متوسلین کے بہت سے خطوط آتے تھے مگر بقید وقت ہر ایک کا جواب خود اپنے قلم سے تحریر فرماتے تھے۔

۱۶ر رجب ۱۳۶۲ھ کی شب میں تھانہ بھون میں اس جہانِ فانی کو خیرباد کہا، تھانہ بھون میں حافظ ضامن شہیدؒ کے مزار کے قریب اُنہی کے باغ میں جسے اُنھوں نے خانقاہ امدادیہ کے نام سے وقف کردیا تھا، دفن کیا گیا۔

مولانا عبدالمؤمن دیوبندیؒ

دیوبند کے ممتاز علمی خاندان شیوخ عثمانی کے رکن تھے، اور حضرت شیخ الہند

---

[1] جامع المجددین ص ۲۷ و ۲۸۔

مولانا محمود حسنؒ کے برادر نسبتی ۔ ۱۲۹۲ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور ۱۲۹۹ھ میں حضرت مولانا محمد یعقوبؒ سے دورۂ حدیث پڑھا ۔ ۱۳۰۱ھ کے چوتھے جلسے دستار بندی میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ساتھ حضرت گنگوہیؒ کے دستِ مبارک سے دستارِ فضیلت حاصل کی ۔

اہلِ میرٹھ کی خواہش پر آپ وہاں تشریف لے گئے اور تمام عمر وہیں درس و افتار کی خدمات میں گزاری ، پہلے مدرسہ قومیہ کے صدر مدرس ہوئے پھر مدرسہ امداد العلوم صدر میرٹھ میں صدر مدرس رہے ۔

بڑے ذہین و ذکی و وسیع النظر عالم تھے ، آخر عمر میں حدیث و فقہ و تفسیر کی اعلیٰ کتابیں نوک زبان ہوگئی تھیں ، اپنے استاذ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کے انداز پر مختصر جامع اور دل نشین تقریر فرماتے تھے ، صاحبِ نسبت بھی تھے ، زندگی کا انداز متوکلانہ تھا ۔ میرٹھ میں ان سے بڑا علمی فیض جاری ہوا ، حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی مترجم قرآن کریم نے ازاوّل تا آخر اُن سے پڑھا ، حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی اور حضرت مولانا سراج احمد میرٹھی بھی اُن کے شاگرد تھے ، مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کو بھی ان سے شرفِ تلمذ حاصل ہے ، دارالعلوم دیوبند کے درجاتِ حدیث کے ممتحن ہوتے تھے ۔

۱۳۴۷ھ میں دہلی میں جہاں بغرض علاج مقیم تھے ، وفات پائی اور درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ میں دفن ہوئے ۔

مولانا حکیم جمیل الدینؒ

نگینہ ضلع بجنور وطن تھا ، دارالعلوم میں ۱۲۹۸ھ و ۱۲۹۹ھ میں تحصیل علوم کی ، دہلی کے مشہور اطبار میں سے تھے ، طبیہ کالج دہلی کے ممتحن تھے ، ایک عرصے تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے بھی رکن رہے ، مطب کے مشغلے کے ساتھ اوراد و وظائف کے بڑے پابند اور

ذاکر و شاغل بزرگ تھے، علم نہایت راسخ اور پختہ تھا، ابتدا میں غازی پور قیام رہا، آخر میں دہلی کو وطن بنالیا تھا۔

حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی کے استاذ تھے، حکیم صاحب کچھ عرصہ جون پور کے مدرسہ میں مدرس رہے، علوم دینیہ کے ساتھ طب میں بھی بڑی دستگاہ رکھتے تھے، حکیم عبدالمجید خاں دہلوی سے طب پڑھی تھی، حکیم محمد اجمل خاں بھی اُن کے سلسلۂ تلمذ میں شامل تھے، دینیات اور طب کی تعلیم کا سلسلہ مدت العمر جاری رہا۔

۱۸ صفر ۱۳۵۵ھ کی شب میں نمازِ تہجد سے فراغت کے بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

دہلی میں صدیقی دواخانہ ان کی یادگار ہے جو ان کے فرزند رشید مولانا حکیم عبدالجلیل صاحب کی نگرانی میں جاری ہے۔

مولانا حافظ محمد احمدؒ دیوبندی

حافظ صاحبؒ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے فرزندِ رشید تھے ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے، قرآنِ مجید حفظ کرنے کے بعد والد ماجد نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گلاؤٹھی (ضلع بلند شہر) بھیجدیا، گلاؤٹھی میں حضرت نانوتویؒ کا قائم کیا ہوا مدرسہ منبع العلوم تھا، مولانا عبداللہ انبہٹویؒ اُن کے بہنوئی اس مدرسہ میں مدرس تھے، بعد ازاں مزید تعلیم کے لئے مراد آباد کے مدرسہ شاہی میں بھیجے گئے، یہاں حضرت نانوتویؒ کے شاگردِ رشید مولانا احمد حسن امروہیؒ پڑھاتے تھے، ان سے مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھنے کے بعد دیوبند تشریف لائے اور حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے ترمذی شریف کے چند سبق ۱۳۰۰ھ میں پڑھے، دورۂ حدیث گنگوہ پہنچکر حضرت گنگوہیؒ کے حلقۂ درس میں پورا کیا، اور وہیں جلالین اور بیضاوی پڑھی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء میں بحیثیت مدرس دارالعلوم میں تقرر ہوا اور مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھانے کی نوبت آئی ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء

میں جب حضرت حاجی محمد عابدؒ اہتمام سے مستعفی ہوئے تو یکے بعد دیگرے دو مہتمم مقرر ہوئے، مگر ایک ایک سال سے زیادہ اہتمام نہ کر سکے، ہر سال کے تغیرات کی وجہ سے دارالعلوم کے نظام میں اختلال پیدا ہونے لگا تو ۱۳۱۳ھ؍۱۸۹۵ء میں حضرت گنگوہیؒ نے اہتمام کے لئے حافظ صاحبؒ کا انتخاب فرمایا، حافظ صاحب نہایت منتظم اور صاحبِ اثر و وجاہت تھے، وہ بہت جلد دارالعلوم کے انتظام پر قابو یافتہ ہو گئے، اور تقرر کے وقت آپ سے جو توقعات قائم کی گئی تھیں بدرجۂ اتم اُن کے اہل ثابت ہوئے، حضرت شیخ الہندؒ جو صدر المدرسین تھے خود استاذ ہونے کے باوجود حافظ صاحبؒ کے استاد زادہ ہونے کی حیثیت کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اور دارالاہتمام میں اُن کے سامنے مؤدبانہ بیٹھتے تھے۔

آپ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم نے معنوی اور صوری دونوں حیثیتوں سے نہایت عظیم الشان ترقی کی جو اس سے پہلے اس کو حاصل نہ ہو سکی تھی، ہر چند دارالعلوم معنوی حیثیت سے "دارالعلوم" بن چکا تھا، مگر اپنی عمارتوں اور ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے آپ ہی کے زمانۂ اہتمام میں مدرسہ سے دارالعلوم بنا، شعبہ جات اور دفاتر کی تشکیل عمل میں آئی، حلقۂ اثر میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا، غرض کہ ہر حیثیت سے دارالعلوم کا قدم روز افزوں ترقی کی جانب گامزن رہا، چنانچہ آپ کا پینتیس سالہ دورِ اہتمام دارالعلوم کی تاریخ میں ترقیوں کا نہایت تابناک اور زرّیں دور سمجھا جاتا ہے۔

دارالحدیث کی عظیم الشان عمارت جو اپنی نوعیت کی ہندوستان بھر میں پہلی عمارت ہے آپ ہی کے عہد میں تیار ہوئی، جدید دارالاقامہ موسوم بہ دارِ جدید کا آغاز اور مسجد و کتب خانہ کی تعمیر بھی حافظ صاحبؒ ہی کے زمانے کی یادگار ہیں، ۱۳۲۸ھ؍۱۹۱۰ء کے اُس عظیم الشان جلسۂ دستار بندی کی یاد اب تک لوگوں کے قلوب میں تازہ ہے، جس میں ایک ہزار سے زائد فضلاء کی دستار بندی ہوئی تھی، وہ آپ ہی کے زیرِ انتظام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

برطانوی گورنمنٹ کی جانب سے آپ کو "شمس العلماء" کا خطاب دیا گیا تھا، مگر

آپ نے دارالعلوم کے حریت پسندانہ مسلک کی بنار پر حکومت کا خطاب یافتہ ہونا پسند نہیں کیا، چنانچہ کچھ ہی وقفے کے بعد خطاب واپس کر دیا گیا۔

شروع سے درس وتدریس کا جو مشغلہ قائم ہوگیا تھا وہ زمانۂ اہتمام میں بھی کبھی بند نہیں ہوا، مشکوٰۃ المصابیح، جلالین شریف، صحیح مسلم، ابن ماجہ، مختصر المعانی، میر زاہد رسالہ وغیرہ کتابیں نہایت شوق سے پڑھاتے تھے، تقریر نہایت صاف و مربوط اور سلجھی ہوئی ہوتی تھی، اپنے والد ماجد کے خاص علوم اور مضامین پر کافی عبور تھا۔

۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۸ء میں نظام دکن کے دہلی آنے کی توقع تھی نظام کو دیوبند آنے کے وعدے کی یاددہانی کے لئے آپ حیدرآباد تشریف لے گئے، وہاں پہنچ کر طبیعت زیادہ خراب ہوگئی، واپسی کے قصد سے آپ حیدرآباد سے روانہ ہوئے، مگر ابھی ٹرین حیدرآباد کے حدود ہی میں تھی کہ نظام آباد اسٹیشن کے قریب حافظ صاحب جان، جانِ آفریں کے سپرد کر کے مَنْ مَاتَ فِي السَّفَرِ فَهُوَ شَهِيْدٌ میں داخل ہو گئے، یہ ۳ رجمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۸ء کا واقعہ ہے، نظام دکن کے اس تار پر کہ مولانا کو حیدرآباد لایا جائے، تابوت حیدرآباد لے جایا گیا، اگلے دن ۴ رجمادی الاولیٰ کو نظام دکن کے ذاتی مصارف پر ایک مخصوص قبرستان میں جو حیدرآباد میں "خطۂ صالحین" کے نام سے موسوم ہے اُن کو سپرد خاک کیا گیا، اس قبرستان میں حیدرآباد کی ممتاز شخصیتیں مشائخ و علماء و امراء دفن کئے جاتے ہیں۔

حافظ صاحبؒ نے ۴۵ سال دارالعلوم کی خدمات انجام دیں، ابتدائی ۱۰ سال تعلیم و تدریس میں گزرے اور ۳۵ سال اہتمام کے فرائض انجام دیئے۔

مولانا حبیب الرحمٰنؒ دیوبندی

آپ حضرت مولانا فضل الرحمٰنؒ کے خلفِ رشید تھے، شروع سے آخر تک دارالعلوم ہی میں علوم کی تکمیل کی سنہ ۱۳۰۰ھ میں تحصیلِ علم سے فراغت حاصل کی، آپ ایک متبحر عالم اور عربی زبان

کے زبردست ادیب تھے، اُن کا تدبّر اور انتظام دارالعلوم کی تاریخ میں ضرب المثل سمجھا جاتا تھا، دارالعلوم کی ترقی میں اُن کی خدمات اور خداداد صفات کو بڑا دخل حاصل ہے۔

۱۳۲۵ھ ۱۹۰۷ء میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کی مصروفیتوں اور اسفار کے باعث نیز دارالعلوم کو ترقی دینے کے سلسلے میں ایک ایسے لائق اور منتظم شخص کی مجلس شوریٰ کو ضرورت پیش آئی جو انتظامی امور اور ترقی کی تجاویز میں حافظ صاحبؒ کا ہاتھ بٹا سکے، اس کے لئے مجلس کے نزدیک آپ سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا، چنانچہ انکار کے باوجود آپ کو مجبور کر کے نیابتِ اہتمام کا منصب سپرد کر دیا گیا، کہا جاتا ہے کہ دارالعلوم کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اس کو مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ جیسا کام کرنے والا بیدار مغز منتظم اور مخلص ہاتھ آگیا، اہتمام کے کاموں میں انکو اس قدر شغف تھا کہ شب و روز کا بیشتر حصہ اسی میں صرف ہوتا تھا، حتیٰ کہ ان کی سکونت بھی دارالعلوم کے دارالاہتمام ہی میں تھی، اور اسی میں وفات بھی ہوئی، انھوں نے دارالعلوم کے شعبۂ انتظام و انصرام کو اتنا منظم اور مستحکم کر دیا تھا کہ جب حکومتِ آصفیہ کی جانب سے نواب صدر یار جنگ بہادر دارالعلوم کے حسابات کی تنقیح کے لئے دیوبند آئے تو اُن کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایک ایک اور دو، دو آنے تک کے حسابات کے کاغذات اور رسیدیں باضابطہ طور پر فائل میں موجود تھیں۔ نواب صدر یار جنگ بہادر کا بیان ہے کہ کوئی کاغذ ایسا نہ تھا جو مانگا گیا ہو اور فوراً پیش نہ کر دیا گیا ہو، حافظ صاحب کے عہدِ اہتمام کی ترقی بلحاظ تدبر و تنظیم درحقیقت آپ ہی کی رفاقت کا نتیجہ سمجھی جاتی ہے، آپ ہمیشہ اُن کے دستِ راست معتمد علیہ اور نائب رہے۔

۱۳۴۴ھ ۱۹۲۵ء میں جب حافظ صاحبؒ اپنی پیرانہ سالی کے باعث حیدرآباد کے مفتیٔ اعظم کے منصب سے سبکدوش ہوئے تو اُن کی جگہ پر آپ کا تقرر عمل میں آیا۔

مولانا حبیب الرحمٰن کی شخصیت ہر حیثیت سے یگانۂ روزگار تسلیم کی جاتی تھی، عام خیال ہے کہ اگر آپ کو ملکی سیاست میں بھی اتنا ہی شغف ہوتا جیسا کہ دارالعلوم کے

ساتھ تھا تو آپ ہندوستان کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر ثابت ہوتے۔

مطالعے کی کثرت نے آپ کو نہایت وسیع المعلومات بنا دیا تھا، حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے:۔

"اگر مجھ پر کسی کے علم کا اثر پڑتا ہے تو وہ مولانا حبیب الرحمٰن ہیں۔"

عربی ادب اور تاریخ سے خاص ذوق تھا اور ان علوم میں اُن کی وسیع النظری مشہورِ زمانہ تھی، متعدد تصانیف علمی یادگار ہیں، اُن کی تصانیف میں اشاعتِ اسلام المعروف بہ دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا؟ بڑی معرکہ آرا کتاب سمجھی جاتی ہے، "دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا" اس سوال کے جواب میں تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ان تاریخی واقعات کو پیش کیا گیا ہے جو اپنی نفسیاتی کشش کے اعتبار سے اسلام کی اشاعت اور ترقی کا باعث ہوئے۔

آپ نہایت نحیف الجثہ تھے، خوراک حیرت انگیز طور پر کم تھی، مگر ضعف اور کمزوری کے باوجود بے پناہ ہمّت کے مالک تھے، حضرت حافظ صاحبؒ کے انتقال کے ٹھیک چودہ ماہ بعد ۴ رجب ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء کی شب میں اس جہانِ فانی سے رحلت فرمائی اور ہمیشہ کے لئے دارالعلوم کو اپنا مدّاح چھوڑ گئے۔

ان کی ایک اور کتاب تعلیمات اسلام کے نام سے ہے جس میں اسلام کے طرزِ حکومت کو بیان کیا گیا ہے، اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ مشورہ امیر جماعت کے لئے کس قدر ضروری ہے، اس ضمن میں آپ نے بتلایا ہے کہ امیر کی ذات پر اگر کلی اعتماد ہو تو اکثریت و اقلیت کی رائے شماری کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر امیر کو یہ اعتماد حاصل نہ ہو تو پھر کام چلانے کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اکثریت کا اعتبار کیا جائے۔

حکیم عبدالوہاب معروف بہ حکیم نابینا

مشرقی یوپی کے ضلع غازی پور میں قصبہ یوسف پور وطن تھا، ہندوستان کے

مشہور سیاسی رہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے بڑے بھائی تھے، بچپن ہی سے بینائی جاتی رہی تھی، دس سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا، ابتدائی صرف و نحو کی تعلیم وطن میں پائی، سنہ ۱۳۰۱ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی ادب عربی مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور مولانا ذوالفقار علی دیوبندی سے پڑھا، دہلی میں طب حکیم محمود خاں سے پڑھی، منقول اور معقول کے ممتاز علماء سے تھے، تعلیم سے فارغ ہوکر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت کی، اور مرشد کی صحبت میں رہ کر باطنی کمال حاصل کیا، ان کا بیان ہے کہ:-

"ایک مرتبہ میں نے حضرت گنگوہیؒ سے عرض کیا کہ اگرچہ میں نے ذریعۂ معاش کے لئے طب پڑھ لی ہے، لیکن اطباء نبض کے علاوہ مریض کا چہرہ، قارورہ اور دوسرے مشاہدات کی مدد سے مرض کی تشخیص کرتے ہیں اور میں بوجہ عدم بصارت اس سے محروم ہوں میرے لئے دعاء فرمادیجئے کہ اللہ تعالےٰ میری اس مشکل کو آسان فرمادے" اس پر حضرت نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ تمہیں نباضی کی مہارت عطا فرمائے گا، جس سے تم مریض کے امراض پر مطلع ہوجاؤ گے، جنکو دوسرے اطباء مشاہدات سے معلوم کرتے ہیں"

حکیم صاحب کا بیان ہے کہ "میں شیخ کی اس کرامت کا روزانہ مشاہدہ کرتا ہوں، نبض پر ہاتھ رکھتے ہی مجھکو مریض اور مرض کی تمام کیفیتیں منکشف ہوجاتی ہیں"

اُن کی نبض شناسی کے عجیب و غریب واقعات سُننے میں آئے ہیں، تشخیصِ مرض اور تجویز دونوں میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے، علم النبض پر اُن کی ایک معرکہ آراء تصنیف "اسرارِ شریانیہ" کے نام سے ہے جس میں نبض کے موضوع پر بڑی حکیمانہ بحث کی گئی ہے، ہندوستان بھر میں اُن کے مطب کی شہرت تھی، دُور دُور سے لوگ اُن کے مطب میں آتے تھے اور شفایاب ہوتے تھے، بمبئی اور شولاپور میں مطب کیا، ایک مدت نظام دکن کے معالج خصوصی رہے، آخر میں دہلی میں مقیم ہوگئے

تھے، جامع مسجد کے قریب اُن کا مطب تھا، آخر میں کناٹ پلیس میں منتقل ہو گئے تھے، راقم سطور کو بھی اُن کا مطب دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، نبض اور امراض کی تشخیص میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، اس سلسلے میں اُن کے عجیب و غریب قصّے مشہور ہیں، ان کے سامنے دواؤں کا ایک بڑا صندوقچہ رکھا رہتا تھا، جس میں بہت سے خانے تھے، بے تامّل اُس میں سے دوا نکال لیتے تھے، اُن کا ہاتھ اُسی دوا کے خانے پر پڑتا تھا جس کی ضرورت ہوتی، اسی طرح سے خود ہی ٹیلیفون کے نمبر ملا لیتے تھے۔

مطب میں مریضوں کے بے پناہ ہجوم کے باوجود دینی علوم سے برابر شغف رہا، نہایت عبادت گزار اور پرہیزگار تھے، دیوبند، گنگوہ اور یوسف پور کے کسی مریض سے خواہ ہندو ہو یا مسلمان قیمتی سے قیمتی دوا کی قیمت کبھی نہیں لیتے تھے۔ یوسف پور وطن تھا، دیوبند میں تعلیم پائی تھی اور گنگوہ میں تربیت باطنی حاصل کی تھی، اسی طرح علماء و صوفیاء سے بھی قیمت نہیں لیتے تھے، ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ میں دہلی میں وفات پائی، وصیّت کے مطابق ان کا جنازہ دہلی سے گنگوہ لے جایا گیا اور حضرت گنگوہیؒ کے مزار کے قریب اُن کو دفن کیا گیا۔

مولانا غلام رسول ہزاروی

ضلع ہزارہ (پاکستان) کے رہنے والے تھے، ابتدائی تعلیم وطن میں پائی ۱۳۰۳ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی ۱۳۰۸ھ میں اُن کو دارالعلوم میں مدرس مقرر کیا گیا، علوم نقلیہ و عقلیہ کے حافظ اور جامع العلوم تھے، طبقۂ علماء میں اُن کی بڑی منزلت تھی، طلباء بڑے شوق سے اُن کے درس میں شامل ہوتے تھے، اُن کی غیر معمولی مقبولیت اور شہرت کے باعث مختلف مقامات سے اُن کو گراں قدر مشاہروں پر طلب کیا گیا، مگر اُنکو دارالعلوم سے اتنا تعلق تھا کہ اس کو کسی قیمت پر چھوڑنے کے لئے آمادہ نہ ہوئے، زندگی نہایت سادہ تھی، تیس سال تک دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دیں، ان کے تلامذہ میں بڑے بڑے نامور علماء

شامل ہیں۔

۱۸ محرم ۱۳۳۷ھ کو دارالعلوم میں وفات پائی، حضرت شیخ الہندؒ نے اُن کی رحلت پر جو مرثیہ لکھا ہے اس کے ایک شعر میں اُن کی علمی اور روحانی زندگی کا خلاصہ آگیا ہے، شعر یہ ہے۔

گزاری یونہی مرحبا، عمر ساری ٭ کہ دن مدرسہ میں، تو مسجد میں شب بھر

مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری

چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے، یہ بھی حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، ۱۳۰۴ھ میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے، نہایت ذکی اور طبّاع تھے، ظرافت مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اُن کے وعظ و تقریر کی بڑی شہرت تھی، اور مناظرے میں تو اُن کا پایہ بہت ہی بلند تھا، بدعات اور قادیانیت کے رد میں انھیں بڑا شغف تھا، مناظرے کے فن میں اُن کی بہت سی کتابیں چھپ چکی ہیں، جو اپنے موضوعات پر قابلِ قدر مباحث سے معمور ہیں، ایک زمانے میں اُن کی زبردست خطابت اور وعظ و تقریر سے ملک کا گوشہ گوشہ گونجتا رہا ہے، مطالعہ کتب کے ساتھ کتابیں خصوصاً نوادر و مخطوطات جمع کرنے کا بڑا شوق تھا، چنانچہ ایک بڑا کتب خانہ جو تقریباً آٹھ ہزار قیمتی مخطوطات و مطبوعات پر مشتمل ہے، یادگار چھوڑا، جسے ان کے صاحب زادہ محمد انور صاحب نے دارالعلوم میں منتقل کر دیا ہے۔

مولانا چاند پوری عرصۂ دراز تک دربھنگہ اور مرادآباد وغیرہ کے مدارس میں صدارتِ تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، لیکن ان کی خدمات کا اصل مقام دارالعلوم تھا چنانچہ اکابر کی نظرِ انتخاب نے اس گوہرِ نایاب کو دارالعلوم کے لئے منتخب کر کے اولاً نظامتِ تعلیم کا شعبہ اُن کے سپرد کیا، لیکن تبلیغی اسفار کی کثرت کے پیشِ نظر اُن کو شعبۂ تبلیغ کی نظامت

تفویض کی گئی، تبلیغ کے ساتھ ساتھ دارالعلوم میں درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، حضرت مولانا رفیع الدین صاحب سے شرفِ بیعت حاصل تھا، آخر عمر میں حضرت تھانوی رحمہم اللہ کی طرف رجوع کیا اور مجاز بیعت ہوئے۔

یکم رمضان ۱۳۵۰ھ کو دارالعلوم سے سبکدوش ہوکر وطن مالوف چاندپور میں قیام فرمایا اور وہیں ربیع الآخر ۱۳۷۱ھ دسمبر ۱۹۵۱ء میں وفات پائی۔

مولانا محمد یٰسین سرہندی ثم بریلوی

بسی متصل سرہند کے رہنے والے تھے، اولاً احمد حسن کانپوری سے پڑھا، پھر دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ میں تھے، پہلے مدرسہ فیضِ عام کانپور میں درس دیا پھر ۱۳۱۲ھ میں بریلی چلے گئے، وہاں مدرسہ اشاعت العلوم قائم کیا، نہایت نیک نفس اور مرنجان مرنج مگر بے حد صاف گو عالم تھے، ساری عمر درس وتدریس میں مصروف رہے، روہیل کھنڈ میں ان کا علمی فیض مدتوں تک جاری رہا، اور آج بھی اُن کا جاری کیا ہوا مدرسہ تشنگانِ علوم کو سیراب کر رہا ہے۔

اُن کے بڑے صاحبزادہ مولانا عبدالرشید مرحوم کا بیان ہے کہ مولانا احمد رضاخاں صاحب بریلوی ابتدائی کتب میں اُن کے شاگرد تھے، اور مولانا کو بڑے ادب آمیز لہجہ میں خطوط لکھا کرتے تھے، جو مولانا عبدالرشید مرحوم کے پاس محفوظ تھے، مولانا خیر محمد جالندھری بھی اُن کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے۔

، صفر ۱۳۶۳ھ میں وفات پائی اور بریلی ہی میں جس کو انھوں نے وطن بنالیا تھا، اپنے مدرسہ ہی میں دفن ہوئے۔

☆

مولانا عبیداللہ سندھی

مولانا عبیداللہ سندھیؒ مغربی پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں ۱۲۸۹ھ میں پیدا ہوئے اُن کے والد ہندو سے سکھ ہوگئے تھے، مولانا سندھیؒ نے ابتدائی تعلیم جام پور کے مڈل اسکول میں پائی، دورانِ تعلیم ہی میں اپنے مطالعہ سے صداقتِ اسلام سے متاثر ہوکر مشرف باسلام ہوگئے تھے، قبولِ اسلام کے بعد جام پور سے سندھ چلے گئے، وہاں حافظ محمد صدیقؒ کی خدمت میں کچھ مدت قیام کیا، حافظ صاحب ایک بڑے صاحبِ نسبت بزرگ اور درویش کامل تھے، مولانا سندھیؒ نے اپنی ذاتی ڈائری میں لکھا ہے کہ "حافظ صاحبؒ کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ اسلامی معاشرت میری طبیعتِ ثانیہ بن گئی" مولانا سندھیؒ ۱۳۰۶ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے، اور ۱۳۰۷ھ میں دورۂ حدیث میں شریک ہوئے، مگر تکمیل کی نوبت نہیں آئی، کچھ عرصے کے بعد سندھ چلے گئے، ۱۳۱۵ھ میں پھر دیوبند تشریف لائے اور اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ سے کتبِ حدیث کی اجازت حاصل کی، تعلیمی امور کے ساتھ سیاسی مشاغل میں بھی حضرتِ شیخ الہند سے وابستہ ہوگئے، ۱۳۲۷ھ میں دارالعلوم میں جمعیۃ الانصار کا قیام اُنہی کی کوشش کا نتیجہ تھا، مولانا سندھیؒ اس کے ناظم بنائے گئے، جمعیۃ الانصار کے دو بڑے جلسے جو مرادآباد اور میرٹھ میں منعقد ہوئے تھے، مولانا سندھیؒ ہی کی جد و جہد کا نتیجہ تھے، آپ دارالعلوم کو سیاسی انداز سے ملی تنظیم کا مرکز بنانا چاہتے تھے جس کا پہلا نقش جمعیۃ الانصار کا قیام تھا، اسی دوران میں مولانا سندھیؒ اور دارالعلوم کے بعض اساتذہ کے مابین بعض علمی مسائل میں شدید اختلاف رونما ہوگیا، جس کے سبب سے اُن کو دیوبند چھوڑنا پڑا، حضرت شیخ الہندؒ نے اُن کو دہلی بھیج دیا وہاں اُنھوں نے نظارۃ المعارف القرآنیہ[1] کے نام سے ایک

---

[1] نظارۃ المعارف القرآنیہ کے نام سے یہ ادارہ مولانا سندھیؒ نے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ادارہ قائم کیا جس کے سرپرستوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے علاوہ حکیم اجمل خاں دہلوی اور نواب وقار الملک جیسی مقتدر شخصیتیں شامل تھیں۔

۱۳۳۳ھ میں حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا سندھیؒ کو افغانستان بھیجا اُس وقت یہ خیال عام تھا کہ طاقت کے بغیر انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دینا ممکن نہیں ہے، اسکے لئے سپاہ اور اسلحہ کی ضرورت ہے، اس تحریک کا مرکز حضرت شیخ الہندؒ نے یاغستان کے آزاد علاقے کو بنایا تھا، مولانا سندھیؒ نے کابل پہنچ کر متعدد اہم سیاسی کام انجام دیئے کابل میں کانگریس کمیٹی قائم کر کے انڈین نیشنل کانگریس سے اُس کا الحاق کیا، برطانوی مقبوضات سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی تھی، اسی کے ساتھ اُنھوں نے "حزبُ اللہ" کے نام سے ایک فوج مرتب کی، افغانستان میں راجہ مہندر پرتاپ کی سربراہی میں جو آزاد حکومت قائم کی گئی تھی اس کے ایک اہم رکن رہے، حضرت شیخ الہندؒ کی حجاز میں گرفتاری کے بعد روس چلے گئے اور وہاں رہ کر سوشل ازم کا مشاہدہ کیا ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۳ء میں ترکی کا سفر کیا اور وہاں سے ۱۳۴۴ھ میں حجاز چلے گئے، جہاں چودہ سال کے قریب مقیم رہے، ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء میں جب صوبوں میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ۱۳۳۱ھ میں مسجد فتح پوری دہلی کے ایک کمرے میں قائم کیا تھا جس میں مدارس عربیہ کے فضلا اور گریجویٹ طلبا، کو تعلیم وتربیت دی جاتی تھی، اُن کو قرآن مجید کے حقائق ومعارف سے روشناس کرانے کے علاوہ حالات وقت کے مطابق تبلیغی اور سیاسی کاموں کی انجام دہی کے طریقے بھی بتلائے جاتے تھے، مولانا سندھیؒ کے افغانستان چلے جانے کے بعد دو سال تک مولانا احمد علی لاہوری اُن کے شاگرد نظارۃ المعارف القرآنیہ کے منتظم رہے، انکی گرفتاری کے بعد یہ ادارہ ختم ہوگیا، اس ادارہ کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ جدید تعلیم یافتہ اصحاب اور علمار کرام خصوصاً فضلار دیوبند کے درمیان روابط کو بڑھایا جائے اور جدید وقدیم کی درمیانی خلیج کو پُر کیا جائے۔ اسی مقصد کی تکمیل کے لئے پھر بعد میں انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں "بیت الحکمۃ" قائم کیا تھا۔

کانگریس کی حکومت قائم ہوئی تو یو۔ پی کی حکومت نے مولانا سندھیؒ سے برطانوی دور کی پابندی کو اٹھالیا اور وہ ۱۳۵۸ھ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان واپس آ گئے

جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی اور ریاست بہاول پور کے قصبہ دین پور میں انھوں نے زندگی کے آخری لمحات بسر کئے، مولانا سندھیؒ عہدِ حاضر میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفہ کے سب سے بڑے داعی اور علم بردار تھے، قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف سے متعلق علوم میں شاہ صاحبؒ نے جو تجدید فرمائی ہے، مولانا سندھی اُس کے ایک عظیم شارح تھے، ہر چند اُن کے بعض افکار سے اہلِ علم کو اختلاف بھی رہا مگر اختلافِ رائے کے باوجود اُن کی علمی فضیلت اور سیاسی سوجھ بوجھ کے سب ہی قائل تھے

"حکمت ولی اللہی" کی روشنی میں کتاب وسنت کی تشریح اور عہدِ حاضر کے مسائل کا حل نکالنے کے لئے ہی انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بیت الحکمہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور بعض معرکۃ الآرا مضامین بھی لکھے، جن میں الفرقان کے شاہ ولی اللہ نمبر کا مضمون بڑا عمیق اور فکر انگیز ہے۔

۲۱ راگست ۱۹۴۴ء ۱۳۶۳ھ کو دین پور میں جہاں مولانا سندھیؒ آخر عمر میں مقیم ہو گئے تھے انتقال فرمایا، افسوس ہے کہ جس ملک کی آزادی کے لئے اُنھیں ۲۵ سال ہندوستان سے جلا وطن رہ کر مصائب وآلام کی زندگی گزارنی پڑی، اس ملک کو اپنی زندگی میں آزاد نہ دیکھ سکے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری

آپ ۱۲۸۲ھ میں پیدا ہوئے، اگرچہ امرتسر (پنجاب) میں پروان چڑھے، مگر اصل کے اعتبار سے کشمیری ہیں، ان کے آباؤ واجداد قدیم زمانے میں مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔

کچھ دنوں مولانا احمد اللہ امرتسری سے تعلیم حاصل کی، حدیث کی کتابیں شیخ عبدالمنان وزیرآبادی سے پڑھیں، پھر ۱۳۰۰ھ میں دیوبند پہنچ کر منطق، حکمت، اصول اور فقہ کی تعلیم حاصل کی، کانپور میں مولانا احمد حسن کانپوری سے کچھ کتابیں پڑھیں، مگر اکابر دیوبند سے وابستگی میں کوئی فرق نہیں آیا، فراغت کے بعد امرتسر میں تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے مسلک کے لحاظ سے اہلِ حدیث تھے، ایک مطبع "اہلِ حدیث پریس" کے نام سے قائم کیا، ۱۳۲۱ھ میں ایک ہفت روزہ اخبار بھی "اہلِ حدیث" کے نام سے جاری کیا جو چوالیس سال تک نکلتا رہا۔

مرزا غلام احمد قادیانی کے رد میں آپ کی بہت سی قابلِ قدر کتابیں ہیں، ان کی اہم تصانیف یہ ہیں:۔

(۱) تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن اس میں اُنھوں نے قرآن کی تفسیر قرآن سے کی ہے
(۲) تفسیر ثنائی اُردو۔
(۳) تقابل ثلاثہ: یہ اُردو میں ہے، اس میں انھوں نے اسلام، وید اور انجیل کا تقابلی موازنہ کیا ہے۔

آپ قوی الحفظ اور سریع الجواب تھے، مناظرہ میں ہمیشہ کامیاب رہے، فریقِ مخالف کو شکست دینے میں اُنھیں خاص ملکہ حاصل تھا، شیرِ پنجاب کے لقب سے ملقب تھے، تصنیف و تالیف سے بڑا لگاؤ تھا، صحت کے تحفظ اور کپڑوں کی ستھرائی کا خاص اہتمام کرتے تھے، اوقات کے پابند، بلند اخلاق اور وسیع المعلومات تھے۔

ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی جدوجہد میں ہمیشہ شریک رہے جنودِ ربانیہ کی فہرست میں انھیں میجر جنرل لکھا ہے۔ جمعیۃ العلماء کی تاسیس میں بھی آپ کا حصہ ہے ملک کی آزادی کی تحریک میں جمعیۃ العلماء ہند کے رفیقِ کار رہے، اختلافِ مسلک کے باوجود اکابرِ دیوبند کے ہمیشہ گرویدہ رہے۔

اُنھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کو ۱۳۲۶ھ میں یہ چیلنج دیا تھا کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہوگا وہ پہلے مرجائے گا، جسے مرزا صاحب نے منظور کر لیا تھا، چنانچہ مرزا غلام احمد کا ہیضہ میں مبتلا ہو کر ۱۹۰۸ء ہی میں انتقال ہو گیا، مولانا اس کے بعد ۴۰ سال تک بقیدِ حیات رہے۔ تقسیم ہند کے بعد آپ امرتسر سے گوجرانوالہ (پاکستان) منتقل ہو گئے تھے، ۱۳۶۷ھ میں ۴ جمادی الاوّل کو سرگودھا میں وفات ہوئی۔ ۸۰ برس کی عمر پائی۔

مولانا سیف الرحمٰن کابلیؒ

اُن کے آباو اجداد قندھار سے آکر پشاور کے مضافات میں آباد ہو گئے تھے، وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی، مولانا لطف اللہ علی گڈھی سے علوم ریاضی کی تکمیل کی، حدیث کی تکمیل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں رہ کر کی، مدّت تک ٹونک میں تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دی، پھر مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں صدر مدرس ہو گئے، حضرت شیخ الہندؒ سے وابستہ اور اُن کی تحریک کے سرگرم رکن تھے، بڑے عالی ہمّت ذہین و ذکی اور مجاہد عالم تھے، ہندوستان میں ان کے بہت سے شاگرد تھے، حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد فرمانے پر ہجرت کر کے یاغستان کے آزاد علاقے میں چلے گئے، وہاں کے لوگوں کو وعظ و تبلیغ کے ذریعے سے ہندوستان کی آزادی کے لئے تیار کرتے رہے، مقرر بہت اچھے تھے، اُن کے وعظ و تقریر سے یاغستان کے لوگوں میں غیر معمولی جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا جنودِ ربانیہ کی فہرست میں ان کا عہدہ میجر جنرل کا تھا، پہلی جنگ عظیم کے آغاز میں جب ۱۹۱۴ء میں حاجی ترنگ زئیؒ[1] نے انگریزوں کے خلاف عَلَمِ جہاد بلند کیا تو مولانا سیف الرحمٰن

---

[1] ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ میں حاجی تُرنگ زئی، صوبہ سرحد کی ایک زبردست اور مشہور شخصیت تھے، ضلع پشاور کے ایک گاؤں ترنگ زئی کے رہنے والے تھے، (باقی آئندہ صفحہ پر)

نے اس میں شریک ہو کر نمایاں کام کیے، جنگ کی اس کوشش میں ناکام ہونے کے بعد افغانستان چلے گئے، برطانوی حکومت سے انھیں جو نفرت تھی اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ ہٹلر نے جب فرانس پر حملہ کیا اور یورپ میں باہم جنگ چھڑ گئی تو حملے کی خبر سنتے ہی جوش میں آکر سجدے میں گر گئے، اور یوں گویا ہوئے "خدایا!

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اصل نام فضل واحد تھا، مگر نام کے بجائے وطن کی نسبت سے حاجی ترنگ زئی کے نام سے اُن کی شہرت تھی، نہایت متقی و پرہیزگار صاحب علم و عمل اور شیخ طریقت تھے، مولانا شاہ نجم الدین معروف بہ حضرت صوات صاحب کے خلیفہ و جانشین تھے، جذباتِ حریت سے سرشار اور آزادی کے بڑے دلدادہ تھے، پشاور اور یاغستان کے علاقے میں اُن کے ہزاروں مرید تھے، غیر معمولی شہرت کے ساتھ عوام میں بے حد مقبول تھے، ۱۹۱۴ء میں حاجی ترنگ زئی، حضرت شیخ الہندؒ کے ایما سے اپنے وطن پشاور سے ہجرت کر کے یاغستان چلے گئے تھے، برطانوی فوجوں سے انھیں کئی مرتبہ لڑنے کی نوبت آئی اور انگریزی فوجوں کو اُن کے مقابلے میں کئی مرتبہ سخت نقصان اُٹھا کر پسپا ہونا پڑا تھا، مشہور ہے کہ انگریزوں سے جنگ میں اُن کے مجاہدین کی فائرنگ کا کوئی نشانہ خطا نہ ہوتا تھا۔

حجاز کے دورانِ قیام میں حضرت شیخ الہندؒ وہاں سے براہِ ایران اِنہی حاجی ترنگ زئی کے پاس یاغستان جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ شریف حسین نے جو ترکوں کے خلاف انگریزوں کا حلیف بن گیا تھا، انھیں گرفتار کر کے برطانوی حکام کے حوالے کر دیا تھا۔

حاجی ترنگ زئی جب تک زندہ رہے برابر انگریزوں سے جنگ کرتے رہے، یہاں تک کہ پیغام اجل نے اُنھیں واصل بحق کر دیا، اللہ تعالیٰ اُنھیں اپنی رحمتوں سے نوازے عجیب مردِ مومن تھا جو دمِ آخر تک انگریزوں سے نبرد آزما رہا۔

تیرا شکر ہے کہ بھیڑیوں میں باہم جنگ شروع ہوگئی جس سے مظلوم قوموں کے بچ جانے کی اُمید ہوگئی ہے۔ اور مجھے اب اپنے مرنے کا غم نہیں ہے۔"

امیر امان اللہ خاں کے عہدِ حکومت میں افغانستان میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے، پاکستان بننے کے بعد وہ پشاور واپس آگئے، ۷ رجمادی الاولیٰ ۱۳۶۹ھ کو اپنے آبائی وطن میں وفات پائی۔

مولانا حکیم محمد اسحٰق کٹھوریؒ

کٹھور ضلع میرٹھ کے خاندانِ سادات سے تھے، ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم میرٹھ میں اپنے چچا مولانا کفایت علی سے حاصل کی، پھر مدرسہ عالیہ فتح پوری میں پڑھا بعد ازاں امروہہ میں حضرت مولانا احمد حسن امروہیؒ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا، آخر میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے کر ۱۳۰۸ھ میں علوم سے فراغت حاصل کی، حضرت شیخ الہندؒ کے دورِ صدارت تدریس کے اولین تلامذہ میں سے تھے، طب کی تعلیم حکیم عبدالمجید خاں صاحب دہلوی اور حکیم عبدالعزیز خاں صاحب لکھنوی سے حاصل کی۔

شروع میں کچھ مدت کٹھور میں اُن کا مطب رہا، پھر میرٹھ شہر میں منتقل ہوگیا، مطب کے ساتھ طب کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا، بہت سے لوگوں نے اُن سے طب پڑھی، نبض کے موضوع پر اُنھوں نے فارسی میں ایک ضخیم کتاب بھی لکھی ہے جو طبع نہیں ہوسکی۔

اپنے وطن کٹھور میں عیدگاہ اور جامع مسجد تعمیر کرائی، میرٹھ شہر میں بھی ایک نہایت خوشنما سنگیں مسجد اُنھوں نے بنوائی ہے، میرٹھ کے اطراف میں عقدِ بیوگان کو رواج دینے میں حکیم صاحب کی جدوجہد کا بڑا حصہ ہے، ملّی اور سیاسی کاموں میں بھی شریک رہتے تھے۔

۱۳۲۷ھ میں جب دارالعلوم کے لئے دیہات سے غلّہ فراہم کرنے کی تجویز طے ہوئی تو

سب سے پہلے حکیم صاحب نے اس پر لبیک کہا، اور کٹھور اور اس کے اطراف سے دارالعلوم کے لئے غلّہ فراہم کرنے پر توجہ دی اور غلّہ کی خاصی مقدار ان کی جدوجہد سے فراہم ہو گئی، روداد دارالعلوم میں لکھا ہے کہ :-

"سب سے پہلے اس آواز پر کان دھرنے والے اور اس پر عمل کرنے والے حضرات کٹھور اور اس کے نواح کے ہیں جو بتوجہ خاص جناب حکیم مولوی محمد اسحٰق صاحب اس پر عمل پیرا ہوئے، سالہا سال حکیم صاحب کی توجہ سے ضلع میرٹھ سے گیہوں فراہم ہوتا رہا[1]"

روداد میں حکیم صاحب کی نسبت لکھا ہے کہ: "اوصافِ حمیدہ کے حامل تھے، خلوص کے ساتھ دارالعلوم کے معاملات میں فکر و تدبر اور بہی خواہی کا ایک خاص مقام رکھتے تھے[2]"

صاحبِ نسبت اور پابندِ اوقات بزرگ تھے، حضرت گنگوہیؒ سے خلافت حاصل تھی، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بڑی بے تکلفی تھی، جب دونوں ملتے تو مولانا مدنیؒ ان کی جیب سے بٹوہ کھینچتے، دیر تک چھینا جھپٹی ہوتی رہتی، آخر مولانا کامیاب ہوتے اور بٹوہ لے کر جو رقم نکلتی اس کی مٹھائی منگاتے، بڑے خوش اخلاق، خندہ جبیں اور متواضع شخصیت تھے، جمعیۃ العلماء ہند سے بھی گہرا تعلق تھا۔

دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ۱۳۴۴ھ سے ۱۳۷۳ھ تک ممبر رہے، ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء میں وفات پائی، وطنِ مالوف میں دفن کیا گیا۔

مولانا سیّد محمد انور شاہ کشمیریؒ

شاہ صاحب کشمیر کے رہنے والے تھے، ۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء کو سادات کے ایک معزز علمی خاندان میں آپ کی ولادت ہوئی، یہ خاندان اپنے علم و فضل کے لحاظ سے کشمیر بھر

---

[1] روداد تحصیل غلّہ ۱۳۳۲ھ ص ۲ [2] روداد ۱۳۷۳ھ ص ۱ ۔

ممتاز خاندان سمجھا جاتا تھا، ساڑھے چار سال کی عمر میں اپنے والد بزرگوار مولانا سید معظم شاہؒ سے قرآن مجید شروع کیا، غیر معمولی ذہانت و ذکاوت اور بے مثل قوتِ حافظہ ابتدا عمر سے موجود تھی، چنانچہ ڈیڑھ سال کی قلیل مدت میں کتاب اللہ کے ساتھ فارسی کی چند ابتدائی کتابیں ختم کر کے علومِ متداولہ کی تحصیل میں مشغول ہو گئے اور ابھی بمشکل ۱۴ سال کی عمر تھی کہ حصولِ علم کے جذبۂ بے پایاں نے ترکِ وطن پر آمادہ کر دیا، تقریباً تین سال ہزارہ کے مدارس میں رہ کر مختلف علوم و فنون میں دست گاہ حاصل کی، مگر دیوبند کی شہرت نے مزید تکمیل کیلئے بے چین بنا دیا، چنانچہ سنہ ۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۲ء میں دیوبند تشریف لائے، حضرت شیخ الہندؒ مسند صدارت پر متمکن تھے استاد نے شاگرد کو اور شاگرد نے استاد کو پہلی ہی ملاقات میں پہچان لیا، تفسیر و حدیث کی کتابیں شروع کیں اور چند ہی سال میں دار العلوم میں شہرت و مقبولیت کے ساتھ ایک امتیازی شان حاصل کر لی، سنہ ۱۳۱۴ھ میں دار العلوم[1] سے فارغ ہو کر آپ حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سندِ حدیث کے علاوہ باطنی فیوض سے بھی مستفیض ہوئے اور خلافت حاصل کی۔

دار العلوم سے فراغت کے بعد آپ نے مدرسہ امینیہ دہلی میں کچھ دنوں فرائض تدریس انجام دیئے، سنہ ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء میں کشمیر چلے گئے، وہاں اپنے علاقے میں فیضِ عام کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا، سنہ ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء میں حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے، کچھ مدت تک حجاز میں قیام رہا اور وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کا موقع ملا، ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء میں آپ دیوبند تشریف لائے، حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کو یہاں روک لیا، کئی سال تک بغیر مشاہرے کے کتبِ حدیث کے درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، اور جب تک دار العلوم سے تنخواہ نہیں لی حضرت حافظ محمد احمد صاحبؒ کے مہمان رہے ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۵ء کے

[1] روداد ہائے سنہ ۱۳۱۱ھ لغایۃ سنہ ۱۳۱۴ھ۔

اواخر میں جب شیخ الہندؒ نے سفرِ حجاز کا قصد کیا تو اپنی جانشینی کا فخر شاہ صاحبؒ کو بخشا، دارالعلوم کی مسندِ صدارت پر تقریباً ۱۲ سال تک جلوہ افروز رہے، ۱۳۴۶ھ ۱۹۲۷ء کے اوائل میں اہتمام دارالعلوم سے بعض اختلافات کے باعث آپ فرائضِ صدارت سے دست کش ہو کر جنوبی ہند کے مدرسہ ڈابھیل میں تشریف لے گئے اور ۱۳۵۱ھ ۱۹۳۲ء تک وہاں درسِ حدیث کا مشغلہ جاری رہا۔

قدرت کی جانب سے حافظہ ایسا عدیم النظیر بخشا گیا تھا کہ ایک مرتبہ کی دیکھی ہوئی کتاب کے مضامین و مطالب تو درکنار عبارتیں تک مع صفحات و سطور کے یاد رہتیں اور دورانِ تقریر میں بے تکلف حوالے پر حوالے دیتے چلے جاتے تھے، اسی کے ساتھ مطالعے کا اس قدر شوق تھا کہ جملہ علوم کے خزانے اُن کے دامنِ جستجو کی وسعتوں کو مطمئن اور تشنگیٔ علم کو سیراب نہ کر سکتے تھے، کثرتِ مطالعہ اور قوتِ حافظہ کے باعث گویا ایک متحرک و متکلم کتب خانہ تھے، صحاحِ ستہ کے علاوہ حدیث کی اکثر کتابیں تقریباً بر نوک زبان تھیں تحقیق طلب مسائل میں جن کی جستجو اور تحقیق میں عمریں گزر جاتی ہیں، سائل کے استفسار پر چند لمحوں میں اس قدر جامعیت کے ساتھ جواب دیتے تھے کہ اس موضوع پر سائل کو نہ تو شبہ باقی رہتا تھا اور نہ کتاب دیکھنے کی ضرورت، پھر مزید لطف یہ کہ کتابوں کے ناموں کے ساتھ صفحات و سطور تک کا حوالہ بھی بتلا دیا جاتا تھا، وہ ہر ایک علم و فن پر اس طرح برجستگی کے ساتھ تقریر فرماتے تھے کہ گویا ان کو یہ تمام علوم مستحضر ہیں، اور ابھی ابھی ان کا مطالعہ کیا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے شاہ صاحبؒ کی وفات پر "معارف" میں لکھا تھا:-

"اُن کی مثال اُس سمندر کی سی تھی جس کی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے، وہ وسعتِ نظر، قوتِ حافظہ اور کثرتِ حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے، علوم حدیث کے حافظ و نکتہ شناس، علوم ادب

ہیں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند اور زہد و تقویٰ میں کامل تھے مرتے دم تک علم و معرفت کے اس شہید نے قال اللہ و قال الرسول کا نعرہ بلند رکھا۔"

مصر کے مشہورِ زمانہ عالم سید رشید رضا صاحب جب دیوبند تشریف لائے اور شاہ صاحبؒ سے ان کی ملاقات ہوئی تو بے ساختہ بار بار کہتے تھے:۔

ما رائیتُ مثل ھذا الاستاذ الجلیل میں نے اس جلیل القدر استاد جیسا کوئی عالم نہیں دیکھا، علامہ رشید رضا نے مصر جاکر بھی اپنے رسالہ "المنار" میں اُن کی جلالت علمی و عظمت شان کا اعتراف کیا ہے۔

بہر حال دار العلوم کی یہ خوش قسمتی تھی کہ حضرت شیخ الہندؒ کے بعد صدارتِ تدریس کا کام آپ کے سپرد ہوا۔

علامہ اقبال مرحوم کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں اسلامی تعلیمات سے جو شغف پیدا ہو گیا تھا اس میں شاہ صاحبؒ کے فیضانِ علمی کو بھی بڑا دخل حاصل ہے، علامہ موصوف نے اسلامیات میں شاہ صاحبؒ سے بہت کچھ استفادہ کیا تھا، چنانچہ علامہ اقبال مرحوم آپ کا بے حد احترام کرتے تھے اور عقیدت و محبت کے جذبات کے ساتھ شاہ صاحبؒ کی رائے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتے تھے۔

جب حضرت شاہ صاحب دیوبند سے علیحدہ ہوئے تو علامہ اقبال نے کوشش کی کہ وہ مستقل طور پر لاہور میں قیام اختیار کرلیں تاکہ وہ ان کے ساتھ مل کر فقہ کی تدوینِ جدید کا کام کرسکیں، مگر شاہ صاحبؒ نے ڈابھیل والوں کی درخواست منظور فرما لی، تاہم علامہ اقبال نے اس سلسلے کے انگریزی لکچروں کی ترتیب میں حضرت شاہ صاحبؒ سے بہت استفادہ کیا اور اس کا اعتراف بھی کیا ہے، قادیانیت کے خلاف ڈاکٹر صاحب نے جو گراں پایہ مضامین لکھے ہیں اُن میں حضرت شاہ صاحب کی پوری مدد شامل رہی ہے۔

علمی ذوق کا طبیعت پر اس قدر غلبہ تھا کہ عرصے تک نکاح اور متاہلانہ زندگی سے گھبراتے

رہے، مگر بالآخر بزرگوں کے شدید اصرار سے ۴۳ سال کی عمر میں متأہلانہ زندگی اختیار فرمالی تھی اور اس کے بعد تنخواہ لینے لگے تھے، ڈابھیل میں چند سال قیام فرمانے کے بعد آخر میں امراض کی شدت سے مجبور ہو کر دیوبند جس کو آپ نے اپنا وطنِ اقامت بنالیا تھا چلے آئے اور یہیں ۳ صفر المظفر ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء کو تقریباً ۶۰ سال کی عمر میں رحلت فرمائی، قبرِ مبارک عیدگاہ کے قریب ہے ۔

مولانا شاہ وارث حسنؒ

کوڑا جہان آباد وطن تھا، ۱۳۱۰ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۱۳۱۲ھ میں تحصیل علم سے فراغت پاکر حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں رہ کر خلافت حاصل کی، پھر حجاز چلے گئے، وہاں کچھ دن حضرت شیخ المشائخ حاجی امداد اللہؒ کی خدمت میں رہے ۔

کچھ مدت تک بنارس اور مظفرپور میں صدر مدرس رہے، پھر ملازمت ترک کر کے لکھنؤ میں اقامت اختیار کی، اور رشد وہدایت میں مشغول ہو گئے انگریزی داں طبقہ اُن سے زیادہ مستفید ہوا، استفادہ کرنے والوں میں جج، وکیل اور بڑے بڑے افسر اور رؤسار شامل تھے ۔

۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ کو وفات پائی، جامع مسجد ٹیلہ شاہ پیر محمد لکھنؤ کے قریب مدفون ہیں ۔

حضرت مولانا امین الدین دہلویؒ

تقریباً ۱۲۸۳ھ میں اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے، ایولہ ضلع ناسک میں سکونت اختیار کر لی تھی اور آخر میں مدرسہ امینیہ کے قیام کے بعد بس دہلی ہی کے ہو کر رہ گئے تھے، ۱۳۰۳ھ میں بغرضِ تحصیل علم دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا پھر ۱۳۰۷ھ میں شاہجہانپور

چلے گئے، وہاں مولانا نادر الدین سے معقولات کی کچھ کتابیں پڑھیں، مولانا موصوف منطق و فلسفہ میں مولانا عبدالحق خیرآبادی کے شاگرد خاص تھے. ۱۳۰۹ھ میں پھر دیوبند واپس آکر درسِ نظامی کی تکمیل کی اور ۱۳۱۲ھ میں دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے۔

۱۳۱۵ھ میں آپ نے سُنہری مسجد چاندنی چوک دہلی میں مدرسہ امینیہ[1] جاری کیا، دہلی اور اس کے اطراف میں اپنے زُہد و تقویٰ کے باعث اُن کی بڑی شہرت تھی، عملیات کے فن میں بھی دست گاہ رکھتے تھے، اس سبب سے اُن کے عقیدت مندوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، اُن کے دل میں فیض رسانی کا جذبہ موجزن رہتا تھا، دینی معاملات اور مدرسہ کے انتظامات کے سلسلے میں کسی کی رُو رعایت نہیں کرتے تھے، سیاسی ہنگاموں سے ہمیشہ دامن کش رہے، طلبار کو اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے، اُن سے بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے تھے۔

۱۹ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ (۶ جون ۱۹۲۰ء) کو وفات پائی، "مہندیوں" میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مزار کے قریب مدفون ہیں۔

---

[1] مدرسہ امینیہ دہلی کا ایک مشہور مدرسہ ہے، ۱۳۱۵ھ میں حضرت مولانا امین الدین کے ہاتھوں سے اُسکی بنیاد رکھی گئی اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ سب سے پہلے صدر مدرس مقرر ہوئے، حضرت شاہ صاحب کے بعد حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ نے مسندِ صدارت کو زینت بخشی، اوّلاً مدرسہ امینیہ بازار چاندنی چوک دہلی کی سنہری مسجد میں قائم کیا گیا تھا، جب مدرسہ کو ترقی ہوئی تو ۱۳۲۳ھ میں اسکو کشمیری دروازے کی مسجد پانی پتیان میں منتقل کر دیا گیا، حضرت مفتی صاحب کے عہدِ صدارت میں مدرسہ امینیہ نے کافی ترقی کی، برّصغیر کے دُور دراز علاقوں کے علاوہ بیرونی ملکوں کے طلبار کا رجوع بھی اُس میں ہونے لگا، مسجد کے اطراف میں مدرسہ کی سہ منزلہ شاندار عمارت تعمیر ہوئی، دہلی کے تمام دوسرے دینی مدارس سے اپنی جلالتِ علمی اور مرکزیت کے لحاظ سے یہ مدرسہ ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔

مولانا محمد صادق کراچوی

کراچی کے باشندے تھے، دارالعلوم سے ۱۳۱۲ھ میں حدیث کی تکمیل کی، حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کے سرگرم رکن تھے، مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے اُن کے بہت گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے، پہلی جنگِ عظیم کے دوران جب انگریزوں نے عراق پر حملہ کیا جو ترکی کے قلمرو میں شامل تھا تو اُنھوں نے سندھ میں لس بیلا کے بلوچی قبائل میں بغاوت کرادی، جس کی وجہ سے انگریز عراق میں بروقت کمک نہ پہنچا سکے اور وہاں انگریزی فوجوں کو مجبور ہو کر ترکوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینے پڑے، مولانا محمد صادق کو بغاوت برپا کرنے کے جرم میں گرفتار کر کے مہاراشٹر میں نظر بند کر دیا گیا، جنگ ختم ہو جانے پر رہا کیے گئے، جنودِ ربّانیہ[1] کی فہرست میں اُن کا عہدہ کرنل کا تھا۔

تحریکِ خلافت کے زمانے میں اہم سیاسی خدمات انجام دیں، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلما سندھ کے مختلف عہدوں پر فائز رہے، جمعیۃ العلماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کے آخر تک رکن رہے، ۱۳۵۰ھ سے ۱۳۶۷ھ تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔

مولانا ممدوح نے کراچی کے کھڈہ محلہ میں مدرسہ قائم کیا، اور بقیہ عمر اسی کے نظم و

---

[1] مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا منصور انصاری نے قیام افغانستان کے زمانے میں ہندوستان کی آزادی کے لئے عارضی حکومت کا جو خاکہ تیار کیا تھا اُس کی فوج کا نام الجنود الرّبانیہ، یعنی لشکر نجات دہندہ (مکتی فوج) تجویز کیا گیا تھا، اس لشکر نجات دہندہ کے عہدوں کے لئے بہت سے افراد نام زد کر دیئے گئے تھے، رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں ان سب کے نام اور عہدے بیان کئے گئے ہیں۔

انصرام اور درس حدیث و قرآن میں بسر کی یہ مدرسہ آج بھی سرچشمۂ فیض بنا ہوا ہے۔
حضرت مولانا محمد طیب صاحب جب بھی پاکستان جاتے ہیں تو مولانا کا اور اُن کے بعد اُن کے جانشینوں یہ معمول رہا ہے کہ وہ بطور خاص اُنھیں مدرسہ میں دعوت دیتے ہیں۔

مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی

۱۲۹۲ھ میں شاہجہان پور میں پیدا ہوئے، قرآن شریف اور ابتدائی تعلیم وطن میں مختلف اساتذہ سے حاصل کی، پھر کچھ کتابیں مدرسہ اعزازیہ شاہ جہاں پور میں پڑھیں بعدازاں مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخل ہوگئے، وہاں مولانا عبدالعلی میرٹھی تلمیذ حضرت نانوتویؒ اور دوسرے اساتذہ سے پڑھا، آخر میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۱۳۱۵ھ میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے۔

حضرت مفتی صاحب نے مرادآباد اور دارالعلوم میں غربت کے باوجود طالب علمی کا زمانہ نہایت خودداری سے گزارا، وہ کروشیا سے ٹوپیاں بُن کر اس کی آمدنی سے اپنے تمام اخراجات پورے کرتے تھے۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد مفتی صاحب مدرسہ عین العلم شاہ جہاں پور میں مدرس مقرر ہوگئے، اس زمانے میں اُنھوں نے فتویٰ نویسی کا آغاز کیا اور قادیانیت کی تردید کیلئے ۱۳۲۱ھ میں ایک ماہنامہ "البرہان" جاری کیا۔

۱۳۲۱ھ کے اواخر میں آپ مولانا امین الدین صاحب کے اصرار پر مدرسہ امینیہ دہلی کی مسندِ صدارت تدریس پر متمکن ہوئے، جس سے تادمِ واپسیں وابستہ رہے، مفتی صاحب محدث، فقیہہ، مفتی، مجاہد اور نکتہ سنج علماء میں سے تھے، حضرت مفتی صاحب کو اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ سے بڑی ارادت تھی، اس لئے شروع ہی سے آپ سیاسیات میں دلچسپی لینے لگے، چنانچہ ۱۹۱۹ء میں آپ نے دوسرے علماء کے ساتھ مل کر جمعیۃ العلماء ہند قائم کی،

جس کے ایک طویل مدّت تک آپ صدر رہے، اور ہمیشہ جمعیۃ العلماء اور کانگریس کی تحریکوں میں پیش پیش رہے، سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں آپ کو قید و بند سے بھی دوچار ہونا پڑا مگر جیل میں بھی آپ کے علمی مشاغل جاری رہتے تھے۔ چنانچہ ملتان جیل میں مولانا احمد سعید دہلویؒ نے آپ سے دیوانِ حماسہ وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ اور ہندوستان کے مشہور لیڈر لالہ دیش بندھو نے آپ سے فارسی پڑھی، حضرت مفتی صاحب نے ایک مرتبہ حجاز اور دوسری بار مصر کے اجتماعات میں ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کے فرائض انجام دیئے۔ حضرت مفتی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ مدرسہ امینیہ دہلی ہے، جس کو آپ نے اپنی جدوجہد سے غیر معمولی ترقی دی اور ہندوستان کے مشہور دینی مدارس میں اس کا شمار ہونے لگا۔

مفتی صاحب کے فتاویٰ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کے فتاویٰ مختصر ہوتے ہیں، اور اُن کی زبان صاف اور واضح ہوتی ہے، ان کے فتاویٰ کی تعداد بہت زیادہ ہے، آپ کے فرزند مولانا حفیظ الرحمٰن واصف آپ کے فتاویٰ کو کفایت المفتی کے نام سے مرتب کر کے شائع کر رہے ہیں۔ اب تک چھ جلدیں طبع ہو چکی ہیں، تصانیف میں تعلیم الاسلام آپ کی مشہور تصنیف ہے، جو اُنھوں نے اسلامی مدارس کے بچّوں کے لئے نہایت سلیس اُردو زبان میں بطور سوال جواب چار حصّوں میں لکھی ہے، یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی ہے، کہ انگریزی اور ہندی میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے ' اور ہندو بیرون ہند میں رائج ہے، حضرت مولانا محمد طیّب صاحب کا بیان ہے کہ جب وہ زنجبار پہونچے تو دیکھا کہ وہاں کے مدارس میں تعلیم الاسلام نصابِ تعلیم میں شامل ہے۔

حضرت مفتی صاحب ۱۳۵۵ھ سے ۱۳۶۲ھ تک دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے، آخر میں ملک کے تباہ کن حالات نے آپ کو بہت زیادہ افسردہ کر دیا تھا، چند ماہ کی طویل علالت کے بعد ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ کو شب میں عازم ملکِ بقا ہو گئے۔

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے اراکین نے حضرت مفتی صاحب کی وفات پر ان الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا :۔

"حضرت مفتی صاحب اپنے علم وفضل، تقویٰ وطہارت اور اخلاق وکمالات کے لحاظ سے طبقۂ علماء کی ایک بے نظیر شخصیت تھے، آپ دارالعلوم کے ایک ممتاز فاضل اور اس کی مجلس شوریٰ کے ایک فہیم اور مدبر رکن تھے۔ ان کی وفات ملتِ اسلامیہ نیز دارالعلوم کے حلقوں کا ایک ایسا خلا ہے جو بظاہر اسباب جلد بھرنے والا نہیں ہے، وہ وقت کے اُن چیدہ اور منتخب روزگار علماء میں سے تھے جو بیک وقت عالم وفاضل، فقیہ ومحدّث ادیب وشاعر، ناظم وناثر، تقی ونقی، غیور ومجاہد اور اسی کے ساتھ ذکاوت وفطانت میں بے مثل تھے۔ ان کی شخصیت نہ صرف معاصرین میں بلکہ اساتذہ واکابرین میں قابل اعتماد اور لائق بھروسہ تھی، سب ہی اُن کے علم وفضل، اعتدال مزاج اور رعایتِ حدود کے قائل تھے۔"

مولانا ماجد علی جون پوری

جون پور کے رہنے والے تھے، ۱۳۱۴ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت پائی، شروع میں مینڈھو (علی گڑھ) اور گلاؤٹھی (بلندشہر) میں مدرس رہے، کچھ مدت تک دہلی کے مدارس میں درس دیا، آخر میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرس مقرر ہوئے مشرقی ہندوستان کے مشاہیر علم وفضل میں تھے۔ اور اپنے دور کے زبردست معقولی عالم سمجھے جاتے تھے، معقولات کی تحصیل مولانا عبدالحق خیرآبادی اور مولانا احمد حسن صاحب کانپوری سے کی تھی، حضرت گنگوہیؒ کے درسِ حدیث میں دوسال تک شریک رہے، قیام گنگوہ کے زمانے میں رات رات بھر حضرت گنگوہیؒ کی تقریر قلم بند کرتے، بعض دفعہ اس میں اتنا استغراق ہوتا کہ فجر کی اذان ہوجاتی۔

حضرت مولانا عبدالغنی پھول پوریؒ جو حضرت تھانویؒ کے اجلّہ خلفاء میں تھے، اور حضرت مولانا سید فخرالدین احمدؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اُن کے تلامذہ میں شامل ہیں ۔

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

حضرت مدنیؒ کا وطن موضع اللہ داد پور ٹانڈہ ضلع فیض آباد ہے، ۱۹ر شوال ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء کو ضلع اُناؤ کے ایک قصبہ بانگرمئو میں جہاں آپ کے والد ماجد سید حبیب اللہ صاحب ہیڈ ماسٹر تھے پیدا ہوئے، ۱۹ پشت پیشتر آپ کا خاندان ہندوستان آیا تھا، اپنے علم و تقویٰ کے لحاظ سے سادات کا یہ خاندان ہمیشہ ایک خاص عظمت اور شاہی زمانے میں ایک بڑی جاگیر کا مالک رہا ہے ۔

ابتدائی تعلیم پرائمری اسکول میں حاصل کرنے کے بعد بعمر ۱۲ سال ۱۳۰۹ھ / ۱۸۹۱ء آپ دیوبند تشریف لائے، ابتدائی درجہ میں داخلہ لیا، یہاں حضرت شیخ الہندؒ نے خاص شفقت وعنایت سے آپ کی تعلیم و تربیت فرمائی، ۱۳۱۵ھ میں دارالعلوم کے نصاب کی تکمیل کی، سات سال یہاں کے علمی ماحول میں گزارنے کے بعد جب وطن مالوف تشریف لے گئے تو والد ماجد شوقِ ہجرت میں مدینۃ الرسول کے لئے رختِ سفر باندھ چکے تھے، آپ بھی والدین کے ہمراہ روانہ ہو گئے، روانگی حجاز سے قبل آپ حضرت گنگوہی سے بیعت ہو چکے تھے، مکہ مکرمہ میں پیرو مرشد کی ہدایت کے بموجب کچھ عرصہ تک حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہٗ سے کسبِ فیض کیا بعد ازاں مدینہ منورہ میں والد ماجد کے ساتھ مقیم ہو گئے ہرچند آپ نے ہندوستان سے ہجرت کا قصد نہیں فرمایا تھا تاہم والد صاحب کی حیات تک آغوشِ پدری کو چھوڑ کر ہندوستان واپس آنا پسند نہیں فرمایا ۔

قیامِ مدینہ کے زمانے میں تقریباً ۱۰ سال تک مسجدِ نبوی میں درسِ حدیث کی خدمت

تنگی اور عُسرت کے باوجود توکلاً علی اللہ انجام دی، عموماً روزانہ ۱۲-۱۲ گھنٹے تک مسلسل درس و تدریس کا مشغلہ جاری رہتا تھا، مختلف جماعتیں یکے بعد دیگرے حاضر ہو کر آپ کے فیضانِ علمی سے سیراب ہوتی تھیں، مسجدِ نبوی میں آپ کا درسِ حدیث وہاں کے تمام شیوخِ حدیث سے زیادہ پسندیدہ اور مقبول تھا اور اس کی شہرت نے مختلف اسلامی ممالک کے طالبانِ علم کی ایک بڑی تعداد کو آپ کے گرد جمع کر دیا تھا، حجاز کی مقدس سرزمین اور خاص مسجدِ نبوی میں ایک ہندوستانی عالم کی جانب اس قدر کشش اور قبولِ عام کا باعث آپ کے طریقِ درس کی اُس خصوصیت کو سمجھنا چاہیئے جو آپ کو دارالعلوم کے اساتذہ سے ورثے میں ملی تھی۔

آپ بھی حضرت شیخ الہندؒ کے اُن رفقاء میں شامل تھے، جن کو حجاز میں گرفتار کیا گیا تھا، چنانچہ سوا تین سال تک آپ کو بھی مالٹا میں جنگی قیدی کی حیثیت سے رہنا پڑا ۱۳۳۸ھ ۱۹۲۰ء میں جب مالٹا سے رہائی ہوئی تو آپ حضرت شیخ الہندؒ کی معیت میں ہندوستان تشریف لائے، مالٹا سے واپسی کا زمانہ تحریکِ خلافت کے آغاز کا زمانہ تھا، آپ یہاں پہنچ کر حضرت شیخ الہندؒ کی قیادت میں ملک کی سیاست میں شریک ہو گئے، اُس زمانے میں آپ کی مجاہدانہ اور سرفروشانہ قربانیوں نے مسلمانوں کے دلوں کو آپ کی عظمت و محبت سے لبریز کر دیا تھا، حضرت شیخ الہندؒ کی وفات پر متفقہ طور سے آپ کو اُن کا جانشین تسلیم کر لیا گیا، سیاسی کاموں میں شرکت وانہماک کے باعث آپ کو متعدد مرتبہ کئی کئی سال تک جیل میں بھی رہنا پڑا، اور ملک کی آزادی کے لئے قید و بند کی ہوش رُبا صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں، عرصہ دراز تک جمعیۃ العلماء ہند کے صدر رہے۔

سنہ ۱۳۴۶ھ میں جب حضرت شاہ صاحبؒ دارالعلوم سے مستعفی ہوئے تو آپ کے سوا جماعت دارالعلوم میں کوئی ایسی شخصیت موجود نہ تھی جو دارالعلوم کی اس مہتم بالشان جگہ کو اس کے شایانِ شان پُر کر سکے اس لئے اکابر کی نظرِ انتخاب آپ ہی پر پڑی، آپ کے زمانۂ صدارت

ہیں طلبار کی تعداد میں دو گنے سے بھی زیادہ اضافہ ہوا اور خاص دورۂ حدیث کی جماعت میں تو یہ اضافہ تین گنے سے بھی متجاوز ہو گیا تھا۔

آپ کا درسِ حدیث مضامین کے تنوّع اور جامعیت کے لحاظ سے دنیائے اسلام میں اپنی نوعیت کا واحد درس سمجھا جاتا تھا، چنانچہ اس کی عظمت و شہرت اور کشش سال بسال طلبار کی تعداد میں اضافہ کا موجب ہوتی رہی۔

علم حدیث میں اُن کے تلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع ہے، اُن کے زمانۂ صدارت میں جن طلبار نے دورۂ حدیث کی تکمیل کر کے سندِ فراغت حاصل کی اُن کی تعداد ۳۸۳۴ ہے، حضرت مدنی رحمتہ اللہ علیہ کے تلامذہ کا دائرہ برِاعظم ایشیا سے گزر کر یورپ تک پھیلا ہوا ہے جس طرح دارالعلوم کو علوم نبویّہ کی تعلیم کا طغرائے امتیاز حاصل ہے اسی طرح اُنکا علمی فیضان بھی بے نظیر ہے۔

۱۲ جمادی الاولیٰ کو ۳ بجے کے قریب حضرت مدنیؒ واصل بحق ہو گئے، جنازہ دار الحدیث میں لا کر رکھا گیا، مظاہر علوم کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور ۱۲ر۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ (۵ر۶ر دسمبر ۱۹۵۷ء) کی درمیانی شب میں اس خزینۂ علم و معرفت کو قبرستانِ قاسمی میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

مولانا سیّد احمد مدنیؒ

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے برادر بزرگ مولانا سید احمد مدنی ۱۲۹۳ھ میں بمقام بانگر متو ضلع اُنّاؤ (اودھ) پیدا ہوئے، جہاں اُن کے والد سیّد حبیب اللہ صاحبؒ بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ وطن اللہ داد پور ٹانڈہ ضلع فیض آباد تھا، قرآن شریف اور فارسی کی تعلیم والد صاحبؒ سے حاصل کی پھر الہ آباد بورڈ سے اُردو میں مڈل پاس کیا، بعدازاں دارالعلوم میں داخل ہو کر درسِ نظامی کی تکمیل کر کے ۱۳۱۵ھ میں تحصیل علوم سے فارغ ہوتے۔ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ سے غیر معمولی عقیدت تھی، گنگوہ میں طویل قیام فرمانے

تھے، ۱۳۱۶ھ میں اپنے والد ماجد کے ہمراہ مدینہ منورہ چلے گئے وہاں ساری عمر علوم دینیہ کی تعلیم و تدریس میں مشغول رہے، انھوں نے ۱۳۴۰ھ میں مسجدِ نبوی کے متصل مدرسۃ الشرعیہ قائم کیا[1]، اس وقت مدینہ منورہ میں دینی تعلیم کا کوئی مدرسہ نہیں تھا، مدرسہ کے اخراجات ایک عرصے تک برصغیر کے اہلِ خیر مسلمانوں کی امداد و تعاون سے پورے ہوتے رہے ہیں، ایک مدت تک یہ مدرسہ ایک آزاد دینی مدرسہ کی طرح علمی خدمات انجام دیتا رہا ہے۔

حضرت مولانا سیّد احمدؒ کو حضرت شیخ الہندؒ سے خلافت حاصل تھی، انھوں نے ۱۱ شوال ۱۳۵۸ھ میں وفات پائی، جنّت البقیع میں مدفون ہیں۔

مولانا کریم بخش سنبھلیؒ

متوسطات تک کتابیں اپنے وطن سنبھل میں پڑھ کر امروہہ چلے گئے وہاں حضرت مولانا احمد حسنؒ سے بعض اسباق پڑھے، بعدازاں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو کر

---

[1] ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء میں سفرِ حجاز کے دوران خود راقم سطور کو مدرسۃ الشرعیہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، ایک زمانے میں حجاز کے بڑے دینی مدارس میں اس کا شمار ہوتا تھا، افسوس ہے کہ اب اس کی وہ حیثیت باقی نہیں رہی ہے، ۱۳۹۲ھ میں اس کے مختلف درجات میں ۶۰۰ کے قریب طلباء زیرِ تعلیم تھے، مدرسۃ الشرعیہ کی چار منزلہ عظیم الشان عمارت مسجدِ نبوی کے قریب بجانبِ مشرق واقع ہے، حضرت مولانا سیّد احمدؒ کے بھتیجے سید حبیب صاحب آج کل مدرسۃ الشرعیہ کے نگراں ہیں۔

غرض کہ اکابرِ دیوبند اور اسلافِ کرام کا علمی فیضان مکّہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ اور مدینہ منورہ میں مدرسۃ الشرعیہ کے ذریعے سے تشنگانِ علوم نبوّت کو سیراب کر رہا ہے، اس زمانے میں یہ ایک ایسی عظیم سعادت ہے جو پورے عالم اسلام میں صرف دیوبند کے حصّے میں آئی ہے۔

۱۳۱۶ھ میں حضرت شیخ الہندؒ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔

جیّد الاستعداد عالم تھے، مختلف مدارس میں مدرس رہے، ہاپوڑ کے زمانۂ تدریس میں حضرت مولانا سیّد فخر الدین احمدؒ نے بھی اُن سے پڑھا تھا، مدرسہ جامع العلوم کانپور میں صدر مدرس رہے، پھر مدرسہ دار العلوم مؤ اعظم گڑھ کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا مفتی عبد اللطیف اعظمی اور مولانا محمد منظور نعمانی نے حدیث کی کچھ کتابیں اُن سے پڑھی ہیں، ۱۳۶۲ھ میں وفات پائی۔

مولانا عبد المجید سنبھلی

ابتدائی تعلیم اپنے وطن سنبھل میں مولانا مفتی عبد السلام اسرائیلی سے حاصل کی، حدیث کی تعلیم کے لئے دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۱۷ھ میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ابتدائی دور میں وہاں مدرس رہے، اس زمانے میں مولانا سیّد سلیمان ندوی نے بھی اُن سے کچھ کتابیں پڑھیں، پھر سنبھل کے مدرسۃ الشرع میں صدر مدرس ہو گئے، اور آخر عمر تک اُسی سے وابستہ رہے، مولانا عبد المجید سے ہیئت اور معقولات کی کتابیں پڑھنے کے لئے طلباء بخارا جیسے دور دراز مقامات سے آتے تھے، مولانا محمد منظور نعمانی نے معقولات کی تکمیل اُن ہی سے کی ہے، سنِ وفات معلوم نہ ہو سکا۔

مولانا عبد السمیع دیوبندیؒ

۱۲۹۵ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے، چراغ محمد تاریخی نام ہے، شروع سے آخر تک دار العلوم میں تعلیم پائی اور ۱۳۱۸ھ میں تکمیل علوم سے فراغت حاصل کی۔

فتح گڈھ ضلع فرخ آباد میں کئی سال تک مدرس رہے، پھر مدرسہ اسلامیہ رُڑکی

ضلع سہارن پور اور مدرسہ عالیہ مسجد فتح پوری میں مدرس مقرر ہوئے، ۱۳۲۸ھ کے اواخر میں دارالعلوم کی ابتدائی درجات کی تعلیم کے لئے اُن کو مامور کیا گیا، انھوں نے ابتدائی درجات سے لے کر دورۂ حدیث کی موقوف علیہ کتابوں تک ۳۸ سال دارالعلوم میں درس و تدریس کی خدمات بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیں، اُن کے مشکوٰۃ المصابیح اور مختصر المعانی کے اسباق بڑی شہرت رکھتے تھے، طلباء ان کے درس اور اندازِ بیان کو بہت پسند کرتے تھے، دارالعلوم کے مایۂ ناز استاذ اور یگانۂ روزگار عالم اور طلباء پر بے حد شفیق تھے۔

اُن کا وعظ بھی بہت مؤثر اور پسندیدہ ہوتا تھا، مناظرہ کے فن میں بھی اُن کو درک تھا، تقریر کی طرح تحریر پر بھی اُن کو قدرت حاصل تھی، چنانچہ بُستان المحدثین کا روض الریاحین کے نام سے اُردو میں نہایت سلیس اور شستہ ترجمہ کیا ہے، روض الریاحین ۱۳۳۴ھ میں مطبع قاسمی دیوبند میں چھپی ہے۔

۱۱ صفر ۱۳۶۶ھ کو دیوبند میں وفات پائی، اُن کے فرزند مولانا عبدالاحد صاحب دارالعلوم میں طبقۂ علیاء کے مدرسین میں سے ہیں۔

مولانا عبدالعزیز گوجرانوالویؒ

پنجاب کے مشہور عالم اور محدث ہیں، دارالعلوم دیوبند سے ۱۳۱۸ھ میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی، علم حدیث میں نبراس الساری علیٰ اطراف البخاری اُن کی مشہور تالیف ہے، حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ اُن کے علم و فضل کے مداح تھے اور اُن کی تصنیف نبراس الساری کو بہت پسند فرماتے تھے، جامع مسجد گوجرانوالہ میں خطیب تھے، پنجاب کے علمی اور دینی حلقوں میں اپنے علم و فضل کے لحاظ سے بڑی قدر و منزلت رکھتے تھے، انتقال کی تاریخ کا پتہ نہیں چل سکا۔

مولانا محمد یحییٰ سہسرامیؒ

۱۳۱۵ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، ابتداءً سہسرام اور مظاہرعلوم سہارن پور میں کچھ مدت تک مدرس رہے، پھر ۱۳۲۶ھ میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں عربی زبان کے اُستاذ مقرر ہوئے، مشہور عالم اور ذی استعداد فاضل تھے۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ کے قیام سے اُن کا علمی فیضان بنگال میں بہت زیادہ پھیلا۔

مولانا عبدالرزاق پشاوریؒ

۱۳۱۸ھ میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے، حضرت شیخ الہندؒ کے خاص شاگردوں میں سے تھے، انغانستان میں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز رہے، افغانستان میں اُن کا خاص وقار تھا، وہاں کی پریوی کونسل کے صدر بھی تھے، شرعی احکام میں اُن کا فیصلہ آخری درجہ رکھتا تھا، اور پورے افغانستان پر اُن کے علمی اثرات چھائے ہوئے تھے۔

رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں اُن کی نسبت لکھا ہے:۔

"کابل یونیورسٹی کا سربراہ ہے جس میں وہ فلکیات پر لیکچر دیتا ہے، وہ کچھ عرصے تک سردار عنائت اللہ کا اتالیق رہا ہے، کابل میں ہندوستانی انقلابی پارٹی کا پشت پناہ ہے، سرحد پار جتنی بھی برطانوی حکومت کے خلاف کارروائیاں ہوتی ہیں اُن سب کی ڈور اسی کے ہاتھ میں ہے[1]"

---

[1] تحریک شیخ الہند، مرتبہ مولانا محمد میاں صاحب ص ۳۰۹۔

مولانا محمد سہولؒ بھاگلپوری

پورینی ضلع بھاگلپور (بہار) وطن تھا، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، بھاگلپور میں مولانا اشرف عالمؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے، وہاں سے کان پور پہنچے اور مدرسہ جامع العلوم میں حضرت تھانویؒ اور مولانا محمد اسحاق صاحب بردوانی سے تعلیم حاصل کی اور مدرسہ فیضِ عام میں رہ کر مولانا محمد فاروق چریاکوٹی سے تحصیل علم کی، کانپور سے طلبِ علم کا شوق انہیں حیدر آباد لے گیا، حیدر آباد کا سفر پیدل دو ماہ میں پورا کیا، حیدر آباد کے دورانِ قیام میں مفتی لطف اللہ علی گڑھی اور مولانا عبدالوہاب بہاری سے منطق، فلسفہ، ہیئت، ادب اور اصولِ فقہ کی تحصیل کی، حیدر آباد سے دہلی پہنچکر مولانا نذیر حسین صاحب کے درس میں شریک ہوئے آخر میں دارالعلوم میں داخلہ لیا اور حضرت شیخ الہندؒ سے حدیث کی تکمیل کی، بعد فراغت دارالعلوم میں سات آٹھ سال تک مدرس رہے، مدرسہ عزیزیہ بہار شریف، مدرسہ عالیہ کلکتہ، مدرسہ عالیہ سلہٹ میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث رہے، ۱۹۲۰ء میں پٹنہ کے مدرسہ عالیہ شمس الہدیٰ میں پرنسپل مقرر ہوئے غرض کہ ۴۶ برس تک یو،پی، بہار بنگال اور آسام کے بڑے بڑے مدارس میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، ۱۳۵۰ھ سے ۱۳۶۲ھ تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے، ۱۲ رجب ۱۳۶۷ھ ۱۹۴۸ء کو وصال ہوا، مزار پورینی میں ہے۔

دراز قد اور وجیہہ تھے، جب دیوبند آتے اور اپنے استاد شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضری دیتے تو حضرتؒ اٹھکر معانقہ فرماتے چونکہ حضرت پستہ قد تھے اس لئے مزاحاً فرماتے کہ "بھائی مولوی سہول آگئے، معانقہ کے لئے سیڑھی لگانی پڑے گی" بے حد رقیق القلب تھے، اسلافِ کرام، صحابۂ عظام کا ذکر آتا تو اُن کی آنکھیں اشکبار ہوجاتیں اور بات کرنا مشکل ہوجاتا تھا

مولانا میاں اصغر حسین دیوبندیؒ

۱۲۹۴ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے، دیوبند میں ان کا خاندان تقدس و بزرگی میں مسلّم اور ممتاز رہا ہے، والد بزرگوار شاہ محمد حسن (وفات ۱۳۱۲ھ) سے قرآن شریف اور فارسی میں گلستاں تک پڑھکر دارالعلوم میں داخل ہوئے، اور ۱۳۱۰ھ میں فارسی کی تکمیل کے بعد عربی شروع کی اور ۱۳۲۰ھ تک دارالعلوم میں اُن کا تعلیمی مشغلہ جاری رہا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۳۲۱ھ کے اواخر میں حضرت شیخ الہندؒ نے جون پور کی اٹالہ مسجد کے مدرسہ کی صدر مدرسی کے لئے اُن کا انتخاب کیا، جہاں سات سال تک تشنگانِ علوم دینیہ اور مسلمانانِ جون پور کو اپنے علوم ظاہری و باطنی سے سرفراز فرماتے رہے، ۱۳۲۸ھ میں جب اربابِ دارالعلوم نے دیوبند سے ایک ماہنامہ رسالہ "القاسم" جاری کرنے کا فیصلہ کیا تو آپ کو جون پور سے بلاکر "القاسم" کے کام پر مامور کیا گیا، اسی کے ساتھ مختلف کتابوں کے اسباق بھی اُن کے سپرد کئے گئے، ان کے درس میں عموماً تفسیر و حدیث کی کتابیں رہتی تھیں، ۱۳۳۳ھ کی روداد میں اُن کی نسبت لکھا ہے:۔

"مولوی صاحب کو علوم دینیہ حدیث، تفسیر، فقہ، فرائض وغیرہ میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت واستعداد حاصل ہے، آپ صاحبِ تصانیف بھی ہیں، فرائض میں ایک مستقل کتاب ملک میں شائع و مقبول ہوچکی ہے، دارالعلوم کی جانب سے آپ کو دورۂ حدیث کی ایک جماعت اور تفسیر و فقہ کی کتاب مثل جلالین درِّ مختار وغیرہ ملتی رہتی ہیں، آپ ایک صاحبِ ورع و تقویٰ عالم باعمل اور سَلف کا نمونہ اور اُن کے صحیح خَلف ہیں"

علم و عمل کی اس جامعیت کے ساتھ حضرت میاں صاحبؒ کو تعویذات کے فن میں مہارت تامّہ حاصل تھی مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی اُن کے تعویذات سے فیض حاصل کرتے تھے، اس سلسلے میں اُن کی خدمتِ خلق کا دائرہ بہت وسیع تھا، علم و فضل

زُہد و تقویٰ، نیکی اور پرہیزگاری نے اُن کی ذات کو مرجع خلائق بنا دیا تھا۔

حضرت میاں صاحبؒ کو اپنے بزرگ ماموں حضرت میاں جی منّے شاہ صاحبؒ، اور شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ، مہاجر مکیؒ سے اجازت و خلافت حاصل تھی، غرض کہ اپنے زمانے کے بڑے بافیض بزرگ تھے۔

حضرت میاں صاحبؒ نے دیوبند میں دار المسافرین کے نام سے ایک مُسافر خانہ کی تعمیر کرائی اور اپنے خاندانی مکتب کو جو ان کے والد ماجد کی وفات کے بعد بند ہوگیا تھا دوبارہ جاری کیا، اُردو زبان میں فقہ و فرائض اور تاریخ وغیرہ کے موضوعات پر چھوٹی بڑی تقریباً ۳۵ کتابیں اُن کی تصنیف و تالیف ہیں۔

۱۳۶۳ھ کے اواخر میں اپنے متوسلین کی دعوت پر گجرات تشریف لے گئے، راندیر میں قیام تھا کہ اچانک حرکتِ قلب بند ہوگئی اور ۲۲ محرم الحرام ۱۳۶۴ھ بروز دوشنبہ داعیٔ اجل کو لبیک کہا، وہیں دفن ہوئے۔

مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نواسے اور مولانا عبداللہ انصاری کے فرزندِ اکبر تھے، انبیٹھہ وطن تھا، ابتدائی تعلیم گلاؤٹھی کے مدرسہ منبع العلوم میں پائی جہاں اُن کے والد ماجد صدر مدرس تھے، ۱۳۲۱ھ میں دار العلوم سے فراغت کے بعد مختلف مقامات میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں، دار العلوم معینیہ اجمیر میں کچھ مدت صدر مدرس رہے، حضرت شیخ الہند نے اپنے ترجمۂ قرآن کے کام میں اعانت کے لئے اُن کو دیوبند بلا لیا تھا، ۱۳۲۶ھ میں جب دار العلوم میں جمعیۃ الانصار قائم ہوئی تھی تو مولانا سندھیؒ کے ساتھ اُس کے نائب ناظم مقرر ہوئے، نہایت صائب الرائے اور ذی استعداد عالم تھے، حضرت شیخ الہندؒ کے آخری سفرِ حج میں جو ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء میں ہوا تھا اُن کے ساتھ رہے، مدینہ منورہ کے گورنر غالب پاشا

ے حضرت شیخ الہندؒ نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں حصہ لینے کے واسطے جو رغیبی خط ہندوستان اور آزاد قبائل کے عوام کے لئے لکھوایا تھا اور جو ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں غالب نامے کے نام سے مشہور ہے اُس کو حجاز سے ہندوستان اور آزاد قبائل تک پہنچانے کا نہایت اہم کام اُنہی کے سپرد ہوا تھا، جسے اُنھوں نے کمال ہوشیاری کے ساتھ انجام دیا، اور ہندوستان کی خفیہ پولیس کی نظروں سے بچ کر یاغستان کے آزاد علاقے میں پہنچ گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی حجاز میں گرفتاری کے وقت چونکہ مولانا منصور انصاریؒ وہاں سے یاغستان روانہ ہو چکے تھے اس لئے وہ گرفتاری سے بچ گئے، اُن کا اصل نام محمد میاں تھا، جب غالب نامہ لے کر ہندوستان آئے تو برطانوی پولیس سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے منصور انصاری نام رکھ لیا تھا، پھر آپ آئندہ اِسی نام سے مشہور ہوئے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں "ریشمی خطوط" کے نام سے جو خطوط مشہور ہیں اُن میں مولانا منصور انصاری کا خط بھی شامل تھا، جو زرد ریشمی کپڑے پر لکھا گیا تھا جنودِ ربانیہ میں اُن کا عہدہ لفٹیننٹ جنرل کا تھا۔

حجاز میں حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کے بعد افغانستان چلے گئے اور وہیں مستقل طور پر مقیم ہو گئے تھے، حکومتِ افغانستان پر اُن کے علم و فضل اور سیاست و تدبر کا بڑا اثر تھا، چناں چہ حکومتِ افغانستان نے اپنا جو سفارتی مشن ترکی بھیجا تھا اس میں مولانا منصور انصاریؒ کو وزیرِ مختار کا عہدہ تفویض کیا گیا تھا، اسی طرح ماسکو کے سیاسی مشن میں اُن کو سیاسی مشیر بنا کر بھیجا گیا تھا، بچہ سقہ نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد انکو افغانستان سے جلاوطن کر دیا تھا، اس کے دورِ حکومت میں چند ماہ کے لئے روس چلے گئے، اور جب نادر خاں بچہ سقہ کو شکست دے کر افغانستان کے حکمراں بنے تو مولانا منصور انصاریؒ کو واپس بلا لیا گیا۔

قیامِ افغانستان کے زمانے میں آپ نے متعدد سیاسی کتابیں تصنیف فرمائیں

حکومتِ الٰہی، اساسِ انقلاب، دستورِ امامت اور النواع الدّول اُن کی اعلیٰ ذہنی اور فکری صلاحیتوں کی آئینہ دار ہیں۔ افغانستان میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، آخر عمر میں افغانستان کے مشہور مقام جلال آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی، وہیں ۶ صفر ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۱ جنوری ۱۹۴۶ء کو وفات پائی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی بڑی خواہش تھی کہ ہندوستان کے آزاد ہوتے ہی وہ مولانا منصور انصاری کو ہندوستان واپس بلالیں گے، مگر افسوس کہ ہندوستان کی آزادی سے ایک سال قبل وہ سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے، اور جس ملک کی آزادی کے لئے انھوں نے اسم سال جلاوطنی کی زندگی گزاری اس کی آزادی کو نہ دیکھ سکے۔

مولانا حامد الانصاری غازی سابق ایڈیٹر اخبار "مدینہ بجنور" جو ہندوستان کی صحافت میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں، وہ انہی مولانا منصور انصاری کے بڑے صاحبزادے ہیں، ان کے دوسرے فرزند حمید انصاری جلال آباد میں مقیم ہیں۔

مولانا اعزاز علی صاحب امروہی ؒ

دارالعلوم دیوبند کے نہایت ممتاز فضلاء میں سے تھے، ۱۳۲۱ھ میں دارالعلوم سے فراغت کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کو مدرسہ نعمانیہ پورینی ضلع بھاگلپور (بہار) کے لئے منتخب فرمایا، چنانچہ آپ تقریباً سات سال اس علاقے میں درس دیتے رہے، پھر آپ شاہجہاں پور تشریف لائے اور ایک مسجد میں افضل المدارس کے نام سے مدرسہ قائم کیا، جس میں حسبۃً للہ پڑھاتے رہے، یہاں تقریباً تین سال آپ نے نہایت کامیابی کے ساتھ درس دیا، ۱۳۳۰ھ میں آپ کا تقرر دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس ہوا، اور پہلے سال میں آپ کو عربی کی ابتدائی کتابیں علم الصیغہ اور نورالایضاح وغیرہ پڑھانے کے لئے دی گئیں، اُس وقت کی روداد میں حضرت شیخ الادب کی نسبت لکھا ہے:۔

"مولوی اعزاز علی صاحب طبقۂ وسطیٰ و اُخریٰ کے درمیانی فارغ التحصیل حضرات میں سے ہیں، چند جگہ مدرس رہے، آخر میں مدرسہ پورینی ضلع بھاگلپور میں مدرس تھے، وہاں سے دیوبند بلائے گئے، آپ ایک نوجوان، بااستعداد اور صاحب صلاح وتقویٰ عالم ہیں، صورتاً وسیرتاً اپنے سلف کی یادگار ہیں، علوم میں استعداد تام رکھتے ہیں خصوصاً علم ادب میں خاص مہارت ہے، ابھی آپ نے حماسہ کا تحشیہ کیا ہے، اور کنز الدقائق کا تحشیہ کر رہے ہیں، اس سے قبل دیوان متنبّی کا تحشیہ کر چکے ہیں، آپ دارالعلوم کے درجۂ وسطیٰ میں درس دیتے ہیں، علم ادب کے اکثر اسباق آپ کے پاس رہتے ہیں، طلباء کو عربی تحریر کی مشق بھی کراتے ہیں، خوش تقریر ہیں طلباء آپ سے نہایت مانوس ہیں۔"

سنہ ۱۳۴۷ھ میں جب حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کا ریاست حیدر آباد کے مفتیٔ اعظم کے عہدے پر انتخاب عمل میں آیا تو اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ کو اپنی معیت میں لے گئے، وہاں ایک سال قیام رہا، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے ساتھ ہی آپ دیوبند واپس تشریف لائے آپ کو مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ کے بعد صدر مفتی دارالعلوم کے عہدے پر فائز کیا گیا، اس کے بعد سے آخر عمر تک دارالعلوم دیوبند ہی میں آپ کا قیام رہا۔

فقہ وادب آپ کا خاص فن تھا، آپ جب ابتداً دارالعلوم دیوبند میں تشریف لائے تو عربی کی ابتدائی کتابیں علم الصیغہ اور نور الایضاح وغیرہ آپ کو دی گئیں، مگر آپ کے درس نے بالآخر وہ مقبولیت حاصل کی کہ "شیخ الادب والفقہ" کے لقب سے مشہور ہوئے، عمر کے آخری دور میں کئی سال ترمذی جلد ثانی اور تفسیر کی بلند پایہ کتابیں بھی پڑھائیں، حضرت مولانا مدنیؒ کی عدم موجودگی میں متعدد مرتبہ بخاری شریف کے پڑھانے کا بھی اُن کو موقع ملا غرض کہ علم فقہ، علم حدیث، علم ادب، علم تفسیر وغیرہ ہر فن کی کتابوں پر اُن کو عبور حاصل تھا، تعلیم کے ساتھ طلباء کی تربیت اور نگرانی کا اُن میں خاص ذوق تھا، جس سے طلباء کو بے انتہا

فائدہ پہنچا، اور آج تک آپ کے شاگرد آپ کو یاد کرتے ہیں، آپ کی پابندیٔ اوقات ضرب المثل تھی، اور اوقاتِ درس کی پابندی میں آپ خود ہی اپنی نظیر تھے، حتیٰ کہ بعض اساتذہ دارالعلوم نے درس میں اوقات کی پابندی کا سبق حضرت شیخ الادب ہی سے حاصل کیا۔

بے نفسی اور تواضع میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، بڑی سے بڑی کتابوں کے درس کے ساتھ چھوٹی سے چھوٹی کتاب پڑھانے میں کبھی آپ کو عار نہ ہوتا تھا، ترمذی و بخاری کا درس بھی دے رہے ہیں اور بچّوں کو میزان الصرف، علم الصیغہ اور نور الایضاح وغیرہ بھی پڑھا رہے ہیں، آپ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب طالب علم وہ ہوتا تھا جو یکسوئی کے ساتھ پڑھنے لکھنے میں لگا رہے، اور سب سے زیادہ مبغوض وہ ہوتا تھا جو غیر تعلیمی مشاغل میں لگ کر پڑھنے میں تساہل کرے۔

حضرت شیخ الادبؒ کو جس طرح عربی نظم و نثر پر قدرت حاصل تھی، اسی طرح وہ اُردو نظم و نثر میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے، اردو نثر میں ان کا ایک خاص انداز تھا، اُنھوں نے عربی ادب میں نفحۃ الیمن کے معیار کے مطابق نفحۃ العرب کے نام سے ایک کتاب مرتب فرمائی تھی، جس میں تاریخی حکایات وقصص اور اخلاقی مضامین درج کیے گئے ہیں، یہ کتاب عربی مدارس میں بہت مقبول ہوئی، چنانچہ دارالعلوم اور دوسرے بہت سے مدارس کے نصاب میں داخل کی گئی، اس کے علاوہ اُنھوں نے فقہ میں نور الایضاح، شرح نقایہ، کنز الدقائق اور ادبِ عربی میں دیوان حماسہ اور دیوان متنبّی پر مفید حواشی تحریر فرمائے ہیں، جو اساتذہ اور طلباء میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، حضرت مولانا حبیب الرحمٰنؒ کے عربی قصیدہ لامیۃ المعجزات کے اشعار کی اُردو میں سلیس شرح فرمائی ہے۔

انتظامی امور میں بھی آپ کی اہلیت مسلّم تھی اور وقتاً فوقتاً ادارۂ اہتمام میں بھی آپ کی انتظامی صلاحیتوں سے استفادہ کیا جاتا تھا، غرض آپ ایک بے نظیر استاذ اور متبحر عالم دین اور ایک جامع شخصیت تھے، دارالعلوم میں آپ کی علمی خدمات کا دَور چوالیس

برس تک مسند رہا، ۱۳۷۴ھ میں اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی۔

مولانا احمد بزرگ سورتیؒ

گجرات کے مقام سملک میں پیدا ہوئے، سن ولادت ۱۲۹۸ھ یا ۱۲۹۹ھ ہے، احمد نام تھا، بچپن ہی میں بزرگ لقب پڑ گیا تھا، وطن میں قرآن شریف ختم کر کے اولاً اُردو پڑھی، پھر فارسی اور عربی کی تعلیم لاج پور کے مدرسہ میں چار سال رہ کر حاصل کی، مشکوٰۃ المصابیح اور ہدایہ اوّلین وغیرہ کتابیں پڑھنے کے بعد ۱۳۱۸ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور ۱۳۲۱ھ میں سندِ فراغ حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت کا شرف حاصل کیا، اور تقریباً ایک سال تک مرشد کی خدمت میں رہ کر ذکر و شغل اور ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رہے، مرشد کی وفات (ف ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) کے بعد وطن مراجعت کی، اور کچھ مدت کے بعد جنوبی افریقہ چلے گئے، ۱۳۳۵ھ میں جامع مسجد سورتی رنگون میں مفتی مقرر ہوئے اور تین سال تک وہاں افتاء کے ساتھ وعظ اور درس قرآن کا فیض پہنچایا، رنگون سے واپسی کے بعد ۱۳۳۹ھ میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیلؔ کے مہتمم بنائے گئے، ۱۳۴۶ھ میں حضرت علامہ

لہ مولانا احمد حسن سملکیؒ نے ۱۳۲۶ھ میں یہ مدرسہ تعلیم الدین کے نام سے جاری کیا تھا، شروع میں مولانا موصوف کے علاوہ قرآن شریف کا صرف ایک مدرس تھا، رفتہ رفتہ مدرسہ ترقی کرتا رہا، مدرسہ کا آغاز مسجد سے ہوا تھا، مگر جلد ہی اس کی ایک عظیم الشان عمارت تیار ہو گئی، وسیع و عریض مسجد اور درسگاہوں کے علاوہ کتب خانہ، دارالطلباء، دارالاساتذہ وغیرہ عمارتیں عالم وجود میں آگئیں، ۱۳۳۹ھ میں مولانا احمد بزرگ اس کے مہتمم مقرر ہوئے۔ ان کی سعی و کوشش سے ۱۳۴۶ھ میں حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحبؒ اور دوسرے حضرات کے دارالعلوم دیوبند سے تشریف (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

محمد انور شاہ کشمیری اور دوسرے حضرات کو ڈابھیل لے جانے کا کارنامہ انھوں نے ہی انجام دیا تھا۔

مولانا احمد بزرگ اگرچہ سیدھے سادے بزرگ تھے، مگر ان میں انتظامی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں، ڈابھیل کے معمولی مدرسہ تعلیم الدین کو جامعہ اسلامیہ میں تبدیل کر دینا اُن کا عظیم علمی کارنامہ ہے، اُن کے دورِ اہتمام میں برِّ صغیر کے مختلف مقامات کے علاوہ افغانستان، بخارا اور یمن و حجاز تک کے طلباء جامعۂ ڈابھیل میں جمع ہو گئے تھے۔

بڑی عمر میں قرآن شریف بھی حفظ کر لیا تھا، ۱۳۶۸ھ و ۱۳۶۹ھ میں پے در پے دو حج کئے۔

۵ ربیع الاوّل ۱۳۷۱ھ کو ۷۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

مولانا محمد سعید بزرگ آپ ہی کے صاحبزادے اور قائم مقام ہیں، مدرسہ ڈابھیل کے مہتمم ہیں اور دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن۔

مولانا رسول خاں ہزارویؒ

۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء میں اچھڑیاں ضلع ہزارہ (پاکستان) کے صواتی پٹھان خاندان میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے وطن ضلع ہزارہ کے مدارس میں حاصل کی، ۱۳۲۰ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، منطق و فلسفہ میں حضرت مولانا غلام رسول خاں ہزاروی سے خاص طور سے استفادہ کیا، ۱۳۲۳ھ میں دارالعلوم دیوبند سے سندِ فراغت حاصل کی۔

دارالعلوم سے فراغت کے فوراً بعد مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ میں صدر مدرس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) لے جانے کے بعد مدرسے نے جامعۂ اسلامیہ کی شکل اختیار کر لی، سرزمینِ گجرات میں دینی علوم کا یہ سب سے بڑا مدرسہ ہے۔ سیّد محبوب رضوی

مقرر ہو گئے، ۱۳۳۳ھ میں انھیں دارالعلوم میں مدرس بنایا گیا، یہاں ۱۳۵۳ھ تک منطق وفلسفہ کے علاوہ دوسرے علوم اور حدیث کا درس بھی دیتے تھے، ۱۳۵۳ھ میں لاہور چلے گئے وہاں اورنٹیل کالج لاہور میں شعبۂ عربی کے استاذ مقرر ہوئے، ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۴ء تک اورنٹیل کالج لاہور میں تعلیم دیتے رہے، اورنٹیل کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد جامعہ اشرفیہ لاہور کے صدر مدرس مقرر ہوئے، اور تا دمِ آخر جامعہ اشرفیہ سے وابستہ رہے۔

حضرت مولانا رسول خاں صاحب معقولات کے ساتھ منقولات میں بھی دست گاہ کامل رکھتے تھے، علومِ نقلیہ وعقلیہ کو طالب علم کی استعداد کے مطابق اس طرح سمجھاتے تھے کہ مسئلہ شاگرد کے ذہن نشین ہوجاتا تھا، ان کا درس تفہیم کے لحاظ سے ممتاز سمجھا جاتا تھا، درسی تقریر جامع اور پُر مغز ہوتی تھی، وجیہہ اور پُر وقار تھے، تقریر کے وقت چہرے پر وقار برستا تھا، طرزِ بیان صاف اور مؤثر ہوتا تھا، ہر علم وفن کی کتابیں انھیں گویا ازبر تھیں طلبا ذوق وشوق سے اُن کے درس میں شریک ہوتے تھے، دارالعلوم دیوبند کے ممتاز اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا، ان کی عمر کے تقریباً ۷۰ سال درس وتدریس میں گزرے۔

آخر میں تصوّف کا غلبہ ہوگیا تھا، حضرت تھانویؒ سے بیعت وخلافت حاصل تھی۔

۳ رمضان ۱۳۹۱ھ کو ۱۰۳ سال کی عمر میں اپنے وطن اچھڑیاں میں وفات پائی، اور وہیں آسودۂ خواب ہیں۔

علّامہ شبّیر احمد عثمانیؒ

حضرت مولانا فضل الرحمٰن کے فرزندِ رشید تھے، ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۷ء میں بمقام بجنور پیدا ہوئے، ۷ سال کی عمر میں درجۂ قرآن مجید میں داخل ہوئے، دارالعلوم کے اساتذہ سے ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء میں علوم کی تکمیل کی، حضرت شیخ الہندؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے اور اُنھیں سے بیعت تھے، فراغت کے بعد دہلی کے مدرسہ فتح پوری میں صدر مدرس مقرر ہوئے وہاں سے ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء میں

اُن کو دارالعلوم میں بلایا گیا، یہاں عرصے تک درجۂ علیا کی مختلف کتابیں پڑھائیں، مولانا عثمانیؒ کے درس صحیح مُسلم کو بڑی شہرت حاصل تھی، حضرت نانوتویؒ کے علوم پر اُن کی خاص نظر تھی، ایک عرصے تک دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۸ء میں دارالعلوم سے بعض اختلافات کے سبب سے حضرت مولانا محمد انور شاہؒ اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن وغیرہ حضرات کے ساتھ جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) تشریف لے گئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۴ء میں جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث مقرر ہوئے، ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء میں حضرت تھانویؒ اور بعض دوسرے اکابر کے ارشاد پر دارالعلوم میں تشریف لائے اور ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۴ء تک بحیثیت صدر مہتمم دارالعلوم کی خدمات انجام دیتے رہے اس دوران میں جامعۂ ڈابھیل سے بھی تعلق قائم رہا۔

علم وفضل، فہم وفراست، تدبّر اور اصابتِ رائے کے لحاظ سے علّامہ عثمانیؒ کا شمار ہندوستان کے چند مخصوص علماء میں ہوتا تھا، وہ زبان وقلم دونوں کے یکساں شہسوار تھے، اُردو کے بلند پایہ ادیب اور بڑی سحر انگیز خطابت کے مالک تھے، فصاحت و بلاغت، عام فہم دلائل پُر اثر تشبیہات وانداز بیان اور نکتہ آفرینی کے لحاظ سے اُنکی تحریر وتقریر دونوں منفرد تھیں، حالاتِ حاضرہ پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے، اس لئے اُن کی تحریر اور تقریر عوام وخواص دونوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، عظیم الشان جلسوں میں اُن کی فصیح وبلیغ عالمانہ تقریروں کی یاد آج بھی اہلِ ذوق کے دلوں میں موجود ہے، حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی حیات کے آخری دنوں میں جامعہ ملّیہ کی تاسیس کے وقت جو خطبہ دیا تھا اس کے لکھنے اور جلسے میں پڑھنے کا شرف مولانا عثمانیؒ ہی کو حاصل ہوا تھا۔

علم الکلام، العقل والنقل، اعجاز القرآن، حجاب شرعی اور الشہاب لرجم الخاطف المرتاب وغیرہ اُن کی معرکۃ الآراء تصانیف ہیں، حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن مجید پر مولانا عثمانیؒ کے تفسیری حواشی کو بڑی شہرت حاصل ہے، ان حواشی میں سلف کے نقطۂ نظر

کے دائرے میں محدود رہ کر قرآن کریم کے اسرار و معارف کو اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ ذہن و فکر کے سب کانئے نکلتے چلے جاتے ہیں اور قلب کو انشراح و اطمینان کی عجیب کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ حکومت افغانستان نے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کرایا ہے جسے بطور ہدیہ دارالعلوم میں بھی بھیجا ہے۔ علم حدیث میں ان کی گراں قدر عربی تصنیف فتح الملہم حنفی نقطۂ نظر سے صحیح مسلم کی پہلی شرح ہے، اُن کا یہ ایک ایسا زندہ جاوید کارنامہ ہے جس نے ان کے علم و فضل کو تمام عالم اسلام میں روشناس کرا دیا ہے، علامہ زاہد الکوثری نیز مصر و شام کے دیگر علماء نے اُن کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔

علامہ عثمانی خلافت کمیٹی کے ایک اہم رکن رہے ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۴ء میں جنگِ بلقان کے زمانے میں انھوں نے ترکوں کے لئے چندہ جمع کرنے میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا تھا، مولانا عثمانیؒ سالہا سال تک جمعیۃ العلماء ہند کی مجلس عاملہ کے رکن رہے، جمعیۃ العلماء ہند کے صفِ اوّل کے رہنماؤں میں اُن کا شمار ہوتا تھا، آخر میں اُن کو متحدہ قومیت اور کانگریس کے ساتھ جمعیۃ کے تعاون کے مسئلے پر جمعیۃ العلماء ہند سے اختلاف پیش آیا، اور وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے، اور ۱۳۶۵ھ ۱۹۴۶ء میں جمعیۃ العلماء اسلام کے صدر منتخب کئے گئے، تقسیم ہند سے قبل رمضان ۱۳۶۶ھ ۱۹۴۷ء میں مولانا عثمانیؒ پاکستان تشریف لے گئے اور آخر وہیں مقیم ہو گئے، پاکستان دستور ساز اسمبلی کے رکن اور دستور ساز کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے، پاکستان میں اُنھوں نے بہت سی دینی اور ملی خدمات انجام دیں، پاکستان کے اقتدارِ اعلیٰ پر اُن کی علمی اور سیاسی خدمات کا خاص اثر تھا، خصوصاً اُن کو عالمانہ اور مفکرانہ حیثیت سے خاص عظمت حاصل تھی، اور ان کی دینی رہنمائی کے ساتھ ساتھ سیاسی رہنمائی بھی مسلّم سمجھی جاتی تھی۔

پاکستان کی سیاسیات میں انھیں جو اثر و رسوخ حاصل تھا اُس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان دستور ساز اسمبلی میں مرحوم نوابزادہ لیاقت علی خاں کی پیش کردہ قرارداد مقاصد جس میں یہ یقین دہانی کی گئی تھی کہ پاکستان کے دستور کی بنیاد کتاب و سنت پر مبنی

ہو گئی در حقیقت حضرت علامہ عثمانی کی بر وقت توجہ فرمائی اور جد و جہد کا نتیجہ تھی۔

پاکستان میں جامعۂ عباسیہ بھاول پور ایک قدیم دینی تعلیم گاہ ہے، اُس کا انتظامی اور تعلیمی نظام بہت خراب ہو گیا تھا، ریاست بھاول پور کی وزارتِ تعلیم نے مولانا عثمانیؒ سے درخواست کی کہ وہ بھاول پور تشریف لا کر جامعۂ عباسیہ کی اصلاح و ترقی کے لئے اپنے مشورے سے ریاست کو نوازیں، چنانچہ آپ بھاول پور تشریف لے گئے، وزارتِ تعلیم سے ابھی گفتگو شروع ہی ہوئی تھی کہ اچانک ۲۱ صفر ۱۳۶۹ھ (۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء) کو چند گھنٹے کی مختصر علالت کے بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہا، جنازہ بھاول پور سے کراچی لے جایا گیا، اور قیام گاہ واقع محمد علی روڈ کے قریب آپ کو سپردِ خاک کیا گیا۔

۱۳۳۳ھ کی روداد میں مولانا عثمانی کے بارے میں لکھا ہوا ہے:۔

مولوی شبیر احمد صاحب ماشاء اللہ اُن نوجوان اہلِ علم میں سے ہیں جن کو علوم اکابر کا حامل قرار دیا جائے تمام علوم معقول و منقول میں کامل استعداد رکھتے ہیں، تقریر و تحریر میں بے مثل ہیں، خصوصاً علم حدیث میں ایسا ملکہ ہے جو معمر اور تجربہ کار مشائخ حدیث کو ہوتا ہے ہمیں خدا تعالےٰ کی ذات سے اُمید ہے کہ یہ نوجوان اپنے علم و صلاحیت اور ہر قسم کی قابلیت سے دارالعلوم کے شاندار امتیازات میں ہونے کے ساتھ اپنے سلف کے سچے خلف ثابت ہوں گے مولوی صاحب اُس زمانے میں بھی جب کہ خود تحصیل علم میں مشغول تھے، طلباء کو درس دینے میں اپنا بہت سا وقت صرف کرتے تھے منتہی طلباء تمام علوم کی کتابیں آپ سے بے تامل پڑھتے تھے، ۱۳۲۶ھ میں مدرسہ فتح پوری دہلی کے مدرس اول مقرر ہو کر گئے، ممبرانِ مدرسہ کو یہ امر پسند نہ تھا کہ ایسے لائق شخص کو دارالعلوم سے جدا رکھا جائے، اس لئے ۱۳۲۸ھ میں دیوبند بلا لئے گئے، دارالعلوم کی خدمتِ درس اور ہر قسم کی خدمات کو نہایت خوبی سے انجام دیتے ہیں، مولوی صاحب کے بیانات اور تقریروں کا ملک میں عام اثر ہے۔"

علامہ عثمانیؒ سے اس وقت کے اکابر نے جو توقعات قائم کی تھیں، اُن توقعات کی اُنکے

مذکورہ بالا حالات سے پوری پوری تائید ہوتی ہے۔

مولانا مظہر الدّین شیر کوٹیؒ

شیرکوٹ ضلع بجنور وطن تھا، ۱۳۲۶ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی، کچھ دنوں تک دارالعلوم میں مدرس رہے، پھر اخبار "مدینہ" بجنور کے ایڈیٹر رہے، بعدازاں دہلی سے پہلے سہ روزہ "الاماں" اور پھر روزنامہ "وحدت" جاری کیا، ملک کے مشہور مقرر اور صحافی تھے انھوں نے کئی تاریخی ناول بھی لکھے ہیں، جو اس زمانے میں بڑے مقبول تھے۔

تحریکِ خلافت کے زمانے میں سرگرمی سے حصّہ لیا، مسلم لیگ کے زبردست حامیوں میں سے تھے "الاماں" اپنے دور میں ایک مقبول اخبار سمجھا جاتا تھا۔

۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء میں دفتر "الاماں" میں ان پر قاتلانہ حملہ ہوا، اور اسی میں جاں بحق ہوگئے۔

رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں ان کی نسبت لکھا ہے "کہ اُس نے کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے تحت دارالارشاد میں بحیثیت استاد اور "البلاغ" میں بحیثیت ایڈیٹر ملازمت قبول کر لی، وہ مولانا محمود حسن کا مرید ہے اور دیوبند کے خفیہ اجلاسوں میں شامل ہوا کرتا تھا"[1]

مولانا فضل ربّی پشاوری

ضلع پشاور کے رہنے والے تھے، ۱۳۲۷ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کرکے اپنے وطن میں درس و تدریس میں مشغول ہوگئے۔ پہلی جنگِ عظیم کے شروع میں حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے ہجرت کرکے یاغستان چلے گئے، اور وہاں کے لوگوں کو برطانوی حکومت کے خلاف جنگِ آزادی کے لئے تیار کرتے رہے، جب حاجی ترنگ زئی نے انگریزوں کے

---

[1] تحریک شیخ الہندؒ ص ۲۴۴۔

خلاف علم جہاد بلند کیا تو یہ بھی اُن کے ساتھ جنگ میں شریک رہے، تحریک ختم ہو جانے کے بعد افغانستان چلے گئے، وہاں اپنی علمی استعداد کی بنا پر حکومتِ افغانستان کے محکمۂ تعلیمات میں ملازم ہو گئے، اور مختلف اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے، مولانا موصوف جمعیۃ علمائے افغانستان کے ایک ممتاز رکن تھے، اُن کی عمر کا بیشتر حصّہ علمی اور سیاسی خدمات میں گزرا۔

تحریک شیخ الہندؒ میں لکھا ہے کہ مولانا محمود حسن نے اسے مولوی سیف الرحمٰن کے ہمراہ جہاد کی تبلیغ کے لئے آزاد علاقے میں بھیجا تھا، ۱۹۱۵ء کی بہت سی لڑائیوں کے لئے ذمہ دار ہے، جنودِ ربّانیہ کی فہرست میں وہ کرنل ہے[1]۔

علّامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ

تاریخی نام غلام کبریا ہے، ۱۳۰۴ھ میں مشرقی یوپی کے شہر بلیا کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے، اُن کا خاندان پنجاب کے ضلع جھنگ سے جون پور آیا اور پھر کچھ مدّت کے بعد بلیا میں آباد ہو گیا۔ جون پور میں فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم مشہور طبیب مولانا حکیم جمیل الدین نگینوی سے حاصل کی، اور معقولات کی کتابیں مولانا فاروق احمد چریا کوٹی اور مولانا ہدایت اللہ خاں (تلمیذ مولانا فضل حق خیر آبادی) سے پڑھیں، دینیات کی تعلیم کے لئے مولانا عبد الغفار کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، ۱۳۲۵ھ کے اواخر میں دار العلوم دیوبند میں داخل ہو کر اوّلاً ہدایہ اور جلالین وغیرہ کتابیں پڑھیں، اور ۱۳۲۷ھ میں دار العلوم سے فارغ التحصیل ہوئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد اسی سال میں مدرسہ عالیہ فتح پوری کے مدرس دوم بنائے

---

[1] تحریک شیخ الہند ص ۳۶ و ۳۷

گئے، پھر عمری ضلع مرادآباد کے مدرسہ میں کچھ عرصے تک درس و تدریس میں مشغول رہے، ۱۳۳۱ھ میں آپ کو دارالعلوم میں بلایا گیا ۱۳۴۰ھ سے ۱۳۴۴ھ تک مدرسہ دارالعلوم مئو ضلع اعظم گڈھ اور مدرسہ امدادیہ دربھنگہ (بہار) میں صدارتِ تدریس کی خدمات انجام دیں، ۱۳۴۴ھ میں آپ کو پھر دارالعلوم دیوبند میں بلایا گیا ۱۳۳۳ھ کی روداد میں آپ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"مولوی محمد ابراہیم صاحب تمام علوم میں کامل الاستعداد ہیں، معقول و فلسفہ کی تمام کتابیں نہایت خوبی سے پڑھاتے ہیں، فلسفہ و منطق اور کلام کے انتہائی اسباق صدرا، شمس بازغہ قاضی مبارک، حمداللہ، امور عامہ کے علاوہ شرح مطالع، شرح اشارات وغیرہ پڑھاتے ہیں، طلبار کا بہت زیادہ میلان ان کی طرف رہتا ہے، نہایت خوش تقریر ہیں، غرض یہ ایک نہایت قابلِ قدر اور شہرت و وقعت حاصل کرنے والے مدرس ہیں۔"

۱۳۶۲ھ میں پھر دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کی، اوّلاً جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مسندِ صدارت کو رونق بخشی، وہاں کے بعد کچھ عرصہ تک مدرسہ عالیہ فتح پوری میں صدارت تدریس کی خدمات انجام دیں اور بعد ازاں بنگال میں ہاٹ ہزاری ضلع چاٹگام کے مدرسہ میں صدرالمدرسین رہے، اور بالآخر ۱۳۶۶ھ میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب کی سفارش اور مجلس شوریٰ کی منظوری سے دارالعلوم دیوبند میں آگئے۔ ۱۳۷۷ھ میں حضرت مدنی کی وفات کے بعد آپ دارالعلوم کی مسندصدارتِ تدریس پر فائز ہوئے، اور تادمِ واپسیں اس پر متمکن رہے، ان کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے، جو برِ صغیر کے علاوہ ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

حضرت علامہ بلیاوی ہر علم و فن خصوصاً علم کلام و عقائد میں یگانۂ روزگار تھے، اُنھوں نے تفسیر و حدیث، عقائد و کلام اور دوسرے علوم کی جو نمایاں خدمات انجام دیں وہ اپنی مثال آپ ہیں، اُن کے درس و تدریس کی مدّت ۱۳۲۷ھ سے ۱۳۸۷ھ تک ۶۰ سال ہوتی

ہے، طلباء اُن کے درس میں بڑے شوق اور انہماک سے شریک ہوتے تھے اور اُن کے افاداتِ عالیہ سے مستفید ہونے کے متمنی رہتے تھے، درس میں اختصار کے ساتھ بڑی جامعیت کی شان تھی، درس کا انداز نہایت باوقار ہوتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ لطائف وظرائف دقیقہ سنجی اور بالغ نظری سے اہم مسائل کو حل کرنے میں خاص ملکہ اور کمال حاصل تھا، قصص وحکایات کو مسائل پر اس طرح منطبق کر دیتے تھے کہ مسئلے کے تمام پہلو واضح اور منقح ہوجاتے تھے، اُن کے درس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ تلامذہ میں فن سے گہری مناسبت ہوجاتی تھی، اور اُن پر علم ودانش کی راہیں کھل جاتی تھیں، وہ اپنے عہد میں عقائد وکلام اور ر س وفلسفہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، حدیث میں روایت سے زیادہ درایت سے کام لیتے تھے، حضرت نانوتوی کے علوم پر اُن کی گہری نظر تھی، حضرت شیخ الہندؒ سے تلمذ کے علاوہ بیعت کا شرف بھی حاصل تھا۔

علامہ بلیاویؒ کی تصانیف میں رسالہ مصافحہ اور رسالہ تراویح اُردو میں ہیں، ایک رسالہ انوار الحکمۃ فارسی میں ہے، یہ رسالہ منطق وفلسفہ کے مضامین پر مشتمل ہے سلم العلوم پر اُن کا عربی میں حاشیہ ضیاء النجوم ہے، میبذی اور خیالی پر بھی اُنھوں نے حواشی لکھے تھے جو افسوس ہے کہ ضائع ہوگئے، آخر میں جامع ترمذی پر حاشیہ لکھ رہے تھے جس کے پورے ہونے کی نوبت نہ آسکی۔

اُن کی صحت عرصے سے خراب ہوگئی تھی، ۲۸ رمضان ۱۳۸۷ھ کی دوپہر کو ۸۴ سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا، قبرستانِ قاسمی میں آسودۂ خواب ہیں۔

مولانا سیّد فخر الدّین احمد

وطن مالوف ہاپوڑ ہے، آپ کے آباء واجداد میں سیّد قطب اور سیّد عالم اپنے دوسرے دو بھائیوں کے ساتھ عہدِ شاہجہاں میں ہرات سے دہلی آئے، یہ حضرات اپنے

زمانے کے ممتاز علماء میں سے تھے، شاہ جہاں نے اُن کے درس وتدریس کے لئے ہاپوڑ میں ایک مدرسہ تعمیر کرادیا، سیّد عالم کا سلسلۂ نسب ۲۶ واسطوں سے حضرت امام حسینؓ پر منتہی ہوتا ہے۔

۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء میں آپ کی ولادت اجمیر میں ہوئی، جہاں آپ کے دادا سیّد عبدالکریم محکمۂ پولیس میں تھانیدار تھے، چار سال کی عمر میں تعلیم کا آغاز ہوا، قرآن شریف والدہ ماجدہ سے پڑھا، فارسی کی تعلیم اپنے خاندان کے بزرگوں سے حاصل کی، عمر کے بارھویں سال اپنے خاندانی عالم مولانا خالد سے عربی صَرف ونحو شروع کی، اسی دوران میں آپکے والد ماجد کو اپنے آبائی مدرسے کے احیاء کا خیال پیدا ہوا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ انقلاب کی نذر ہوگیا تھا، چندسال اس میں تعلیم پانے کے بعد آپ کو گلاؤٹھی کے مدرسہ منبع العلوم میں بھیجدیا گیا، وہاں مولانا ماجد علی سے مختلف کتابیں پڑھیں، بعدازاں اپنے استاذ مولانا ماجد علی کے ساتھ دہلی چلے گئے، دہلی کے مدارس میں معقولات کی کتابیں پڑھیں ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء میں دارالعلوم دیوبند میں آئے، حضرت شیخ الہندؒ نے امتحانِ داخلہ لیا، امتحان میں امتیازی نمبروں سے سرفراز ہوئے حضرت شیخ الہندؒ کی ہدایت کے مطابق ایک سال کے بجائے دوسال میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی، دارالعلوم کے زمانۂ طالب علمی ہی میں طلباء کو معقولات کی کتابیں پڑھانے لگے تھے۔

۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد دارالعلوم میں مدرس مقرر ہوگئے، کچھ عرصے کے بعد اکابر دارالعلوم نے شوال ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء میں آپ کو مدرسہ شاہی مرادآباد میں بھیجدیا مرادآباد میں تقریباً ۴۸ سال قیام رہا، تقریباً نصف صدی کی اس طویل مدت میں بہت سے طلباء حدیث نے آپ سے اکتسابِ فیض کیا ہے[1]۔

مولانا ممدوح چونکہ حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا سیّد انورشاہ کشمیریؒ کے خاص

---

[1] ایضاح البخاری جلد اوّل ص ۷ - ۱۲

تلامذہ میں سے تھے، اس لئے آپ کے درسِ حدیث میں دونوں جلیل القدر اُستادوں کے رنگ کی آمیزش پائی جاتی تھی، چنانچہ آپ کا درسِ بخاری نہایت مبسوط اور مفصل ہوتا تھا، جس میں حدیث کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث ہوتی تھی۔ فقہاء کے مذاہب کو بیان کرنے کے بعد احناف کے فقہی مسلک کی تائید و ترجیح کی وضاحت میں ایسے پر زور دلائل پیش فرماتے تھے جس کے بعد سامع کا ذہن بالکل مطمئن ہوجاتا تھا اور اس میں کوئی ادنیٰ خلجان باقی نہیں رہتا تھا، اثنائے درس میں صحیح بخاری کی مختلف شروح کے ساتھ ساتھ اپنے اساتذہ کے علوم و معارف بھی جا بجا پیش فرماتے رہتے تھے، درس حدیث میں آپ کی تقریر مبسوط و مفصّل ہونے کے علاوہ سہل اور دل نشین بھی ہوتی تھی، اس لئے کم استعداد کے طلباء کو بھی استفادہ کا پورا پورا موقع مل جاتا تھا انداز بیان نہایت پاکیزہ اور شستہ ہوتا تھا، جس میں آپ کے جمالِ ظاہری کی تمام خصوصیات بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں اس بناء پر آپ کے درسِ بخاری کو شہرتِ تام اور قبولِ عام حاصل تھا، چنانچہ ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء میں پونے تین سو کے قریب طلباء آپ کے درس حدیث میں شریک تھے، اور کم و بیش ہر سال یہی تعداد دورۂ حدیث کے طلباء کی رہتی تھی۔

۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء میں حضرت مولانا مدنیؒ کی وفات کے بعد دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے اراکین نے دارالعلوم دیوبند کے منصب شیخ الحدیث کے لئے آپ کا انتخاب کیا، اس سے پہلے بھی دو مرتبہ حضرت مولانا مدنیؒ کی گرفتاری اور رخصت کے زمانے میں آپ دارالعلوم میں صحیح بخاری کا درس دے چکے تھے۔

تعلیمی مشاغل کے علاوہ ملکی و ملی سیاسیات سے بھی آپ کو تعلق تھا، اور اس کے نتیجے میں قید و بند کی صعوبتوں کو بھی انھیں جھیلنا پڑا، حضرت مولانا مدنیؒ کی جمعیۃ العلماء ہند کی صدارت کے زمانے میں دو مرتبہ نائب صدر رہے، بعد ازاں جمعیۃ علماء ہند کی مسندِ صدارت پر فائز ہوئے اور تادمِ واپسیں صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

آخر عمر میں جب صحت نے جواب دے دیا تو بغرض علاج و تبدیل آب و ہوا اُن کو مراد آباد لے جایا گیا، جہاں اُن کے متعلقین قیام پذیر تھے، مگر وقتِ موعود آچکا تھا، کچھ عرصہ علیل رہ کر ۲۰ صفر ۱۳۹۲ھ (۵ اپریل ۱۹۷۲ء) کی تاریخ میں نصف شب کے بعد انتقال فرمایا۔ اور علم و فضل کا یہ آفتاب جہاں تاب سرزمین مراد آباد میں ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔

مولانا شائق احمد عثمانیؒ

۲۵ ربیع الاوّل ۱۳۱۱ھ تاریخ پیدائش ہے، بہار میں پورنیہ ضلع بھاگلپور وطن تھا، ابتدائی تعلیم پورنیہ اور مونگیر میں ہوئی، پورنیہ میں جب مدرسہ نعمانیہ قائم ہوا، تو مولانا عثمانیؒ اس میں داخل ہو گئے۔ حضرت مولانا اعزاز علی امروہیؒ مدرسہ نعمانیہ کے مدرس تھے، چار سال مدرسہ نعمانیہ میں حضرت شیخ الادب سے تحصیل علم کرنے کے بعد ۱۳۲۷ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے، ۱۳۲۸ھ میں دورۂ حدیث میں شریک ہو کر امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت کا شرف حاصل کیا، ۱۳۳۱ھ میں ایک سال تک دارالعلوم میں مدرس رہے۔

مولانا سندھیؒ نے جب ۱۳۳۱ھ میں دہلی میں مجلس نظارت المعارف قائم کی تو مولانا عثمانی نے وہاں رہ کر قرآن مجید کے علوم و معارف کے استفادے کے ساتھ مولانا سندھیؒ سے سیاسی تربیت بھی حاصل کی۔ نظارت المعارف میں نوجوانوں کو کس طرح سیاسی تربیت دی جاتی تھی اس کا اندازہ مولانا عثمانی کے اس بیان سے ہوتا ہے:۔

"مولانا سندھی کبھی اس طرح کا مضمون لکھنے کے لئے دیتے تھے" کہ اگر تمہیں ہندوستان کا گورنر جنرل بنا دیا جائے تو تم ملک کا انتظام کس طرح کرو گے"۔[1]

---

[1] مجلہ العلم کراچی بابت جنوری تا مارچ ۱۹۶۰ء ص ۱۷

مولانا عثمانی کچھ مدت تک خانقاہ مونگیر سے بھی وابستہ رہے، اُس زمانے میں بہار کے بعض اضلاع میں قادیانیت کا فتنہ سر اُبھار رہا تھا، حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے اس فتنے کی سرکوبی کے لئے بڑا کام کیا، قادیانیت کے رد میں خود بھی کئی کتابیں لکھیں اور دوسروں سے بھی لکھوائیں، اسی غرض سے خانقاہ رحمانی میں ایک پریس بھی لگایا گیا، اور ایک ماہنامہ کا اجرا عمل میں آیا، جس کی ادارت مولانا عثمانی کے سپرد ہوئی[۱]، تحریک خلافت کے زمانے میں مولانا عثمانی کلکتہ چلے گئے اور وہاں بنگال خلافت کمیٹی کے شعبۂ نشر و اشاعت کے انچارج مقرر ہوئے، اس زمانے میں انھوں نے تحریکِ خلافت میں سرگرمی سے حصہ لیا۔

۱۹۲۱ء کے اواخر میں اُنھوں نے کلکتہ سے ایک روزنامہ "عصرِ جدید" کے نام سے نکالا، ابھی اخبار کو جاری کئے ہوئے ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ مولانا عثمانی کو دفعہ ۱۲۴ الف تعزیرات ہند کے تحت ایک سال قید بامشقت کی سزا ہوگئی یہ وہی دفعہ تھی جس کے تحت کراچی کا مشہور تاریخی مقدمہ چلایا گیا تھا، جس میں حضرت مولانا مدنیؒ اور علی برادران وغیرہ شامل تھے، "عصرِ جدید" نے تحریکِ خلافت اور ملتِ اسلامیہ کی گراں قدر خدمات انجام دیں، حضرت شیخ الہندؒ کے علمی فیوض کی اشاعت بھی عصرِ جدید کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

مولانا عثمانی کو قرآن مجید سے ہمیشہ شغف رہا، اُنھوں نے آخری دو پاروں کے علاوہ اور بھی کئی سورتوں کی تفسیریں لکھی ہیں جو عام طور پر بہت مقبول ہوئیں۔

فروری ۱۹۴۸ء میں مولانا عثمانی کلکتہ سے کراچی چلے گئے اور وہاں سے "عصرِ جدید" جاری کر دیا، مگر وہاں اُن کا اخبار تین سال جاری رہ کر بند ہوگیا[۲]۔

---

[۱] مجلۂ العلم کراچی بابت جنوری تا مارچ ۱۹۶۰ء ص ۳، [۲] جس زمانے میں مشاہیر علمائے دارالعلوم دیوبند کا یہ تذکرہ لکھا جارہا ہے، ۱۹۷۲ء کی ہندوپاکستان کی جنگ کے بعد سے (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

مولانا خواجہ عبدالحیؒ فاروقی

پنجاب میں ضلع گورداسپور کے رہنے والے تھے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قابلِ گریجویٹ تھے، ۱۳۲۹ھ میں دارالعلوم سے حدیث کی تکمیل کی، حضرت شیخ الہندؒ کی تحریکِ آزادیٔ ہند سے خواجہ صاحب کو گہرا تعلق تھا، دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد کچھ مدّت تک لاہور میں رہ کر درسِ قرآن دیتے رہے، اُن کے درس میں کالجوں کے طلبار، دفاتر کے کلرک وغیرہ جدید تعلیم یافتہ طبقے کے افراد شریک ہوتے تھے، اُن کے درس قرآن کا انداز یہ تھا کہ نوجوان طبقے کو قرآن حکیم کی تعلیم اس طرح سے دی جائے کہ وہ صحیح اسلامی روح سے روشناس ہوجائیں اور اسلامی شعائر کے ایسے پابند بن جائیں کہ وہ خود یہ فیصلہ کریں کہ انھیں کس طرح اپنی زندگی گزارنی چاہیئے، اور اسی کے ساتھ وطن کی آزادی کی جدوجہد کو وہ اپنے اوپر لازم کرلیں، خواجہ صاحب کا درسِ قرآن کس طرح کا ہوتا تھا اس کا اندازہ ان کی تفسیری کتابوں الخلافۃُ الکبریٰ، صراطِ مستقیم، عبرت، برہان، سبیل الرشاد، بصائر اور ذکریٰ کے مضامین سے ہوتا ہے، الخلافۃُ الکبریٰ میں اُنھوں نے بتلایا ہے کہ مُسلمانوں کے موجودہ تنزل کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے مجاہدانہ زندگی ترک کردی ہے، حالانکہ دنیا میں ان کا وجود خداوند تعالیٰ کے کلام کی نشرواشاعت اور مجاہدانہ قوت کے لئے ہے، سورۂ انفال کی تفسیر میں فلسفۂ جہاد پر بحث کرتے ہوئے جہاد کی ضرورت اور فتح وکامرانی کے اصول پیش کئے ہیں، سبیل الرشاد میں اسلامی مسائل کی بڑی دل نشین فلسفیانہ تشریح کی ہے، ذکریٰ میں جو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دونوں ملکوں کے درمیان آمدورفت اور ڈاک کے جملہ ذرائع منقطع ہیں، اس لئے پاکستان کے فضلائے دارالعلوم کے حالات معلوم کرنے کے تمام راستے مسدود ہیں، اس مدّت میں وہاں کے لوگوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔

پارہ عم کی تفسیر بتلایا ہے کہ اگر قرآن کریم کی ہدایتوں پر عمل کیا جائے تو اب بھی مسلمان معراجِ ترقی پر پہنچ سکتے ہیں، خواجہ صاحب ان امور پر زور دے کر قرآن حکیم کے حقائق ومعارف پر غور وفکر کی دعوت دیتے تھے، انھیں قرآن مجید کی تفسیر خاص شغف تھا، انھوں نے قرآن مجید کی مختلف سورتوں کی علیحدہ علیحدہ حصوں میں تفسیر لکھی ہے، یہ تفسیر زبان وبیان کے لحاظ سے بہت سہل، آسان اور طرزِ نگارش سلیس اور شگفتہ ہے۔

۱۳۳۶ھ ۱۹۱۷ء میں انھیں حضرت شیخ الہند کی تحریک سے وابستہ ہونے کی وجہ سے لاہور میں نظر بند کر دیا گیا جس سے ۱۳۳۸ھ میں رہائی ملی، جنودِ ربانیہ میں ان کا نام کرنل کی فہرست میں شامل ہے۔

خواجہ صاحب مدت تک جامعہ ملیہ دہلی میں تفسیر کے اُستاذ اور شعبۂ دینیات کے ناظم رہے، وہ آخر میں پاکستان چلے گئے تھے، وہاں علماء کا ایک بورڈ بنا کر درسِ قرآن کے نام سے پورے قرآن مجید کی متعدد جلدوں میں تفسیر لکھی ہے، یہ تفسیر بھی بہت سہل اور آسان ہے، اس میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی کے سمونے کی کوشش کی گئی ہے، سیرتِ نبوی پر اُن کی ایک کتاب "ہمارے رسول" کے نام سے معروف ہے، جو بچوں کے لئے آسان اور سہل زبان میں لکھی گئی ہے۔

خواجہ صاحب کے انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی۔

مولانا عبد الشکور دیوبندیؒ

دیوبند کے شیوخ خاندان سے تھے، اُن کے پردادا مولانا شمس الدینؒ[1] حضرت سید

---

[1] مولانا عبد الخالقؒ جنھوں نے دیوبند کی جامع مسجد کی تعمیر میں زبردست خدمات انجام دیں مولانا شمس الدین انکے والد بزرگوار تھے، جامع مسجد دیوبند کی امامت وخطابت (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

احمد شہیدؒ کے حلقۂ بیعت میں داخل تھے، مولانا عبدالشکورؒ نے دارالعلوم میں تعلیم پائی اور ۱۳۲۹ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔

مدرسہ صدیقیہ دہلی اور مدرسہ حسین بخش دہلی میں مدتوں تدریس کی خدمات انجام دیں، ۱۳۶۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تدریس کے لئے اُن کا انتخاب ہوا، شوال ۱۳۶۷ھ میں حجاز چلے گئے۔ اور وہیں مدرسہ شرعیہ مدینہ منورہ میں مدرس مقرر ہوگئے، حجاز میں اللہ تعالےٰ نے ان کے درس کو بڑی مقبولیت بخشی اور بہت سے عرب طلباء اُن کے درس سے فیض یاب ہوئے۔

مولانا موصوف کی شخصیت اپنے علم و فضل، زُہد و تقویٰ، ایثار و انکسار اور اخلاص و سادگی کا ایک پُرکشش مجموعہ تھی، ان کی ساری عمر قرآن شریف کے درس و تفسیر و حدیث نبویؐ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اُن ہی کی اولاد میں اب تک چلی آرہی ہے گو عرصۂ دراز سے امامت وخطابت جمعہ کے فرائض حضرت مولانا محمد طیب صاحب انجام دیتے ہیں، فقہی مسائل میں ایک رسالہ "شریعت کا لٹھ" اُن کی تصنیف ہے، مولانا شمس الدین ابتداً کچھ بدعات کی جانب مائل تھے، دیوبند میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے ورود کی خبر سن کر مخالفت کے جوش میں ایک ہجو لکھی جو دیوبند میں اُسی وقت بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئی، ایک مرتبہ سید صاحب کے دورانِ قیام میں یہ دیکھنے کے لئے اُن کی قیام گاہ پر آئے کہ آخر سید صاحبؒ کی جانب لوگوں کا اس قدر رجوع کیوں ہے؟ دیوبند کی قاضی مسجد جہاں سید صاحب کا قیام تھا عقیدت مندوں سے بھری ہوئی تھی، مولانا ایک طرف مجمع میں بیٹھ گئے، سید صاحب نے فوراً ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ "آپ ہی نے میری ہجو میں اشعار لکھے ہیں؟" سید صاحب نے یہ الفاظ کچھ ایسے انداز میں فرمائے کہ مولانا شمس الدینؒ تڑپ گئے اور بے اختیار معذرت کے بعد عرض کیا کہ "اس گستاخی پر شرمندہ ہوں خدا کے لئے معاف کر دیجئے اور حلقۂ بیعت میں داخل فرمالیجئے" سید صاحب نے بیعت کر لیا، مرید ہو کر بالکل سید صاحبؒ کے رنگ میں ڈوب گئے، دیوبند کے مشہور بزرگ شاہ ولایتؒ کے قریب مدفون ہیں۔

کی خدمت میں گزری، قرآن شریف کے جیّد حافظ تھے، ایسے دل گداز اور تاثیر میں ڈوبے ہوئے لہجے میں قرأت کرتے کہ سننے والوں پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت کا شرف حاصل تھا۔

جمادی الاوّل ۱۳۶۳ھ ۱۹۴۴ء میں مدینہ منورہ میں وفات پائی، جنت البقیع میں مدفون ہیں۔

مولانا حکیم عبد العلی لکھنویؒ

وطن رائے بریلی میں تکیہ شاہ علم اللہ تھا، مگر لکھنؤ میں قیام کی وجہ سے لکھنؤ کی نسبت سے شہرت تھی، ۱۳۱۱ھ میں پیدا ہوئے، مولانا حکیم عبد الحیؒ ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ و مصنف نزہۃ الخواطر کے فرزند اکبر تھے، دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم پائی، طب اپنے والد بزرگوار سے پڑھی، ۱۳۲۹ھ میں حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری اور دوسرے اساتذہ سے صحاح ستہ کی تحصیل کی، بعد ازاں انگریزی کی جانب متوجہ ہوئے اور کیننگ کالج لکھنؤ سے ۱۳۳۷ھ سے بی۔ ایس۔ سی کے امتحان میں فرسٹ آئے، حکیم محمد اجمل خاں صاحب سے استفادے کے لئے دہلی چلے گئے، آخر میں لکھنؤ کے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا، ۱۳۴۴ھ میں ڈاکٹری کا امتحان پاس کر کے لکھنؤ میں مطب شروع کر دیا۔

انگریزی تعلیم اور ڈاکٹر ہونے کے باوجود ان کی زندگی سادہ اور اپنے اسلاف کا نمونہ تھی، مغربی تہذیب کو قریب سے دیکھنے اور اس نظامِ تعلیم میں برسوں تک رہنے کے باوجود اس کے سخت ناقد تھے، اُن میں قدیم و جدید تہذیب و ثقافت اور مشرقی و مغربی علوم کا نہایت حسین اور دلآویز امتزاج تھا، انگریزی اور ڈاکٹری کی تعلیم کے دوران میں بھی اُن کی وضع قطع اور معاشرت میں کوئی فرق نہیں آیا، حضرت مولانا مدنیؒ سے بیعت حاصل تھی۔

۱۳۵۰ھ میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے ناظم مقرر ہوئے، اپنے ذاتی مطب کے

کے ساتھ نظامت کے فرائض تا دم واپسیں انجام دیتے رہے، ۱۳۴۰ھ سے ۱۳۸۰ھ تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔

۳ ذی قعدہ ۱۳۸۰ھ ۱۹۶۱ء میں لکھنؤ میں وفات پائی، اور اپنے آبائی قبرستان تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں انھیں سپرد خاک کیا گیا، ممتاز عالم دین مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ان کے برادر خورد اور تلمیذ رشید ہیں۔

مولانا مُبارک حسین سنبھلیؒ

۱۲۹۶ھ ۱۸۷۸ء میں سنبھل ضلع مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن ہی میں پائی پھر ان کے والد صاحب نے ایک پشاوری عالم کو مکان پر رکھ کر تعلیم کا انتظام کیا، استاذ کو چونکہ معقولات پر زیادہ عبور تھا، اس لئے وہ ہی رنگ شاگرد میں سرائت کر گیا، منطق و فلسفہ کی سبھی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھیں، ۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو کر دورۂ حدیث پڑھا اور ۱۳۲۹ھ ۱۹۱۱ء میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ سفروں میں رہے مناظرہ اور مجاہدانہ سرگرمیوں کا ذوق زمانۂ طالب علمی ہی سے تھا، علمی ترقی کے ساتھ اس میں بھی ترقی ہوتی گئی، ۱۳۳۰ھ میں بریلی کے ایک مناظرے میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کے ساتھ شریک ہو کر زبردست کامیابی حاصل کی، اور "شیرِ اسلام" کے خطاب سے نوازے گئے۔

۱۳۳۴ھ ۱۹۱۵ء میں اُنھوں نے قاسم العلوم کے نام سے میرٹھ میں ایک مدرسہ قائم کیا، ۱۳۳۸ھ ۱۹۱۹ء میں جب مولانا قاضی بشیر الدّین اور حاجی تہور علی صاحبان نے دیوبندی مسلک کی اشاعت کے لئے "دارالعلوم کے نام سے مدرسہ قائم کیا تو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب انبہٹویؒ کے مشورے سے صدر مدرس کی حیثیت سے اُن کا انتخاب کیا گیا، یہ تحریکِ خلافت

کا زمانہ تھا، مولانا مُبارک حسین میرٹھ میں درس و تدریس کے ساتھ ضلع میرٹھ کی خلافت کمیٹی کی نظامت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے، ملک کی آزادی کی جد وجہد میں وہ ہمیشہ جمعیۃ العلماء کے سرگرم کارکن رہے، مدرسہ دار العلوم میں اُن کی وجہ سے دن بدن جب طلباء کی تعداد بڑھنے لگی تو ۱۹۲۵ء میں انھوں نے وسط شہر میں مدرسہ کے دار الاقامہ کی عمارت بنوائی، اس کا سنگِ بنیاد حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ کے مقدس ہاتھوں سے رکھوایا گیا، عمارت "یادگار شیخ الہندؒ" کے نام سے موسوم ہے، یہ مدرسہ میرٹھ کی شاہی جامع مسجد میں ہے۔

جمادی الاول ۱۳۶۱ھ (جون ۱۹۴۲ء) میں وفات پائی۔ دار الاقامہ مدرسہ دار العلوم میرٹھ کے صحن میں ان کو دفن کیا گیا" زینتِ آستانِ دار العلوم" سے اُن کی وفات کا سن نکلتا ہے۔

مولانا شبّیر علی تھانویؒ

۱۳۱۲ھ میں پیدا ہوئے، حضرت تھانویؒ کے حقیقی بھتیجے تھے، تھانہ بھون ہی کے رہنے والے تھے، مولانا عبداللہ گنگوہی مصنّف "تیسیر المبتدی" سے ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے مدرسہ امداد العلوم میں پائی، کچھ دن تک اپنے والد کے پاس رہ کر انگریزی پڑھی، پھر مظاہر علوم سہارن پور میں پڑھا، اور حضرت مولانا خلیل احمد انبہٹہ ی سے علمی اور روحانی فیض حاصل کیا، اور آخر میں ۱۳۳۰ھ میں دار العلوم دیوبند سے علوم کی تکمیل کی، مثنوی مولانا روم اپنے عمِ بزرگوار حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے سبقاً سبقاً پڑھی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد تھانہ بھون میں حضرت حکیم الامتؒ کی تصانیف و اشاعت کے لئے اشرف المطابع کے نام سے ایک پریس قائم کیا، "التبلیغ" اور "النور" کے نام سے ماہانہ رسالے جاری کئے، ۱۳۴۷ھ سے ۱۳۶۹ھ تک خانقاہ امدادیہ کے منتظم رہے

برِّصغیر کی تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہاں کتابوں کا کاروبار شروع کردیا اعلاء السنن کی آخری غیر مطبوعہ آٹھ جلدیں عربی ٹائپ میں شائع کیں، بیان القرآن اور بہشتی زیور کو نہایت اعلیٰ پیمانے پر طبع کرایا، پاکستان میں تبلیغی جذبہ لے کر گئے تھے اور آخر تک اس کے لئے برابر کوشاں رہے۔

۲۸ رجب ۱۳۸۸ھ (۲۱ نومبر ۱۹۶۸ء) کو کراچی میں وفات پائی، اور ناظم آباد کے قبرستان میں حضرت مولانا عبدالغنی پھول پوریؒ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

مولانا احسان اللہ خاں تاجورؔ

۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۳ء میں نجیب آباد میں پیدا ہوئے، روہیلہ افغان خاندان سے تعلق رکھتے تھے ابتدائی تعلیم اپنے وطن نجیب آباد میں پائی، بعدازاں مزید تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۱ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی، زمانہ طالب علمی میں عربی ادب سے شغف رہا جو آگے چل کر اُردو ادب میں تبدیل ہوگیا، مولانا تاجورؔ نے زمانۂ طالب علمی ہی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا، شاعری میں انھیں اگرچہ رسا رام پوری سے تلمذ تھا، مگر دارالعلوم کے زمانۂ طالب علمی میں حبیب حسن وحشیؔ[۱] دیوبندی سے بھی اصلاح لیتے رہے۔

دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد وہ لاہور چلے گئے وہاں اس زمانے کے مشہور رسالہ "مخزن" کی ادارت میں شریک ہو گئے، لاہور سے جب "ہمایوں" جاری ہوا تو مولانا تاجورؔ "ہمایوں" میں چلے آئے، اسی زمانے میں وہ لاہور کے دیال سنگھ کالج میں اُردو

---

[۱] حبیب حسن وحشی دیوبندی بڑے باکمال شاعر تھے، تاریخ گوئی میں خاص ملکہ تھا، اُن کا کلام دستبُردِ زمانہ سے ضائع ہوگیا، ۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۵ء میں دیوبند میں انتقال ہوا، شاہ ولایت صاحبؒ کے قبرستان میں مدفون ہیں۔

اور فارسی کے لکچرار مقرر ہو گئے۔

لاہور میں جلد ہی نوجوان شعراء اُن کے گرد جمع ہو گئے، اُن میں سے بہت سوں نے آگے چل کر شہرت اور ناموری حاصل کی، مولانا تاجور نے لاہور میں انجمن اربابِ ادب قائم کی جس کے اہتمام میں جگہ جگہ مشاعرے ہونے لگے، انھوں نے اُردو شاعری میں بعض اجتہادات بھی کئے ہیں، انجمن اربابِ ادب کے بعد اُنھوں نے "اُردو مرکز" کے نام سے تصنیف و تالیف کا ایک ادارہ قائم کیا جس میں مولانا تاجور کی زیر نگرانی اصغر گونڈوی گویا جہاں آبادی مجنوں گورکھپوری، جگر مراد آبادی، اختر شیرانی اور طالب میرٹھی جیسے باکمال شعراء نے اُردو کے تمام مشہور نثر نگاروں اور شعراء کے کلام کا انتخاب کئی جلدوں میں ترتیب دیا۔

۱۹۳۱ء کے اواخر میں اُنھوں نے "ادبی دُنیا" کے نام سے ایک معیاری رسالہ جاری کیا اور کچھ عرصے کے بعد ایک اور رسالہ "شاہکار" کے نام سے نکالا، مولانا تاجور کو نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی، ان کے ادبی کمالات کا شہرہ پنجاب سے گزر کر پورے ملک میں پھیلا ہوا تھا، آخر میں انھیں برطانوی حکومت کی جانب سے شمس العلماء کا خطاب دیا گیا، اور ہندوستان کے ادبی حلقوں نے اُنھیں ادیب الملک کے خطاب سے سرفراز کیا۔

۱۳۷۱ھ میں ساٹھ سال کی عمر میں مولانا تاجور کا لاہور میں انتقال ہو گیا۔

مولانا عُزیر گل پشاوریؒ

قصبہ زیارت کا کا صاحب ضلع پشاور کے باشندے ہیں، ۱۳۳۱ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کر کے حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک آزادی کے ممبر بن گئے تھے۔ تحریک کے بہت سے اہم اور عظیم الشان کام اُنھوں نے بڑی قابلیت سے انجام دیئے، حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت کے پرجوش اور سرگرم کارکن تھے۔

حاجی ترنگ زئی اور تحریک کے دوسرے اراکین تک خطوط اور پیغامات کا پہنچانا انہی

کے ذمّے تھا، حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد خاص ہونے کے ساتھ خزانچی بھی تھے، ۱۳۳۳ھ میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ حجاز گئے، اور جب حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کر کے مالٹا میں نظر بند کیا گیا تو یہ بھی اُن کے ساتھ مالٹا میں نظر بند رہے، اور ساتھ ہی ہندوستان واپس آئے حضرت شیخ الہندؒ کے جاں نثار خادم تھے، جنودِ ربّانیہ کی فہرست میں اُن کا عہدہ کرنل بتایا گیا ہے۔

تحریکِ خلافت کے زمانے میں دیوبند کی خلافت کمیٹی کے صدر بنائے گئے، دوسری جنگِ عظیم سے قبل رُڑکی کے مدرسہ رحمانیہ میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ قیام رُڑکی کے دوران ایک نومُسلم انگریز خاتون سے نکاح کر لیا تھا، یہ انگریز خاتون مدّت سے رڑکی کے قریب رہائش پذیر تھیں، انگلستان کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، اور اسلام کا مطالعہ کر رہی تھیں، اس سلسلے میں اپنے ذہنی اشکالات رفع کرنے کے لئے اُن کی آمد و رفت مولانا عزیر گل صاحب کے پاس رہتی تھی، مشرف بہ اسلام ہو کر تصوّف کی جانب اُن کا میلان بڑھ گیا تھا، انھیں محسوس ہوا کہ نکاح کے بغیر انھیں تصوّف کی راہ میں مشکلات درپیش ہیں، انھوں نے اپنی اس پریشانی کا مولانا سے تذکرہ کرتے ہوئے اُن سے نکاح کی خواہش کا اظہار کیا، جسے خاتون کے اصرار پر مولانا عزیر گل صاحب نے منظور کر لیا۔

تقسیم ملک کے زمانے میں مولانا عزیر گل صاحب اپنی اس نومسلم اہلیہ اور بچّوں کو لے کر اپنے وطن پشاور چلے گئے، اور ہنوز وہیں مقیم ہیں۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

حضرت مولانا گیلانیؒ بہار کی مردم خیز سرزمین کے دُرِّ شاہوار تھے، ۹، ربیع الاوّل ۱۳۱۰ھ کو اپنی ننھیال استھانواں میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن گیلانی میں اپنے چچا حکیم سیّد ابوالنصر سے پائی، اُن کے خاندانی بزرگوں پر معقولات کا رنگ

غالب تھا، ۱۳۲۴ھ میں انھیں مزید تعلیم کے لئے مولانا برکات احمد مرحوم سے پڑھنے کے لئے ٹونک بھیجدیا گیا، مولانا برکات احمد معقولات کے ایک نامور عالم تھے، سات سال تک ان سے معقولات کی چھوٹی بڑی کتابیں پڑھیں۔

مولانا گیلانی رحؒ نے اپنی تعلیم کی جو تفصیل لکھی ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ٹونک میں معقولات کی تعلیم کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ علم وحقیقت کی دنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے جو ان کے گردوپیش نظر آرہی ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہے جس تک رسائی حاصل کرنا ان کے لئے ضروری ہے، انھوں نے والدین سے اصرار کیا کہ وہ دیوبند جانا چاہتے ہیں، خاندانی بزرگوں پر چونکہ معقولیت کا غلبہ تھا اسی لئے بڑی مشکل اور اصرار کے بعد بالآخر انھیں دیوبند آنے کی اجازت دی گئی، انھوں نے جب دارالعلوم دیوبند میں قدم رکھا تو اُن کے ذہن وفکر پر اپنے خاندان اور اپنے استاذ مولانا برکات احمد ٹونکی کی معقولیت کی گہری چھاپ لگی ہوئی تھی۔

۱۳۳۱ھ میں انھوں نے دورۂ حدیث میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۲ھ میں دورۂ حدیث میں شریک رہ کر دارالعلوم سے کتبِ حدیث کی سند حاصل کی، دارالعلوم میں حضرت شیخ الہندؒ، حضرت شاہ صاحب، حضرت علامہ عثمانی رحمہم اللہ اور دوسرے اساتذہ کے علمی اور روحانی فیضان وتربیت سے اُن کی زندگی کا رُخ معقولات کے بجائے تفسیر وحدیث اور سلوک ومعرفت میں تبدیل ہوگیا، اور فکر ونظر کی وہ تمام بنیادیں متزلزل ہوگئیں جو خاندان، تعلیم اور گردوپیش نے اُن کے گرد چنی تھیں۔

مولانا گیلانی تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ مدت تک رسالہ "القاسم" اور "الرشید" میں معاونِ مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، اس زمانے میں انھوں نے اپنے علمی اور تحقیقی مضامین اور والہانہ طرزِ نگارش سے علمی حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کرلیا تھا، سوانح ابوذر غفاریؓ اور کائناتِ روحانی یہ دونوں کتابیں اُن کے اسی

دور کی یادگار ہیں ۔

حضرت مولانا حافظ محمد احمدؒ کی سفارش سے مولانا گیلانی کا حیدر آباد میں جامعۂ عثمانیہ میں تقرر ہوگیا جہاں بالآخر وہ شعبۂ دینیات کے صدر مقرر ہوئے، اُنھوں نے تقریباً ۲۵ سال تک حیدر آباد میں علمی خدمات انجام دیں، اُن کے درس و تربیت سے جامعۂ عثمانیہ کے بہت سے طلباء میں دین داری پیدا ہوگئی تھی، تلامذہ میں بعض نامور اہل قلم بنے ۔

النبی الخاتم، الدین القیم، تدوینِ حدیث، ہزار سال پہلے، نظامِ تعلیم و تربیت اُنکی مشہور تصانیف ہیں[1]، ان کے علاوہ سیکڑوں مقالات و مضامین اُن کے قلم سے نکلے اور ملک کے بلند پایہ رسائل جرائد میں شائع ہوئے، اُن کا جو والہانہ اسلوب تحریر میں پایا جاتا ہے وہی والہانہ رنگ تقریر میں بھی تھا، وہ علم و فضل، معلومات، کثرتِ مطالعہ، دقّتِ نظر، نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی میں نادرۂ روزگار تھے، اُن کی کتاب ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم

---

[1] ان کی سب سے آخری تصنیف سوانح قاسمی ہے جو انھوں نے حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کی فرمائش پر تالیف کی، حضرت ممدوح نے متعلقہ مواد انکے پاس بھیجدیا، دوران تصنیف میں مولانا گیلانی مہتمم صاحب سے برابر مراسلت فرماتے رہے، تین جلدوں میں سوانح قاسمی ترتیب دی، فرمایا کرتے تھے کہ میری ابتداء بھی القاسم سے ہی ہوئی ہے اور انتہا بھی القاسم (سوانح قاسمی) ہی پر معلوم ہوتی ہے، اور ایسا ہی ہوا بھی، تین جلدیں مرتب ہوجانے پر حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے ان کی تحسین و تبریک کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ آپ نے سوانح قاسمی کی تین جلدیں مرتب فرمادیں جو آپ ہی کا کام تھا، لیکن ابھی تک آپ نے سوانح قاسمی کو ہاتھ نہیں لگایا، حضرت کی حقیقی سوانح یہ نہیں ہے کہ وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے اور کیا کیا کارنامے انجام دیئے، بلکہ حقیقی سوانح یہ ہے کہ اُنھوں نے حکمتِ قاسمیہ دنیا کے سامنے پیش کی جو اس دور کا علم کلام ہے، اس کی توضیح و تشریح اور اس کے غوامض اور اصول موضوعہ کو دنیا کے سامنے پیش کرنا اور بالفاظ دیگر اس پر تبصرہ کرکے یہ بتلانا کہ (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

وتربیت اپنے موضوع پر معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے، ہندوستان میں قطب الدین ایبک کے عہد سے موجودہ دور تک مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت کیا رہا ہے؟ اس کو پوری تفصیل وتحقیق کے ساتھ بتلایا ہے۔ نصابِ تعلیم کن علوم وفنون پر مشتمل ہوا کرتا تھا، طریقِ تعلیم کیا تھا، طلبار کے قیام وطعام کے انتظامات کس طرح ہوتے تھے، تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت اور تزکیۂ نفس کا اہتمام کس درجے کا تھا، مختصر یہ ہے کہ اس موضوع کا کوئی گوشہ نہیں جس پر سیر حاصل بحث نہ ہو، کتاب مؤثر اور دلچسپ ہے۔

آخر میں جامعۂ عثمانیہ سے وظیفہ یاب ہو کر اپنے وطن گیلانی میں مقیم ہو گئے تھے، وہیں طویل علالت کے بعد ۲۵ شوال ۱۳۷۵ھ (۵ جون ۱۹۵۶ء) کو وفات پائی۔

مولانا عبدالرحمٰن کیمل پوری

پنجاب میں کیمل پور کے رہنے والے تھے، وہیں ابتدائی تعلیم پائی، پھر مظاہر علوم سہارنپور میں پڑھنے کے بعد ۱۳۳۳ھ میں کتبِ حدیث میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی، حضرت شیخ الہندؒ کے آخری تلامذہ میں سے تھے، علومِ نقلیہ وعقلیہ پر کامل دستگاہ رکھتے تھے، علم حدیث میں اُن کی نظر بڑی گہری تھی، زہد وتقویٰ میں منفرد اور نہایت زاہدانہ زندگی کے خوگر تھے، اسبال الازار اپنے موضوع پر ان کی ایک جامع تصنیف ہے، یہ کتاب

(بقیہ صفحہ گزشتہ) انھوں نے کتاب وسنت کے حکم واسرار کو برہانی انداز میں کس کس طرح نمایاں کیا ہے؟ اسلئے اب آپ اس پر متوجہ ہوں، اس پر مولانا کا والانامہ حضرت مہتمم صاحب کے خدمت میں پہونچا کہ آپ نے حقیقتاً حقیقی نقطۂ سوانح پر مطلع فرمایا، میں اسے شروع کر رہا ہوں، لیکن مولانا سوانح کی اس چوتھی جلد کے چند صفحات ہی لکھنے پائے تھے کہ وقتِ موعود آپہونچا اور ان کے خیال کے مطابق القاسم ہی سے ان کی ابتداء ہو کر القاسم ہی پر اُن کا اختتام ہو گیا۔

ابھی تک چھپی نہیں ہے، البتہ اس کا کچھ حصہ ماہنامہ "نظام" کان پور میں بالاقساط شائع ہوا ہے۔

فراغت کے بعد شوال ۱۳۳۳ھ میں مظاہر علوم میں مدرس مقرر ہوئے، اور بڑی کامیابی اور ناموری کے ساتھ درس وتدریس کے فرائض انجام دیئے، ۱۳۴۴ھ میں حضرت مولانا خلیل احمدؒ نے مدینہ منورہ ہجرت کرنے کا قصد فرمایا تو اُن ہی کا مظاہر علوم میں اپنی جگہ پر صدارتِ تدریس کے لئے انتخاب کیا تھا، اُن کے تلامذہ کی تعداد ہند اور بیرونِ ہند میں ہزاروں تک پہنچی ہوئی ہے، ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد وطن واپس چلے گئے تھے، وہاں ٹنڈو اللہ یار، ملتان، جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک وغیرہ کی بڑی بڑی درس گاہوں میں شیخ الحدیث رہے۔ تقریباً پچاس برس علوم دینیہ اور حدیث کے درس وتدریس میں گزارے۔

حضرت تھانویؒ سے بیعت وخلافت کا شرف حاصل تھا، درس وتدریس کے ساتھ ارشاد وسلوک میں بھی خاص مقام رکھتے تھے، بہت سے لوگوں نے ان سے سلوک وطریقت کی منزلیں طے کیں۔

۱۷ رجمادی الآخر ۱۳۸۶ھ / ۱۹۶۶ء کو اپنے وطن میں رہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔

مولانا خیر محمد جالندھریؒ

پنجاب میں جالندھر کے رہنے والے تھے، ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۵ء سالِ پیدائش ہے، وطن اور مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی میں تعلیم پائی، حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ سے بریلی میں حدیث کی تکمیل کی، مگر ہمیشہ دارالعلوم سے وابستہ رہے، جالندھر میں اپنی جدوجہد سے ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۲ء میں خیر المدارس جاری کیا، حضرت تھانویؒ کے خلیفۂ مجاز تھے، علم وفضل زہد وتقویٰ اور دین ودیانت کی اعلیٰ صلاحیتیں اُن کی ذات میں بدرجۂ اتم جمع تھیں، ہزاروں لوگ اُنکے درس اور رُشد وہدایت سے فیض یاب ہوئے، دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ایک مدت

تک رکن رہے۔

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے زمانے میں جالندھر سے ملتان چلے گئے، اور وہاں خیر المدارس کو از سرِ نو جاری کیا جو اب پاکستان کی ایک بڑی دینی درس گاہ ہے۔

مولانا کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے پاکستان کے مدارس دینیہ کا وفاق بنام وفاق المدارس قائم فرمایا اور تمام مدارس کو ایک لڑی میں منسلک کر دیا مولانا ہی اُس کے صدر تسلیم کئے گئے، جس کو اُنھوں نے کمال دیانت و راست بازی اور اخلاص و صدق سے انجام دیا، اس سے جہاں اُن کا علم و فضل ملک پر واضح ہوا وہیں کمالِ ذہن و ذکار بھی نمایاں ہوا، آج مدرسہ خیر المدارس پاکستان کے مرکزی مدارس میں شمار ہوتا ہے اور کتاب و سنت اور فقہ فی الدین کی اشاعت میں امتیازی شان رکھتا ہے۔

۲۰ر شعبان سنہ ۱۳۹۰ھ کو ملتان میں وفات پائی۔

مولانا شمس الحق افغانی

ضلع پشاور کے قصبہ ترنگ زئی کے ایک علمی خاندان میں ۱۳۱۸ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی، پھر صوبہ سرحد اور افغانستان کے مختلف علماء کی خدمت میں رہ کر علوم معقول و منقول کی تکمیل کر کے کامل دست گاہ حاصل کی، بعد ازاں دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۹ھ میں دورۂ حدیث سے فارغ التحصیل ہوئے۔

مولانا افغانی زمانۂ طالب علمی ہی میں اپنے علمی شغف اور ذہانت و ذکاوت میں اپنے معاصرین میں ممتاز تھے دار العلوم سے فراغت کے بعد پنجاب سرحد اور سندھ کے مختلف مدارس، مدرسہ دار الرشاد لاڑکانہ سندھ مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی، مدرسہ دار الفیوض سندھ اور مدرسہ قاسم العلوم لاہور وغیرہ میں برسوں درس و تدریس میں مشغول رہے، تفسیر و حدیث کے علاوہ معقولات میں بھی اُنھیں رسنگاہ کامل حاصل ہے، سلسلۂ نقشبندیہ میں مجاز بیعت ہیں۔

۱۳۵۴ھ میں اُنھیں دار العلوم میں بلایا گیا، یہاں ترجمہ قرآن اور تفسیر و حدیث کے اسباق دیئے گئے، ۱۳۵۸ھ میں اُنھیں

ریاست قلات کا وزیر تعلیم مقرر کیا گیا، کچھ مدت کے بعد وہ وزارت سے مستعفی ہو کر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل چلے گئے، وہاں صدر مدرس بنائے گئے، ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد اپنے وطن پاکستان چلے گئے، وہاں جامعہ اسلامیہ بھاولپور میں شعبۂ تفسیر کے صدر مقرر ہوئے، جامعہ اسلامیہ سے سبکدوش ہو کر اب وطن میں مقیم ہیں، مولانا افغانی کی اُردو تقریر و تحریر نہایت صاف اور شگفتہ ہوتی ہے، وہ جیّد عالم ہونیکے ساتھ ساتھ ایک اچھے مصنف بھی ہیں، انکی تصانیف میں معین القضاۃ والمفتی عربی زبان میں ہے، شرعی ضابطہ دیوانی، علوم القرآن، ترقی اور اسلام، سوشلزم اور اسلام، اسلام دینِ فطرت ہے، اسلام عالمگیر مذہب ہے، احکام القرآن، مفردات القرآن وغیرہ ان کی اہم تصنیفیں ہیں شرعی ضابطہ دیوانی میں فقہ کے تمام دیوانی قوانین کو قانونی دفعات کی صورت میں مرتب کیا ہے، یہ کتابیں اہلِ علم و دانش میں بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اس وقت دنیائے اسلام میں علم حدیث کے بلند پایہ عالم تسلیم کئے جاتے ہیں، اُن کی پیدائش تقریباً ۱۳۱۴ھ کی ہے، ابتدائی عربی تعلیم اپنے وطن مئو (ضلع اعظم گڑھ) کے مشہور مدرسہ دارالعلوم میں ہوئی، پھر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مشہور شاگردِ رشید حضرت مولانا عبدالغفار صاحب سے گورکھپور اور بنارس میں رہ کر متوسطات تک تعلیم حاصل کی، اسی کے ساتھ علوم شرقیہ کے مختلف عربی کے امتحانوں میں شریک ہوکر کامیابی حاصل کی، فاضل ادب کا امتحان الہ آباد سے پاس کر کے ۱۳۳۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں مدرس مقرر ہوئے، ۱۳۳۹ھ کے اوائل تک مظہر العلوم بنارس میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، ۱۳۳۹ھ کے اواخر میں دوبارہ دارالعلوم دیوبند کے دورۂ حدیث میں شرکت کر کے سماعت کی۔

۱۳۴۹ھ میں دارالعلوم مئو میں آپ کا تقرر بحیثیت صدر مدرس ہو گیا، جہاں آپ دو سال تک دورۂ حدیث اور فنون کی دوسری اونچی کتابیں پڑھاتے رہے دارالعلوم مئو سے علیحدہ ہو کر پھر بحیثیت صدر مدرس مظہر العلوم بنارس آگئے۔ یہاں کئی سال اُنھوں نے درس و تدریس کی خدمت انجام دی، وہاں سے دوبارہ ۱۳۴۷ھ میں پھر اپنے وطن مئو آگئے، یہاں اُن کو مفتاح العلوم مئو کا شیخ الحدیث اور صدر مدرس بنا دیا گیا، ۱۳۶۹ھ تک وہ مفتاح العلوم مئو کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس رہے، آخر میں تصنیفی شغف کی وجہ سے آپ نے مفتاح العلوم سے علیحدگی اختیار کرلی، البتہ بحیثیت سرپرست نگرانی فرماتے ہیں، آپ دینی علوم کی بڑی گراں قدر خدمت انجام دے رہے ہیں، اور ساتھ ہی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی برابر قائم ہے، بہت سے علمار کو آپ سے تلمذ کا شرف حاصل ہے۔

آپ کی عربی اور اُردو تصانیف کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ استدراک و تعلیق شرح مسند امام احمد بن حنبلؒ

۲۔ تعلیق و تحقیق سننِ سعید بن منصورؒ (۲ جلد)

۳۔ تحقیق و تعلیق مُسندِ حُمیدی (۲ جلد)

۴۔ تحقیق و تعلیق کتاب الزُہد والرقاق لعبداللہ بن مُبارکؒ

۵۔ تحقیق و تعلیق المطالب العالیہ (۴ جلدوں میں)

۶۔ تحقیق و تعلیق مختصر کتاب الترغیب والترہیب لابن حجر عسقلانی

۷۔ تعلیق و تحقیق مصنف عبدالرزاق گیارہ ضخیم جلدوں میں، یہ سب عربی میں لکھی گئی ہیں، اُردو کی کتابیں یہ ہیں:۔

(۸) نصرۃ الحدیث (۹) الاعلام المرفوعہ (۱۰) الازہار المربوعہ (۱۱) اہلِ دل کی دل آویز باتیں (۱۲) ارشاد الثقلین (۱۳) شارع حقیقی (۱۴) التنقید السدید

علیٰ التفسیر الجدید (۱۵) تحقیق اہلِ حدیث (۱۶) رہبرِ حجّاج (۱۷) احکام اللہ لاولیاً اللہ (۱۸) ابطال عزاداری (۱۹) اعیان الحجاج بست رکعاتِ تراویح اور بھی متعدد تصانیف ہیں جو ابھی طبع نہیں ہوئی ہیں۔

اس وقت فنِ حدیث رجالِ حدیث اور متعلقاتِ حدیث میں آپ کا ایک امتیازی مقام ہے جس کو اہلِ علم تسلیم کرتے ہیں۔

کئی سال سے حکومت کویت کی خواہش ہے کہ آپ وہاں آجائیں مگر اپنے علمی مشاغل کی وجہ سے نہیں جا سکے، جامعہ ازہر قاہرہ کے شیخ الجامعہ کا تقاضہ بھی ہے کہ آپ مصر تشریف لائیں۔

۱۳۷۳ھ سے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں۔

مولانا ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی

۱۸۹۷ء / ۱۳۱۵ھ میں کاکوری نواح لکھنؤ کی مردم خیز سرزمین میں ولادت ہوئی، بچپن میں اپنے نانا حضرت محسن کاکوروی کے پاس مین پوری میں رہ کر ابتدائی تعلیم کے مراحل طے کئے، پھر اُن کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل کر دیا گیا، ۱۳۳۰ھ میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم کی ترغیب سے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ "دارالعلوم میں اپنے اساتذہ کی درسی تقریریں اب تک میرے کانوں اور آنکھوں میں محفوظ ہیں" دارالعلوم کے زمانۂ طالب علمی میں مولانا تاجور نجیب آبادی کی صحبت میں شعر گوئی کا ذوق پیدا ہوا، اُس زمانے میں دیوان کے محلے میں مشاعرے ہوا کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب اُس زمانے میں چشمہ لگاتے تھے، اُسی زمانے کا اُن کا ایک شعر یہ ہے ؎

ایمان کی کہتا ہوں، مجھے شوق نہیں ہے ✽ عینک کے لگانے کا سبب ضعفِ بصر ہے

اس زمانے میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی صحبت میں نثر نگاری کا شوق ہوا، ۱۳۳۳ھ؁ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر دارالعلوم میں بلا معاوضہ معین المدرس رہے، پھر مدرسہ امدادیہ مرادآباد میں کچھ دنوں پڑھا کر لکھنؤ چلے گئے، پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کیا، اٹاوہ مسلم ہائی اسکول میں دینیات کے معلم اور بعد ازاں بنارس کے کالج میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے، پھر اگست ۱۹۲۳ء؁ ۱۳۴۲ھ؁ میں لکھنؤ کے کالج میں تقرر ہوگیا، دورانِ ملازمت ۱۹۳۴ء؁ ۱۳۵۳ھ؁ میں، فارسی میں ایم۔ اے کیا، ۱۹۴۴ء؁ ۱۳۶۳ھ؁ میں ملک شاہ سلجوقی اور اس کے عہد پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۶۰ء؁ ۱۳۸۰ھ؁ میں اُنھیں صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے ہندوستان میں عربی کی ممتاز شخصیت کے عنوان سے سندِ اعزاز (CERTIFICATE OF HONOUR) دی گئی ۱۹۶۲ء؁ ۱۳۸۲ھ؁ میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے پر آپ کو ریسرچ پروفیسر مقرر کیا گیا جس پر اب تک فائز ہیں۔

ڈاکٹر صاحب تین درجن سے زیادہ عربی، فارسی اور اُردو زبان کی کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں سے اُن کی کئی کتابیں اسکولوں اور کالجوں کے نصاب اور السنۂ شرقیہ کے امتحانات میں شامل ہیں، اُن کی ۱۵ کتابیں طبع ہو چکی ہیں، ۲۳ کتابیں ہنوز طبع نہیں ہوئیں۔

۱۳۷۰ھ؁ سے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں۔

عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری کا ذوق بھی ہے، اشعار کا ایک بہت بڑا ذخیرہ آپ کے ذہن میں محفوظ ہے، مجلس میں اگر شعر و شاعری کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو مسلسل اشعار یادداشت سے سناتے ہوئے تھکتے نہیں ہیں۔

مولانا شاہ وصی اللہ اعظمیؒ

اپنے وطن موضع فتح پور تال نرجا ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، قرآن شریف وطن

ہی میں حافظ ولی محمدؒ سے حفظ کیا، پھر مدرسہ جامع العلوم کانپور میں فارسی اور ابتدائی عربی کی کتابیں پڑھیں، بعدازاں دارالعلوم میں داخل ہوکر ۱۳۳۵ھ میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کی صدارتِ تدریس کا یہ ابتدائی زمانہ تھا، آپ کا حافظہ بہت قوی تھا، تمام علوم مستحضر رہتے تھے۔

دارالعلوم سے فراغتِ تعلیم کے بعد حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے، اور بالکلیہ وہیں کے ہو رہے، دورانِ تعلیم ہی میں اصلاحِ اعمال اور ذوقِ عبادت سے سرشار تھے، زمانۂ طالب علمی ہی سے خلوت نشینی کے عادی تھے، خانقاہ امدادیہ میں وہ اپنے قیام کے زمانے میں منقطع عن الخلق رہے، اور متوکل علی اللہ ہوکر سیرِ سلوک اور تحصیلِ نسبت میں اپنے آپ کو غرق کر دیا، اور بہت جلد تربیتِ باطنی اور تصوف کے مراحل طے کرکے خلعتِ خلافتِ واجازت اور بیعت و تلقین سے آراستہ و پیراستہ ہوگئے، سالہا سال کے بعد بحکم حضرت حکیم الامت ۱۳۴۳ھ میں نکاح کیا، لیکن اس کے باوجود آپ کا قیام زیادہ تر خانقاہ امدادیہ ہی میں رہا۔

۱۳۵۱ھ میں وطنِ مالوف پہونچکر تعلیم و تربیت واصلاحِ خلق میں مشغول ہوگئے اُن کا شمار حضرت تھانویؒ کے اجلۂ خلفا میں تھا، اُن کا طرزِ اصلاح و تربیت ہو بہو اپنے مرشد کے طرز پر تھا۔

اوّلاً وطن میں قیام رہا پھر ۱۳۶۴ھ میں گورکھپور چلے گئے، اور آخر میں الٰہ آباد قیام فرمایا وہاں خانقاہ تعمیر کرائی، بڑے بڑے علماء اور صاحبِ جاہ و ثروت اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے، اور ہزاروں بندگانِ خدا نے ان سے روحانی فیض حاصل کیا، الٰہ آباد کے زمانۂ قیام میں اُنھوں نے اپنے طریقِ مشائخ پر احیاءِ سنّت کی زبردست خدمات انجام دیں اس دورِ آخر میں ان کی ذاتِ گرامی مغتنمات میں سے تھی۔ آخر کے چند سال میں بمبئی آمد و رفت رہی وہاں مُریدین کا ایک حلقہ قائم ہوگیا اور کتنے ہی لوگ مسلکِ صالح پر مستقیم ہوگئے۔

۲۲؍شعبان ۱۳۸۷ھ میں سفرِ حجاز کے دوران جہاز میں وفات پائی اور یہ مسافرِ حجاز ربِ کعبہ کے حضور میں حاضر ہو گیا، بحرِ احمر کی آغوش میں اُن کو سپردِ آب کیا گیا۔

آخر عمر میں وفورِ کیفیت کے موقع پر مرزا غالب کا یہ شعر اکثر وردِ زبان رہتا تھا ؎

ہوئے ہم جو مر کے رُسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کہیں جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

غالباً ایسے ہی موقعوں کے لئے کہا جاتا ہے کہ "قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید!"

مندرجہ ذیل کتابیں اُنکی تصنیفی یادگار ہیں :-

۱	الافادات الوصیتہ	۱۴	خمخانۂ باطن
۲	تلاوت قرآن	۱۵	ملفوظ طریقِ کار
۳	تعلیم و تربیتِ اولاد	۱۶	راہِ صفا
۴	التذکیر بالقرآن	۱۷	طریقۂ اصلاح
۵	تصوف و نسبت صوفیہ	۱۸	اصلاحی مضمون
۶	وصیتہ الاحسان	۱۹	مضمون تمیمہ
۷	وصیتہ الاخلاق	۲۰	اخوت
۸	وصیتہ الاخلاص	۲۱	توقیر العلماء
۹	گلستانِ معرفت	۲۲	تحذیر العلماء
۱۰	دیباچہ معرفت	۲۳	جنّت
۱۱	عاقبۃ الانکار مع تلاش مرشد	۲۴	نعم الامیر
۱۲	مفتاح الرحمۃ	۲۵	الاصول النادرہ
۱۳	اعتقاد و انکار	۲۶	الامر الفارق بین المخلص المنافق

۲۷ النعم علی خیر الامم

۲۸ النصیحۃ للمسترشدین

۲۹ وصیۃ السالکین

مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ

۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے، حضرت گنگوہیؒ نے محمد شفیع نام تجویز فرمایا، اصلاً دیوبند کے رہنے والے تھے، دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی، ۱۳۳۶ھ میں ۲۲ سال کی عمر میں تعلیم سے فراغت حاصل کی، بعدازاں ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم میں درجہ ابتدائی کے مدرس مقرر ہوئے اور بہت جلد تدریسی ترقی کی منزلیں طے کر کے طبقۂ علیار کے اساتذہ میں شامل ہو گئے، فقہ اور ادب سے شروع ہی سے مناسبت رہی ۱۳۵۰ھ / ۱۹۲۲ء میں منصبِ افتار پر فائز ہوئے، ۱۳۶۸ھ / ۱۹۴۹ء میں پاکستان چلے گئے، وہاں دستور ساز اسمبلی کے بورڈ آف تعلیماتِ اسلام کے رکن کی حیثیت سے اسلامی دستور کی ترتیب میں مدد دی، ۱۹۵۱ء میں کراچی میں دارالعلوم کے نام سے ایک دینی درس گاہ قائم کی جو اس وقت کراچی میں علوم اسلامیہ کا ایک اہم اور بڑا مرکز ہے۔

مفتی صاحب کا علم وسیع اور گہرا تھا، وہ جماعتِ دیوبند کے ممتاز علمار میں سے تھے اور تقریباً تمام متداول دینی علوم میں عمدہ صلاحیت کے مالک تھے، وہ بہت سی دینی کتابوں کے مصنف ہیں، شروع ہی سے تصنیف و تالیف سے دلچسپی تھی، تفسیر، حدیث، فقہ اور مناظرے میں نہایت مفید تصانیف کا ذخیرہ اُن کے قلم سے نکلا ہے اُن کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد دو سو کے قریب ہے، صرف فقہ میں ان کی تصانیف کی تعداد ۹۵ ہے، فقہ میں عصر حاضر کے مسائل کو انھوں نے خاص طور پر موضوع بحث بنایا ہے، جو عوام و خواص دونوں کے لئے علوم و معارف کا بیش بہا سرمایہ ہیں، اُن کے فتاویٰ کی تعداد ۲ لاکھ بتائی جاتی ہے،

ایک زمانے میں ریڈیو پاکستان سے ہر ہفتہ اُن کی تفسیر معارف القرآن کے اجزاء نشر کئے جاتے تھے، جن کو عام طور پر پسند کیا جاتا تھا، یہ تفسیر معارف القرآن کے نام سے ۸ جلدوں میں شائع ہوچکی ہے، تفسیر معارف القرآن مفتی صاحب کا عظیم کارنامہ ہے، آپ کے سیکڑوں شاگرد و تلامذہ برِصغیر کے علاوہ مختلف ممالک میں دینی خدمات انجام دے رہے ہیں، ابتداءً حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوئے، حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد حضرت مولانا تھانویؒ سے رجوع کیا، اور حضرت مرشدِ تھانویؒ سے خلافت حاصل کی، حضرت تھانویؒ کو مفتی صاحب کے علم و فضل پر بڑا اعتماد تھا، اُن کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اسلاف کا ذوق ان میں پوری طرح رچا اور بسا ہوا تھا، وہ ہر ہر جزئی میں بزرگوں کے اتباع کو ضروری سمجھتے تھے؛ اور دینی علوم کی تدریس و تصنیف کے ساتھ افاضۂ باطنی میں بھی مصروف ہوگئے، شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا، عربی، فارسی اور اُردو میں قصائد، مرثیوں اور متعدد نظموں کا مجموعہ چھپ کر شائع ہوچکا ہے، پاکستان میں ان کو مفتیٔ اعظم کی حیثیت حاصل تھی، اور اسی لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

۱۱ر شوال ۱۳۹۶ھ (۶ر اکتوبر ۱۹۷۶ء) کی شب میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

"فقیہہ الامت جناب الحاج مولانا مفتی محمد شفیع" سے سن وفات ۱۹۷۶ء نکلتا ہے۔

مولانا مفتی اسمٰعیل بسم اللہؒ

۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۸ء میں ڈابھیل ضلع سورت میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے وطن اور قریبی قصبہ کٹھور میں پائی، پھر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، دورانِ تعلیم میں شادی کی وجہ سے وطن چلے گئے، بعد ازاں مدرسہ امینیہ دہلی میں رہ کر حضرت مولانا کفایت اللہ دہلویؒ سے فتوٰی نویسی کی مشق کی، ۱۳۳۶ھ میں دوبارہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوکر دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصے تک وطن میں تدریسی خدمات انجام دیں، پھر جوہانسبرگ (جنوبی افریقہ) چلے گئے، مگر جلد ہی وہاں سے واپس آکر مدرسہ تعلیم الدین (موجودہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل) میں مدرس مقرر ہو گئے، ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء میں برما میں مفتی بنائے گئے، وہاں فتویٰ نویسی کے علاوہ اُنھوں نے مولانا احمد اشرف راندیری کی معیت میں جمعیۃ العلماء برما قائم کی، اور کئی دینی مدرسے مختلف مقامات میں جاری کئے، اس طرح اُنھیں برما کے مسلمانوں کی دینی اور سیاسی خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔

۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء میں صحت کی خرابی کے باعث وطن واپس آ گئے، وہاں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تعلیمی اُمور کے نگراں بنائے گئے اور پھر جلد ہی مہتمم مقرر ہو گئے، گجرات میں اُن کی ذات مرجع خلائق تھی، گجرات کے نہ صرف عوام بلکہ علماء میں بھی آپ کے فتاویٰ کو قدر و منزلت حاصل تھی، اُن کے فتاویٰ تینتیس سال کے قریب گجرات کے ہفتہ وار اخبار "مسلم گجرات" میں شائع ہوتے رہے ہیں، ان فتاویٰ کی تین جلدیں گجراتی زبان میں شائع ہو چکی ہیں، انکے فتاویٰ کی تعداد ۳۵ ہزار بتائی جاتی ہے، ان میں کچھ فتاویٰ اُردو زبان میں بھی ہیں، مفتی بسم اللہ صاحب مرنجان مرنج، سادگی پسند اور اوراد و وظائف اور معمولات کے پابند تھے، روزانہ قرآن شریف کی ایک منزل تلاوت کا معمول تھا، ۱۳۷۹ھ/۱۹۵۹ء میں وفات پائی۔

مولانا سیّد میرک شاہ کشمیریؒ

ان کا وطن کشمیر ہے، ۱۳۳۶ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے حضرت علامہ سیّد محمد انور شاہ کشمیریؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے، منقولات و معقولات میں ذی استعداد عالم تھے، دارالعلوم سے فراغت کے بعد دربھنگہ اور مرادآباد کے مختلف مدارس میں درس و تدریس کی خدمت انجام دی، ۱۳۴۱ھ میں اُن کو دارالعلوم میں مدرس بنایا گیا، تدریس کے علاوہ شدھی و سنگھٹن کی تحریک کے موقع پر اُن کو دارالعلوم کی جانب سے آگرہ کے ملکانہ

ملکانہ[1] راجپوتوں میں تبلیغ کے لئے مامور کیا گیا، اس زمانہ میں دارالعلوم کی جانب سے آگرہ کے قرب وجوار میں جو مبلّغ بھیجے گئے تھے وہ اُنہی کی نگرانی میں کام کرتے تھے، اُنھوں نے بڑی محنت اور تن دہی کے ساتھ کام کیا، ۱۳۴۴ھ کے اواخر میں وہ لاہور چلے گئے، اور وہاں اورنٹیل کالج کے شعبۂ تدریس سے وابستہ ہو گئے تھے، آخر میں جامعۂ مدینہ لاہور کے صدر مدرس رہے، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے لئے صدر الدین شیرازی کی کتاب اسفار اربعہ کی چوتھی جلد کا ترجمہ کیا۔

ابھی چند سال ہوئے لاہور میں راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔

مولانا قاری محمّد طیّب صاحبؒ

حضرت نانوتویؒ کے پوتے ہیں، ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے تاریخی نام "مظفرالدین" ہے، ۷ سال کی عمر میں دارالعلوم میں داخل کیا گیا دو سال کی قلیل ترین مدّت میں قرآن مجید قرأت و تجوید کے ساتھ حفظ کیا، پانچ سال فارسی اور ریاضی کے درجات میں تعلیم حاصل کر کے عربی کا نصاب شروع کیا، جس سے ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۸ء میں فراغت اور سندِ فضیلت حاصل کی، دورانِ تعلیم میں آپ کی آبائی نسبت کے سبب سے اساتذہ نے اعلیٰ پیمانے اور مخصوص طریق پر تعلیم و تربیت میں حصہ لیا حدیث کی خصوصی سند آپ کو وقت کے مشاہیر علماء و اساتذہ سے حاصل ہوئی، علامۃ العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ علم حدیث میں آپ کے خاص اُستاذ ہیں، ۱۳۳۹ھ میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے بیعت کی، حضرت کی وفات کے بعد مولانا انور شاہ رحمہ اللہ کی طرف رجوع کیا اور تربیت حاصل کی اور ۱۳۵۰ھ میں حضرت تھانویؒ نے خلافت سے سرفراز فرمایا۔

---

[1] تفصیل کیلئے دیکھئے دارالعلوم دیوبند کی تحفظِ دین کی مساعی باب دوم

تکمیل کے بعد آپ نے دار العلوم میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، ذاتی علم وفضل، ذہانت وذکاوت اور آبائی نسبت و وجاہت کے باعث بہت جلد طلبار کے حلقے میں آپ کے ساتھ گرویدگی پیدا ہوگئی، اوائل ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۴ء میں نائب مہتمم کے منصب پر آپ کا تقرر کیا گیا، جس پر اوائل ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء تک آپ اپنے والد ماجد اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کی زیر نگرانی ادارۂ اہتمام کے انتظامی معاملات میں حصّہ لیتے رہے، وسط ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے انتقال کے بعد آپ کو مہتمم بنا دیا گیا دار العلوم نے آپ کے زمانۂ اہتمام میں نمایاں ترقی حاصل کی ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء میں جب آپ نے انتظامِ دار العلوم کی باگ ڈور ہاتھ میں لی تو اس کے انتظامی شعبے آٹھ تھے، جن کی تعداد اب چوبیس تک پہنچ چکی ہے، اُس وقت دار العلوم کی آمدنی کا بجٹ ۵۰۲۶۲ روپے سالانہ تھا، آپ کے زمانے میں ۲۶ لاکھ تک پہنچ گیا ہے، ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء میں دار العلوم کے عملے میں ۴۵ افراد تھے، اور اب ان کی تعداد پونے دو سو تک پہنچ چکی ہے، اُس وقت اساتذہ کی تعداد ۱۸ تھی اور اب ۵۹ ہے طلبار کی تعداد ۴۸۰ تھی اور اب ڈیڑھ ہزار سے زائد ہے، اسی طرح عمارتوں میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے، دار التفسیر، دار الافتاء، دار القرآن، مطبخ جدید، فوقانی دار الحدیث بالائی مسجد، باب الظاہر، جامعۂ طبیہ، جدید دو منزلہ دار الاقامہ، مہمان خانہ، کتب خانہ کے دو جدید ہال وغیرہ جیسی عظیم الشان عمارتوں کی تعمیر و تکمیل ممدوح ہی کے دورِ اہتمام کی یادگاریں ہیں

علمی سلسلے میں درس و تدریس کے علاوہ وعظ اور خطابت و تقریر میں آپ کو خداداد ملکہ اور قوتِ بیان حاصل ہے اور زمانۂ طالب علمی ہی سے آپ کی تقریریں پبلک جلسوں میں شوق کے ساتھ سنی جاتی ہیں، اہم سے اہم مسائل پر دو، دو، تین، تین گھنٹے مسلسل تقریر کرنے میں آپ کو کوئی رکاوٹ اور تکلّف نہیں ہوتا، حقائق اور اسرارِ شریعت کے بیان اور ایجازِ مضامین میں آپ کو خاص قدرت حاصل ہے، جدید تعلیم یافتہ طبقہ آپ کے علمی اور حکیمانہ اُسلوبِ بیان

سے خاص طور پر محظوظ ہوتا ہے، مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دوسری یونیورسٹیوں میں آپکی تقریریں خاص طور پر مقبول ہیں، اور بعض معرکتہ الآرا تقریریں مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے شائع ہوچکی ہیں، ملک کا کوئی صوبہ اور خِطہ ایسا نہیں جس میں آپ کی تقریروں کی گونج نہ پہونچی ہو۔

بیرونی ممالک میں افغانستان، برما، جنوبی افریقہ، مشرقی افریقہ، زنجبار، کینیا روڈیشیا، ری یونین، عدن، کویت، حجاز، مڈغاسکر، حبش (اتھوپیا) مصر، انگلینڈ، فرانس اور جرمنی وغیرہ ممالک کا دورہ فرما چکے ہیں، حضرت مولانا احمد سعید صاحب مرحوم ناظم جمعیۃ العلماء ہند کا اُن کے بارے میں مشہور مقولہ ہے کہ اب تک کے مہتممینِ دارالعلوم ثوابت تھے اور مولانا محمد طیب سیّارہ ہیں، ہر جگہ آپ کو سپاسنامے دیئے گئے اور لوگوں کو دارالعلوم سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس کے مسلک کی اشاعت ہوئی۔

دارالعلوم کے انتظامی امور کے علاوہ جن چیزوں سے آپ کو طبعی دلچسپی ہے وہ تعلیم وتدریس اور دعوت و تبلیغ ہیں، ان کمالات کی وجہ سے ملک میں آپ کو امتیازی مقام حاصل ہے، تفریحی ذوق مطالعہ کتب اور تصنیف وتالیف ہے، آپ کا یہ مشغلہ دارالعلوم کے انتظامی معاملات اور اوقاتِ درس وتدریس کے علاوہ ہمیشہ جاری رہتا ہے، بالخصوص دورانِ سفر کے فارغ اوقات اسی میں صرف ہوتے ہیں، زمانۂ قیام میں عصر سے مغرب تک مردانے میں عمومی مجلس کا معمول رہتا ہے، جس کا موضوع عموماً علمی مذاکرے ہوتے ہیں، شاعری سے بھی مناسبت ہے، آپ کے کلام کا مجموعہ عرفانِ عارف کے نام سے شائع ہوچکا ہے جس میں اُردو، فارسی اور عربی کا کلام جمع کردیا گیا ہے۔

ان گوناگوں مصروفیتوں کے ساتھ بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی سفر اور حضر میں جاری رہتا ہے، آپ کے مُریدین کا حلقہ کافی وسیع ہے، جو ہند و بیرونِ ہند میں پھیلے ہوئے ہیں۔

تصانیف کا عدد سو کے قریب ہے، جو مختلف اسلامی موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔

ان میں سے پچاس ساٹھ شائع ہوچکی ہیں، اُن میں معروف ترین تصانیف سائنس اور اسلام التشبہ فی الاسلام، خاتم النبیین اسلام میں اخلاق کا نظام، فطری حکومت۔ اسلام اور مسیحی اقوام، حدیث کا قرآنی معیار، کلمۂ طیب وغیرہ ہیں۔

۱۳۳۶ھ سے ہر جمعہ کو جامع مسجد دیو بند میں تقریر کا معمول تھا جو تقریباً بیس بائیس برس تک جاری رہا، بعد میں کثرتِ اسفار کی وجہ سے متروک ہوگیا اور تقریریں ملک گیر ہوگئیں ۱۳۵۲ھ میں جبکہ شاہ ابن سعود مرحوم پر قاتلانہ حملہ ہوا، جس میں وہ بال بال بچ گئے، ہندوستان کے علماء وعمائدین کی طرف سے مُبارک باد کا جلسہ فندق مکہ میں منعقد کیا گیا، جس کا صدر مولانا محمد طیب صاحب کو بنایا گیا، علمائے ہندوستان کے وفد نے شاہ ابنِ سعود کو مُبارک باد پیش کی، اس موقع پر مولانا نے ہی عربی کی مختصر تقریر کے بعد جلسہ تبریک کی تجویز پڑھ کر سُنائی تھی۔

۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مُسلم پرسنل لا بورڈ بمبئی نے جس میں تمام فرقوں کے علماء اور تمام مؤثر تنظیموں کے سربراہ شریک تھے، آپ کو اپنا صدر منتخب کیا، اس سلسلے میں دو مرتبہ وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی نے آپ کو دعوت دے کر بلایا اور پرسنل لا کے موضوع پر گفتگو کی، بہرحال ملک وقوم میں آپ کا ایک خاص علمی وقار قائم ہے۔ کئی اکیڈیمیاں انکی تالیفات کی طباعت واشاعت کا کام انجام دے رہی ہیں، موتمرِ عالم اسلامی قاہرہ اور رابطہ عالم اسلامی مکّہ مکرمہ میں متعدد مرتبہ شریک ہوچکے ہیں۔

مولانا محمد چراغ گوجرانوالوی

۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے، زمانۂ طالب علمی میں اپنے جلیل القدر استاد حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ کی ترمذی شریف کی تقریر العرف الشذی مرتب کی، حدیث کے علاوہ دوسرے علوم پر بھی گہری نظر رکھتے تھے پہلے مولانا عبدالعزیزؒ

گوجرانوالہ کے مدرسہ میں صدر مدرس رہے، بعدازاں کچھ دوسرے حضرات کے تعاون سے اپنے وطن گوجرانوالہ ہی میں اپنا مدرسہ قائم کیا۔

مولانا چراغ محمد صاحب کی اُردو تحریریں بہت صاف ہوتی ہیں، آزادیٔ ہند کی تحریک میں سرگرمی سے شریک رہے، اور بار بار قید و بند کے مرحلوں سے گزرے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی رح

۱۳۱۸ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون میں ہوئی پھر مظاہر علوم میں پڑھا، اور دورۂ حدیث تک تعلیم حاصل کی مزید تعلیم کا شوق دارالعلوم میں لے آیا اور دوبارہ دورۂ حدیث میں داخلہ لیا، ۱۳۳۶ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔ صلاح و تقویٰ کے آثار شروع ہی سے نمایاں تھے، حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے ممتاز تلامذہ میں تھے، تفسیر وحدیث، کلام اور عربی ادب سے انھیں خاص شغف تھا، عربی اور فارسی میں برجستہ اشعار لکھنے کا انھیں اچھا ملکہ حاصل تھا، علم و فضل، زہد و تقویٰ اور اتباع سلف میں انکا بڑا مقام تھا، تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کے آثار نمایاں طور پر اُن کے چہرے سے محسوس ہوتے تھے، نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے، حق گوئی میں نہایت جری اور بے باک تھے، سچی بات بلاخوف لومۃ لائم برملا کہنے میں انھیں کبھی تأمل نہیں ہوتا تھا، اور اس میں کسی کی رورعایت نہیں کرتے تھے، علم و عمل میں سلفِ صالح کا نمونہ تھے، علم سے اُن کے اشتغال کا یہ عالم تھا کہ تمام علوم وفنون میں استحضار تام رکھتے تھے، ممتاز عالم دین اور بلند پایہ اربابِ تدریس میں ان کا شمار تھا، درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف سے بھی کافی دلچسپی تھی مشکوٰۃ شریف کی شرح التعلیق الصبیح کے نام سے اُنھوں نے آٹھ جلدوں میں لکھی ہے، ان میں سے پہلی چار جلدیں دمشق میں طبع ہوئی ہیں، علم حدیث میں ان کی ایک اور کتاب تحفۃ القاری فی حل مشکلات البخاری

بھی ہے، معارف القرآن کے نام سے انھوں نے کئی جلدوں میں قرآن شریف کی تفسیر لکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کی جملہ تصانیف کی تعداد سو کے قریب ہے، ہر وقت درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے، یہ ذوق یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ دنیوی ساز و سامان سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔

مقامات حریری پر عربی میں حاشیہ لکھا ہے، جو صاحب درس و تدریس علماء اور طلباء میں بہت مقبول اور مشہور ہے، علم عقائد میں عقائد الاسلام اور سیرت نبوی کے موضوع پر سیرت المصطفیٰ ان کی اہم تصانیف ہیں، عیسائیت اور قادیانیت کے رد و ابطال میں بھی انھوں نے کئی محققانہ کتابیں لکھی ہیں۔

مدرسہ امینیہ دہلی سے انھوں نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا، مگر چند ماہ کے بعد دارالعلوم نے ان کو کھینچ لیا، مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھانے کا موقع ملا۔ ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء سے ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء تک دارالعلوم میں مدرس رہے، پھر حیدرآباد چلے گئے اور دس بارہ سال تک وہاں مقیم رہ کر درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۳۵۸ھ میں انھیں دارالعلوم میں بلا لیا گیا اور تفسیر و حدیث کے اسباق ان کے سپرد کئے گئے ان کا درس تفسیر و حدیث اہلِ علم میں مقبول و مشہور تھا، اس طرح ۱۸ سال تک انھوں نے دارالعلوم میں مسندِ تدریس کو رونق بخشی، ۱۳۶۸ھ میں لاہور چلے گئے، وہاں جامعہ عباسیہ بھاول پور میں شیخ الجامعہ مقرر ہوئے، اور پھر ۱۹۵۲ء سے آخر تک جامعہ اشرفیہ میں بحیثیت شیخ الحدیث ۲۲ سال فرائضِ تدریس انجام دیتے رہے۔ لاہور میں ہر جمعہ کو اُن کا وعظ ہوتا تھا، جس میں بڑے ذوق و شوق سے لوگ شریک ہوا کرتے تھے، وہ پاکستان کے ممتاز اور بلند پایہ عالم سمجھے جاتے تھے۔

اپنے بعد اولاد کے علاوہ ایک بڑا کتب خانہ بھی چھوڑا۔

۷ رجب ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء کو لاہور میں وفات پائی، اور وہیں آسودۂ خواب ہیں

مولانا مفتی محمود احمد نانوتوی ؒ

نانوتہ کے صدیقی شیوخ سے تھے، ۱۴ر ذی الحجہ ۱۳۱۰ھ کو نانوتہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وطن میں پائی ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے، عمر کا بڑا حصہ مہو چھاؤنی (مالوہ) میں گزرا، وہیں دارالافتاء قائم کرکے مسلمانوں کی علمی اور دینی رہنمائی کی خدمت انجام دیتے رہے، مالوہ اور راجپوتانہ میں اُن کے فتاویٰ بڑی اہمیت رکھتے تھے، تفسیر، فقہ اور افتاء پر گہری دسترس تھی، اسی کے ساتھ سیاست اور قومی مسائل سے بھی پوری دلچسپی تھی، ان اطراف میں ان سے بڑا علمی فیض پہنچا، مفتیٔ مالوہ کے لقب سے مُلقب تھے، اپنی سادہ مزاجی کے لحاظ سے بڑی عظمتوں کے حامل تھے، مدھیہ پردیش میں ان کا وجود علم و ہدایت کا نشانِ راہ تھا۔

ان کی ایک کتاب سیر طیبہ سیرتِ نبوی کے موضوع پر ہے، اس کتاب میں اُنھوں نے سیرتِ نبوی کو ایسے عام فہم انداز سے لکھا ہے کہ کم استعداد کے لوگ بھی اس سے کماحقہٗ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، سیر طیبہ میں کم سے کم الفاظ میں سیرتِ نبوی کے زیادہ سے زیادہ گوشوں کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اسی کے ساتھ اس کتاب میں بعض ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جو دوسری کتابوں میں یکجا طور پر نہیں ملتیں۔

۱۳۷۳ھ سے تا دمِ آخر دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر رہے، ۱۴ر شوال ۱۳۸۸ھ (۴ر جنوری ۱۹۶۹ء) کو ۸۰ سال کی عمر میں وفات پائی، وہیں مہو میں آسودۂ خواب ہیں۔

مولانا غلام غوث ہزاروی

پاکستان میں ضلع ہزارہ کے رہنے والے ہیں ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل

ہوئے، دارالعلوم کے ذی استعداد اور ممتاز فضلار میں سے ہیں اور قادر الکلام خطیب ہیں، قادیانیت کے خلاف سرگرمی سے کام کیا ہے، ملک کی تحریکِ آزادی میں شریک رہے، اور قید و بند کی صعوبتوں سے گزرے، ملک کی تقسیم کے بعد جمعیۃ العلمائے پاکستان کے پہلے ناظم اور پھر صدر ہوئے۔ اپنی علمی شہرت کے بنار پر مؤتمر عالم اسلامی میں علمائے پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کر چکے ہیں، پاکستان کے ممتاز علمار میں اُن کا شمار ہے، پچھلے دنوں جمعیۃ العلمائے اسلام صوبۂ سرحد میں اپنی وزارت بھی بنا چکے ہیں، مولانا مفتی محمود صاحب جس کے وزیر اعلیٰ رہ چکے ہیں، اس وقت مشاہیرِ ملک میں اُن کا شمار ہے۔

مولانا اطہر علی بنگالی

وطن بنگال تھا، ۱۳۳۸ھ میں دارالعلوم سے فراغت پائی، حضرت تھانویؒ کے خلیفۂ مجاز تھے، تقسیم سے پہلے مشرقی پاکستان میں وسیع پیمانے پر علمی و تدریسی اور قومی خدمات انجام دیں، تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان میں جمعیۃ العلمائے اسلام کے صدر اور پاکستان اسمبلی کے ممبر رہے، بنگلہ دیش کے اکابر علماء میں اُن کا شمار تھا، آخر میں نظام اسلام پارٹی کی تشکیل کی، وزارتوں کے انقلاب اور بالخصوص بنگلہ دیش بننے کے سلسلے میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، بنگلہ دیش میں آپ کو خاص شہرت و امتیاز حاصل تھا، استقامت میں حق پرست علمار کا نمونہ تھے، کشور گنج میں انھوں نے بڑے پیمانے پر مدرسہ قائم کیا، یہ مدرسہ بنگال کا دارالعلوم دیوبند سمجھا جاتا ہے مولانا اطہر علی خود بھی مدرسہ میں درس دیتے تھے، دارالعلوم دیوبند کی طرح کشور گنج کے اس مدرسہ میں بھی ذریعۂ تعلیم اُردو زبان تھی۔

مولانا اطہر علی ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء میں سلہٹ میں پیدا ہوئے، مشرقی بنگال کے ایک معزز اور دین دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، ۹ر شوال ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء کو بمرض فالج وفات پائی۔

مولانا نجم الدین جہلمی

پنجاب میں جہلم کے رہنے والے تھے، ۱۳۳۶ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، عرصے تک اورنٹیل کالج لاہور میں عربی زبان کے استاذ رہے، پنجاب کے علمی حلقوں میں اُن کے علم وفضل اور نیکی اور تقوی کی بڑی شہرت تھی، عربی ادب کے ساتھ تفسیر و حدیث میں بھی دست گاہ رکھتے تھے، ۱۹۵۲ء میں وفات پائی۔

مولانا بدرعالم میرٹھیؒ

وطن میرٹھ تھا، ۱۳۱۶ھ ۱۸۹۸ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے، وہاں اُن کے والد ماجد حاجی ظہور علی مرحوم محکمۂ پولیس میں انسپکٹر تھے، ابتدائی تعلیم الہ آباد کے انگریزی اسکول میں پائی، دورانِ تعلیم حضرت تھانویؒ کا ایک وعظ سُننے کے بعد اُنھیں علوم دینیہ کی طرف توجہ ہوئی تو والد صاحب نے ۱۳۳۳ھ میں اُنھیں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب انبہٹویؒ کی خدمت میں سہارن پور بھیجدیا، مولانا بدرعالمؒ نے ۱۳۳۶ھ میں مظاہر علوم سے حدیث کی تکمیل کی اور پھر وہیں ۱۳۳۷ھ میں معین المدرس مقرر ہوگئے، مگر جلد ہی مدرسی چھوڑ کر مزید طلب علم کے لئے دارالعلوم دیوبند میں پہونچ گئے، اور یہاں دورۂ حدیث میں شریک ہوکر ۱۳۳۹ھ میں صحیح بخاری حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ سے پڑھی، اور پھر ۱۳۴۰ھ میں دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے اوائل ۱۳۴۴ھ میں اُنھیں معین المدرس مقرر کیا گیا، ۱۳۴۶ھ کے وسط میں وہ حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل چلے گئے، وہاں درس وتدریس کے ساتھ ساتھ پانچ سال تک حضرت شاہ صاحبؒ کے درس صحیح بخاری میں پورے التزام کے ساتھ شریک ہوتے رہے، ۱۷ سال تک جامعہ ڈابھیل میں علم حدیث کی تدریسی خدمات انجام دیں، آخر میں جامعہ کے صدر مدرس بنائے گئے، مگر

صحت کی خرابی کی وجہ سے ڈابھیل سے بھاول پور چلے گئے۔

جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل میں حضرت شاہ صاحب کی وفات کے بعد اُنھوں نے اپنے اُستاذ کے علوم و معارف کو فیض الباری علیٰ صحیح البخاری کے نام سے چار جلدوں میں مرتب کیا، جس میں اپنے استاذ علامہ کشمیریؒ کی نادر علمی تحقیقات اور تفردات کو پیش کر کے اُنھوں نے ایک عظیم الشان علمی کارنامہ انجام دیا ہے۔

۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء میں موصوف ندوۃ المصنفین دہلی سے وابستہ ہوگئے، جہاں آپ کو ترجمان السنّۃ کے نام سے اُردو زبان میں حدیث کی ایک جامع کتاب کی ترتیب کا کام سپرد ہوا، اُنھوں نے یہ کام بڑی شان سے شروع کیا چار جلدیں لکھ چکے تھے کہ حیاتِ مستعار کی مدت پوری ہوگئی۔

مولانا بدر عالمؒ نے اولاً حضرت مولانا خلیل احمد انبہٹویؒ سے شرفِ بیعت حاصل کیا، پھر حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کے دامنِ عقیدت کو تھاما، اور آخر میں حضرت مفتی صاحبؒ کے جانشین حضرت قاری محمد اسحٰق صاحب میرٹھیؒ سے وابستہ ہوگئے تھے، اور انھیں سے خلافت حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے، وہاں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اُن کو علوم اسلامیہ کا ایک دارالعلوم قائم کرنے کا کام سپرد فرمایا۔ چنانچہ اُنھوں نے بڑی محنت سے اس کا نظامِ عمل تیار کیا اور اس میں ماہرِ فن اساتذہ کو جمع کرنے میں کامیابی حاصل کی، مگر چند ہی سال کے بعد عشقِ نبوی کی کشش نے اُنھیں مدینہ منورہ کھینچ بلایا، ارضِ مقدس میں وہ پوری جمعیتِ خاطر کے ساتھ علمی و عملی مشاغل میں مصروف ہوگئے، قیام مدینہ کے دوران میں بکثرت افریقی حضرات اُن کے سلسلۂ بیعت میں داخل ہوئے اور ساؤتھ افریقہ میں اُن کا فیض کافی پھیلا، عابد و زاہد ذکی فقیہ فی الدین اور صاحبِ معرفت فاضل تھے، بالآخر طویل علالت کے بعد ۵ رجب المرجب ۱۳۸۵ھ کو جان جاں آفریں کے سپرد کر کے جنت البقیع میں آسودۂ خواب ہوگئے۔

فیض الباری اور ترجمان السنّۃ کے علاوہ اُنھوں نے کئی اور کتابیں جواہر الحکم

وغیرہ بھی لکھی ہیں، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی کتاب زُبدۃ المناسک جو حج کے مسائل پر مشہور کتاب ہے، خلاصۃ المناسک کے نام سے اُس کا خلاصہ کیا ہے۔

مولانا محمد یوسف شاہ کشمیریؒ میرواعظ

کشمیر کے معروف میرواعظ مولانا محمد یوسف شاہ کشمیریؒ ۴ ر شعبان ۱۳۱۳ھ کو کشمیر میں پیدا ہوئے۔ اُن کا خاندان کشمیر میں "میرواعظ خاندان" کہلاتا ہے، اور بڑی عظمت وعقیدت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، میرواعظ کا لقب اس خاندان میں کئی پشتوں سے چلا آرہا ہے۔

مولانا یوسف شاہ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد مولانا غلام رسول شاہ ثانی اور مولانا حسین دفائی سے حاصل کی، پھر دارالعلوم دیوبند میں چند سال رہ کر ۱۳۴۴ھ میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے۔

مولانا یوسف شاہ نے تعلیم سے فراغت کے بعد سری نگر میں ایک دینی درس گاہ اورنیٹل کالج کے نام سے قائم کی اس کالج کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانانِ کشمیر جو اَب تک حکومت کی بے توجہی سے جہالت کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے اُن کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور اس درس گاہ کے ذریعے سے معلّم، مدرس مبلّغ اور مساجد کی امامت وخطابت کے لئے لائق افراد تیار کئے جائیں، مولانا یوسف شاہ خود بھی اس کالج میں درس دیتے تھے، اس درس گاہ نے دینی علوم کی خاص خدمت انجام دی اورنٹیل کالج میں پنجاب یونیورسٹی کے عربی کے امتحانات کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔

مولانا موصوف دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ طالب علمی میں تحریکِ خلافت سے بہت متأثر تھے، اُنھوں نے کشمیر میں اورنٹیل کالج کے علاوہ عام لوگوں میں سیاسی شعور کو بیدار کرنے کے لئے ۱۹۲۵ء میں خلافت کمیٹی قائم کی۔ اُنکی یہی سیاسی جدوجہد آگے

چل کر مسلم مجلس میں تبدیل ہو گئی۔ اُنھوں نے کشمیر کے پس ماندہ مسلمانوں کی آواز کو مؤثر بنانے کے لئے "اسلام" کے نام سے ایک سہ روزہ پرچہ نکالا اور پھر دوسرا اخبار "رہنما" کے نام سے جاری کیا، اور اخباروں کے چھاپنے کے لئے پریس لگایا۔

۱۹۴۶ء میں برِ صغیر کی تقسیم سے قبل مولانا یوسف شاہ کسی ضرورت سے پاکستان گئے ہوتے تھے کہ اُسی دوران میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ وہ پھر وطن واپس نہ آسکے۔ کچھ عرصے کے بعد ان کو پاکستان کے زیرِ اثر کشمیر کے حصے میں قائم شدہ حکومت کا صدر بنایا گیا، قیام پاکستان کے زمانے میں اُنھوں نے قرآن شریف کا کشمیری زبان میں ترجمہ کیا، اور مختصر تفسیر لکھی، کشمیری زبان میں پورے قرآن شریف کا یہ پہلا ترجمہ اور تفسیر ہے، اسکی پہلی جلد شائع ہو چکی ہے جو سورۂ توبہ تک کے ترجمے اور تفسیر پر مشتمل ہے ترجمے کا رسم الخط نستعلیق ہے۔

میر واعظ جہاں علمی حیثیت سے اپنے ہم عصر علماء میں ممتاز تھے وہیں عملی زندگی میں عبادت و ریاضت اور صدقِ مقال کے لحاظ سے اُن کی زندگی اسلافِ کرام کا عمدہ نمونہ تھی، اہلِ کشمیر کی دینی اور سیاسی بیداری میں اُن کی مخلصانہ جدوجہد کا بڑا حصہ ہے۔

۱۶ رمضان ۱۳۸۹ھ (۷ر دسمبر ۱۹۶۸ء) کو روزے کی حالت میں عین افطار کے وقت راولپنڈی میں وفات پائی۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

حضرت مولانا حبیب الرحمٰنؒ کا خاندان اپنے علم و عمل کے لحاظ سے پنجاب میں مرجع خواص و عوام رہا ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد سے اس خاندان کے علماء ہر دور میں انگریزوں

کے خلاف صف آرا رہے ہیں، ملک کی آزادی کی جدوجہد میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے اور اس سلسلے میں ہر قسم کے مصائب کو انگیز کرتے رہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن ۱۱ر صفر ۱۳۱۰ھ (۳ر جولائی ۱۸۹۲ء) کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے، قرآن مجید اور اُردو کی تعلیم لدھیانہ کے مدرسہ میں پائی، پھر نکودر ضلع جالندھر اور امرتسر کے مدرسوں میں پڑھا، ۱۳۳۵ھ میں دارالعلوم میں داخلہ لیا، یہاں حضرت شاہ صاحبؒ کی صحبت میں اُنھیں فہم قرآن سے شغف پیدا ہوا، جو سیاسی مصروفیتوں کے باوجود ساری عمر جاری رہا۔

مزاج شروع ہی سے سیاست آشنا واقع ہوا تھا، ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء میں تحریکِ خلافت کے دَور میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے ساتھ تحریکِ خلافت کے جلسوں میں شرکت کرنے لگے، اسی زمانے میں امرتسر میں جلیاں والا باغ کا مشہور خونی واقعہ پیش آیا، جس نے ان کے جذبۂ حرّیت کو جھنجوڑ کر رکھدیا، ۱۹۲۱ء میں پہلی مرتبہ سول نافرمانی کے جرم میں گرفتار ہوئے، اور پھر ہندوستان کے آزاد ہونے تک قید و بند کا سلسلہ چلتا رہا۔

۱۹۲۹ء میں جب پنجاب میں مجلس احرار قائم ہوئی تو وہ اس میں شامل ہو گئے۔ اور کچھ ہی عرصے کے بعد اُنھیں مجلس احرار کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ مولانا لدھیانوی مختلف سیاسی تحریکوں میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے، وہ شروع ہی میں جمعیۃ العلماء ہند سے وابستہ ہو گئے تھے، اور ۱۹۵۰ء تک برابر جمعیۃ العلماء کے رکن رہے۔ ان کی پوری زندگی سیاسی مشاغل میں گزری۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد اُنھیں انتہائی مجبوری کے عالم میں لدھیانہ چھوڑنا پڑا اور پناہ گزینوں کے ساتھ لاہور چلے گئے، اور پھر وہاں سے دہلی آکر مستقل طور پر دہلی میں مقیم ہو گئے۔ اور عمر کے آخری دس سال اُن کے یہیں گزرے۔ اس مدت میں فرقہ وارانہ

اتحاد کے لئے وہ مسلسل جدوجہد کرتے رہے، مشرقی پنجاب میں مساجد اور اسلامی اوقاف کی واگزاری کی کوشش میں لگے رہے، مظلوموں اور ضرورت مندوں کی خدمت گزاری اُن کا عزیز ترین مشغلہ تھا۔

ابھی عمر کی چونسٹھ منزلیں ہی طے کرنے پائے تھے کہ ۱۱ صفر ۱۳۷۶ھ کو راہی ملکِ بقا ہوگئے، اُنھیں جامع مسجد شاہجہانی کے ملحقہ قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کے خلف الرشید ہیں ۱۳۱۹ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے، تاریخی نام "ظفر الحق ہے" ۹ سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا، شروع سے آخر تک دارالعلوم کے اساتذہ سے پڑھا، ۱۳۴۱ھ میں فارغ التحصیل ہوئے ۱۳۴۴ھ سے ۱۳۴۶ھ تک دارالعلوم میں معین المدرس رہے، اسی کے ساتھ افتاء کا کام بھی کرتے رہے، ۱۳۴۶ھ میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل چلے گئے، وہاں پانچ سال تک مفتی اور مدرس رہے، اور ۱۹۳۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک نمک سازی کے زمانے میں سیاسی دلچسپی کے باعث اپنے رفیق حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے مستعفی ہوگئے۔ اور پانچ سال تک کلکتہ میں تفسیر، افتاء اور تبلیغ کی خدمات انجام دیں۔ وہاں مفتی صاحب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی، اسی زمانے میں انھوں نے ندوۃ المصنفین کا خاکہ تیار کیا، ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء میں ان کی جدوجہد سے یہ ادارہ قرول باغ دہلی میں قائم ہوگیا، اس ادارے کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی علوم کی نشرواشاعت کی گراں قدر خدمات انجام دی جائیں، چنانچہ ندوۃ المصنفین سے اب تک ایک سو سے زیادہ گراں قدر کتابیں شائع ہوچکی ہیں، جو تفسیر وحدیث، تاریخ، لغت اخلاق اور سیاسیات کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ندوۃ المصنفین سے ایک بلند پایہ ماہنامہ

"برہان" بھی نکلتا ہے۔

حضرت مفتی صاحب شروع سے لے کر اب تک ندوۃ المصنفین کے ناظم اور روحِ رواں رہے ہیں، اُن کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کی قیامت خیز تباہی کے باوجود نہ صرف اس ادارہ کو زندہ رکھا بلکہ اپنی ہمتِ مردانہ سے اس میں از سرِ نو جان ڈالی اور اُجڑے ہوئے گلستان کو دوبارہ چمنستان بنا دیا۔

مفتی صاحب کا شمار ملک کے ممتاز اور بالغ نظر اربابِ علم و فضل میں ہے، بہت سے علمی اور دینی اداروں کے ممبر ہیں۔ عرصے سے مسلم یونیورسٹی کورٹ علی گڑھ کے ممبر بھی ہیں، جمعیۃ العلماء ہند کے کاموں میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ کے ہمیشہ دست راست رہے ہیں، اُن کے انتقال کے بعد جمعیۃ العلماء کے ورکنگ صدر بنائے گئے، آج کل مجلس مشاورت کے صدر ہیں، قومی اور ملّی کاموں سے اُنھیں ابتدا ہی سے تعلق رہا ہے۔

تحریر اور تقریر دونوں پر اُنھیں یکساں قدرت حاصل ہے، ندوۃ المصنفین اور قومی و ملّی کاموں کی مصروفیت کے باعث اگرچہ خود ان کی کوئی تصنیف سامنے نہیں آسکی، مگر ندوۃ المصنفین سے شائع ہونے والی کتابیں درحقیقت اُنھیں کے ذوقِ تصنیف اور حُسنِ تدبیر کی آئینہ دار ہیں، خودداری، آزادیٔ ضمیر، حرّیتِ نفس، معاملہ فہمی، نکتہ رسی اور فقہی دقیقہ سنجی اُن کے مخصوص اوصاف ہیں۔

۱۳۶۸ھ سے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں، مجلس میں اُن کی رائے کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

۱۳۱۸ھ میں اپنے وطن سیوہارہ ضلع بجنور کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے حفظ الرحمان (رحمان الف کے املاء کے ساتھ) اُن کا تاریخی نام ہے، ان کے والد ماجد

شمس الدین صاحب بھوپال اور پھر بیکانیر کی ریاستوں میں اسسٹینٹ انجینیر کے عہدے پر مامور تھے، مولانا کے دو بھائی اور تھے، والد ماجد نے ان دونوں کو انگریزی کی اعلیٰ تعلیم دلائی، دینی علوم کے حصول کی سعادت اپنے خاندان میں صرف اُن ہی کے حصے میں آئی انکی تعلیم زیادہ تر سیوہارہ کے مدرسہ فیض عام اور مدرسہ شاہی مراد آباد میں ہوئی، ۱۳۴۱ھ میں دارالعلوم میں داخل ہو کر صدرا اور شمس بازغہ وغیرہ فلسفہ کی انتہائی کتابیں پڑھیں اور ۱۳۴۲ھ میں دورۂ حدیث کی تحصیل سے فراغت حاصل کی۔

مدراس سے ایک مدرس کی طلب آنے پر دارالعلوم کی جانب سے اُن کو مدراس بھیجدیا گیا، وہاں پر یامیٹ میں ایک سال درس و تدریس اور تبلیغی کاموں میں گزارا، اس دوران میں ان کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا، اور دو کتابچے لکھے، جن کے نام ہیں:۔ "حفظ الرحمٰن لمذہب النعمان" اور "مالابار میں اسلام" اسی زمانے میں آپ حج و زیارت سے بہرہ ور ہوئے، حجاز سے واپسی پر آپ دارالعلوم میں آگئے اور ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں، بعدازاں حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل سے وابستہ ہوگئے، وہاں تقریباً پانچ سال تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔

۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۴ء میں آپ انجمن تبلیغ الاسلام کلکتہ کی دعوت پر جس کے سرپرست مولانا ابوالکلام آزاد تھے کلکتہ چلے گئے، وہاں پانچ سال تک درس قرآن کی خدمت انجام دی، اُنھوں نے وہاں جس دلنشیں انداز میں قرآن شریف کے مطالب و معارف کو لوگوں تک پہنچایا اس سے کلکتہ میں بہت جلد اُن کی عظمت قائم ہوگئی، کلکتہ میں اُن کی یہ مقبولیت آخر تک باقی رہی۔

۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء میں جب دہلی میں ندوۃ المصنفین کا قیام عمل میں آیا تو آپ اپنے دیرینہ رفیق حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے ساتھ دہلی چلے آئے۔

ندوۃ المصنفین میں اُنھوں نے بڑی گراں قدر تصنیفی خدمات انجام دیں، "اسلام کا اقتصادی نظام" "اخلاق اور فلسفہ اخلاق" اور "قصص القرآن" جیسی بلند پایہ اور محققانہ کتابیں لکھیں، ندوۃ المصنفین کے قیام سے پہلے وہ سیرتِ نبوی میں رسولِ کریم اور ۱۳۵۱ھ ۱۹۳۲ء میں دہلی کی ڈسٹرکٹ جیل میں بلاغِ مبین لکھ چکے تھے۔

۱۳۶۱ھ ۱۹۴۲ء میں آپ کو جمعیۃ العلماء ہند کا ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے علمی شغف کے ساتھ ساتھ اُنھیں سیاست کے خارزار سے بھی گہری دلچسپی تھی، چنانچہ اُن کی عمر کا بیشتر حصہ ملک و ملّت کی خدمت اور تحریکِ آزادی کی جدوجہد میں بسر ہوا، اور اس سلسلے میں متعدد بار قید و بند کے مرحلوں سے بھی گزرنا پڑا۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کے بعد ملک میں ہر طرف فسادات پھوٹ پڑے اور کشت و خون کا بازار گرم ہوگیا، اور جب دہلی میں بھی اس آگ کے شعلے پوری شدت سے بھڑک اٹھے تو مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، ایسے نازک حالات میں اُنھوں نے غیر معمولی جرأت و ہمّت اور پامردی سے اُس وقت کے سنگین ترین حالات کا مقابلہ کیا، لیڈروں کو جھنجوڑا اور حکام پر زور دے کر امن و امان کو بحال کرانے کا زبردست کارنامہ انجام دیا، خوف زدہ مسلمانوں کے دلوں سے خوف و ہراس دُور کیا، غرض کہ اُن کی اَن تھک جد و جہد سے مسلمانوں کے اُکھڑے ہوئے قدم پھر جم گئے، درحقیقت اُن کا یہ ایسا امتیازی اور زبردست کارنامہ ہے جو آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہے اُنھوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اُس کو تاریخ کبھی بھلا نہیں سکتی۔

اس زمانے میں جب دہلی میں ہر طرف کشت و خون اور لوٹ مار کی گرم بازاری تھی مولانا کے ہندو دوستوں نے اُن سے بڑے اصرار کے ساتھ کہا کہ شہر میں آپکی حفاظت

مشکل ہوگئی ہے، اس لئے ہماری درخواست ہے کہ آپ پناہ گزینوں کے حفاظتی کیمپ میں منتقل ہوجائیں، مگر اُنھوں نے بڑی جرأت اور سختی کے ساتھ کیمپ میں چلے جانے کے مشورے کو یہ کہکر ٹھکرادیا کہ "ہمارے لئے اس سے زیادہ شرم اور بزدلی کی کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ خود اپنے وطن میں ہم پناہ گزیں بن کر رہیں، بے شک یہ سخت آزمائش کا وقت ہے مگر ہمیں ڈٹ کر اس کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔"

مولانا حفظ الرحمٰن کی ان ہی خدمات سے متاثر ہوکر ملّت کی بارگاہ سے اُن کو "مجاہدِ ملّت" کے لقب سے نوازا گیا، اُنھوں نے پورے ملک میں دورے کرکے ملّت کے شعور کو بیدار کیا اور اس کو وقت کے تقاضوں سے روشناس کرایا، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تحفّظ کی زبردست کوشش کی، اُن کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ ایک طرف تو اُنھیں ملّت کا اعتماد حاصل تھا اور دوسری طرف حکومت بھی انھیں عظمت کی نظر سے دیکھتی تھی۔

۱۹۴۷ء کے بعد جن گراں بار ذمہ داریوں سے اُنھیں دوچار ہونا پڑا اُس نے اُنکی صحت کو خراب کردیا، غیر معمولی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ مرض بڑھتا رہا، ڈاکٹروں کی تشخیص سے پتہ چلا کہ کینسر ہے، علاج کے لئے بمبئی لے جایا گیا، مگر مرض کا ازالہ نہ ہوسکا بالآخر علاج کی آخری کوشش یہ کی گئی کہ اُن کو امریکہ لے جایا گیا، وہاں ڈھائی مہینے کے علاج سے افاقہ محسوس ہونے پر واپس آگئے، مگر وقتِ موعود آچکا تھا، یکم ربیع الاوّل ۱۳۸۲ھ (۲راگست ۱۹۶۲ء) کو ملّتِ اسلامیہ کا یہ جاں باز مجاہد اپنے رب کے حضور میں حاضر ہوگیا، نئی دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مشہور قبرستان "مہندیوں میں" اُن کی ابدی آرام گاہ ہے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن بہت سے دینی مدارس اور اسکولوں اور کالجوں کے رکنِ رکین تھے، مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ایگزیکیٹو کونسل اور کورٹ کے عرصے تک

ممبر رہے، اور دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ۱۳۶۲ھ سے تا وفات ۱۳۸۲ھ رکن رہے۔

مولانا سیّد محمد میاں دیوبندیؒ

تاریخی نام منظفر میاں ہے، دیوبند کے مشہور خاندان سادات رضویہ سے تھے، ۱۳۲۱ھ ۱۹۰۳ء میں ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے، جہاں اُن کے والد بسلسلۂ ملازمت محکمہ نہر تعینات تھے، تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا، قرآن شریف ضلع منظفر نگر کے ایک میاں جی سے پڑھا، ۱۳۳۱ھ میں دارالعلوم دیوبند میں کے درجۂ فارسی میں داخل ہوئے، اور دارالعلوم سے ۱۳۴۳ھ میں فراغت حاصل کی، اوّلاً صوبہ بہار کے مقام آرہ شاہ آباد میں مدرس رہے، پھر مدرسہ شاہی مراد آباد میں مدّت تک مدرس اور مفتی کی حیثیت سے کام کیا، بعد ازاں جمعیۃ العلماء ہند کے ناظم مقرر ہوئے، اور ایک سال تک ناظم اعلیٰ کے عہدے پر بھی فائز رہے، جمعیۃ العلماء کے مخلص اور کارگزار لیڈروں میں تھے، اُنھیں برطانوی دَور میں کئی مرتبہ قید و بند سے گزرنا پڑا۔

مولانا سید محمد میاں صاحب بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، فقہ اور تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی، وہ نامور مصنّف و مؤرخ تھے، جمعیۃ العلماء ہند کی تاریخ میں ان کی سیاسی اور تصنیفی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی، علماء ہند کا شاندار ماضی، علماء حق کے مجاہدانہ کارنامے، سیر محمد رسول اللہ، تاریخ الاسلام، عہدِ زرّیں، پانی پت اور بزرگانِ پانی پت، تحریک شیخ الہندؒ، اور حدیث میں مشکوٰۃ الآثار جو دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں شامل ہے، ان کی اہم تصانیف ہیں، جمعیۃ العلماء ہند کا تعلیمی نصاب جو "دینی تعلیم کا رسالہ" کے نام سے موسوم ہے، انہی کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے، یہ رسالے اسلامی مدارس و مکاتب کے نصاب میں شامل ہیں، جمعیۃ علماء کی سیاسی تاریخ اور

اُس کے ریکارڈ پر اُن کی نظر بڑی وسیع تھی، علماء ہند کی سیاسی خدمات سے عوام کو روشناس کرانے کے لئے انھوں نے عظیم تصنیفی کارنامہ انجام دیا ہے۔

ہندوستان کے آخری عہدِ اسلامی کی تاریخ پر ان کی بڑی گہری نظر تھی، خاندانِ ولی اللٰہی اور اکابرِ دیوبند کی علمی وسیاسی اور دینی وتبلیغی خدمات پر ان کی تحریریں بڑی مستند سمجھی جاتی ہیں، یورُپ اور امریکہ کے مصنفین بھی اُن کے حوالے دیتے ہیں، ان کی تصانیف کو قبول عام حاصل ہے۔

سیاسی ہنگاموں میں شرکت کے باوجود اپنی سادگی، خلوت نشینی اور اورادو وظائف کی پابندی اور علم وفضل میں کامل دست گاہ کے ساتھ تواضع وانکسار، زہد وقناعت ریاضت وعبادت اور صلاح وتقویٰ میں بزرگانِ سلف کا نمونہ تھے۔

زندگی کے آخری دَور میں مدرسہ امینیہ دہلی کے شیخ الحدیث اور ادارۂ مباحثِ فقہیہ کے معتمد رہے، ۱۳۷۰ھ سے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔

۱۶ر شوال المکرم ۱۳۹۵ھ (۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۵ء) کو ۷۴ سال کی عمر میں اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو رحلت فرمائی، دہلی میں آسودۂ خواب ہیں۔

مولانا محمد بن موسیٰ افریقیؒ

آبائی وطن ضلع سورت میں قصبہ سملک تھا، مگر چند پشتوں سے اُن کے خاندان نے جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ کو وطنِ اقامت بنالیا تھا، وہیں تقریباً ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کے لئے والدِ ماجد نے ہندوستان بھیجدیا، یہاں پالن پور میں مولانا نذیر احمد پالن پوری سے پڑھا، ۱۳۴۲ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اور ۱۳۴۴ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، دارالعلوم میں آنے کے ساتھ ہی حضرت شاہ صاحبؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے، اور حضرت شاہ صاحبؒ کی زندگی کا رنگ اُن پر ایسا

غالب آیا کہ نشست و برخواست، چال، ڈھال، بات چیت اور تمام طور طریق میں ہو بہو اپنے استاذ کا نمونہ بن گئے تھے، دولت مند ہونے کے باوجود مزاج اور رہن سہن میں انتہائی سادگی اور تواضع تھی، اور عام طلبار کی طرح نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے، مگر امورِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے، اور نہایت فیّاضی سے خرچ کرتے تھے، عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی زبان بھی بخوبی جانتے تھے۔

تعلیم سے فارغ ہو کر جوہانسبرگ چلے گئے، وہاں اپنے وسیع ترین تجارتی کاروبار کے ساتھ بڑے پیمانے پر دینی خدمات بھی انجام دیتے رہے، اسلامی اور عصری علوم کی تعلیم کے لئے جوہانسبرگ میں واٹرفال اسلامی انسٹی ٹیوٹ قائم کیا، اس کے لئے عالیشان عمارت تعمیر کرائی، انسٹیٹیوٹ کے تمام مصارف اپنے پاس سے پورے کرتے تھے، دارالعلوم دیوبند کے طریقے کے مطابق مفت تعلیم کے ساتھ طلبار کے خور و نوش کا انتظام بھی اُن ہی کی جانب سے تھا، جمعیۃ العلمار ٹرانسوال کے ہمیشہ صدر رہے، جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل کی تعمیر و ترقی میں اُن کی زبردست مالی امداد کا بڑا حصّہ ہے، علمی کاموں سے بھی ہمیشہ شغف رہا، ڈابھیل میں مجلسِ علمی[1] کے نام سے ایک تصنیفی ادارہ قائم کیا، جس میں اہم علمی کتابوں کے شائع کرنیکا انتظام کیا، اور اس کے بھی تمام مصارف اپنے ذمّے رکھے۔ علّامہ ظہیر احسن شوق نیموی (وفات ۱۳۲۲ھ) کی کتاب آثارُ السنن پر حضرت علّامہ محمد انور شاہ صاحبؒ کے دستِ خاص سے لکھے ہوئے حواشی کی مائیکروفلم لے کر اہلِ علم کے لئے اس کے نسخے شائع کئے۔

---

[1] مجلسِ علمی ڈابھیل نے حضرت شاہ صاحبؒ اور دوسرے علمار کی نہایت اہم کتابیں شائع کرنے کا قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے علامہ زیلعی کی نصب الرایہ علیٰ تخریج احادیث البدایہ اور فیض الباری علی صحیح البخاری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، یہ دونوں کتابیں مصری ٹائپ سے قاہرہ میں طبع کرائی گئی ہیں۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے مصنف ابن عبدالرزاق کو انہی کے صاحبزادوں کی مالی اعانت سے ایڈیٹ کر کے شائع کیا ہے۔

۱۶ر اپریل ۱۹۶۳ء (۲۱ر ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ) کو جوہانسبرگ میں وفات پائی۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

تقریباً ۱۳۲۵ھ ۱۹۰۷ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے، آبائی وطن بچھرایوں ضلع مراد آباد ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، پھر مدرسہ شاہی مراد آباد میں پڑھا، آخر میں دارالعلوم میں ۱۳۴۴ھ میں تکمیل کی بعدازاں اورنٹیل کالج لاہور سے مولوی فاضل کیا، پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں دو سال تک مدرس رہے، وہاں سے دہلی جاکر مدرسہ عالیہ فتحپوری میں السنۂ شرقیہ کے استاذ مقرر ہوئے، اسی دوران میں سینٹ اسٹیفن کالج سے ایم۔ اے کیا، اور شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن کی جگہ اسٹیفن کالج میں لکچرار مقرر ہوئے، پھر ۱۹۴۹ء ۱۳۶۸ھ میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل بنائے گئے۔

۱۹۵۸ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ دینیات کے صدر کے منصب کے لئے اُن کا انتخاب کیا گیا، یونیورسٹی میں اُن سے پہلے دینیات کا شعبہ بہت معمولی حالت میں تھا، مولانا اکبر آبادی نے کمال جدّ وجہد سے اپنے زمانے میں علمی اور انتظامی دونوں حیثیتوں سے اس شعبے کو ترقی دے کر یونیورسٹی کے دوسرے اعلیٰ معیار کے شعبوں کے برابر پہنچانے کا زبردست کارنامہ انجام دیا، اور اب دینیات کا یہ شعبہ یونیورسٹی کے دوسرے شعبوں کی طرح معیاری شعبہ بن چکا ہے، دینیات (فیکلٹی آف تھیالوجی) میں پی، ایچ، ڈی کے شعبہ کا اجراء بھی مولانا اکبر آبادی ہی کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔

علی گڑھ میں اپنے عہدے کی مدّت پوری ہو جانے کے بعد مولانا اکبر آبادی اب

تحقیقاتِ علمیہ (ریسرچ انسٹیٹیوٹ) تغلق آباد نئی دہلی میں علمی کاموں میں مصروف ہیں۔

مولانا موصوف ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء سے ندوۃ المصنفین دہلی کے بلند پایہ علمی ماہنامہ "برہان" کے مُدیر ہیں، ان کے رشحات قلم بڑے مدلّل پُر مغز اور فکر انگیز ہوتے ہیں اور جدید و قدیم حلقوں میں بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ وہ کئی بلند پایہ اور محققانہ کتابوں کے مصنّف ہیں، جن میں اسلام میں غلامی کی حقیقت، غلامانِ اسلام، وحیٔ الٰہی، فہم قرآن مُسلمانوں کا عروج و زوال اور صدیق اکبر وغیرہ معرکہ آرا تصانیف ہیں۔ صاحبِ قلم ہونے کے علاوہ وہ ایک کامیاب مقرر بھی ہیں۔

علی گڑھ کے زمانہ قیام میں کناڈا کی مشہور آفاق میک گل یونیورسٹی میں وزٹینگ پروفیسر کی حیثیت سے جا چکے ہیں، ایشیا، روس، افریقہ اور یورپ کے مختلف ملکوں کے دورے کر چکے ہیں، اُنھوں نے کئی بین الاقوامی سمیناروں میں بھی شرکت کی ہے، موتمر عالمِ اسلامی قاہرہ میں بھی شرکت کر چکے ہیں، اور بین الاقوامی شخصیت کے حامل ہیں، ۱۳۸۲ھ سے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں۔

مولانا محمد منظور نعمانی

آپ کا وطن سنبھل ہے، وہیں ۱۸ر شوال ۱۳۲۳ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم پہلے سنبھل میں اور کچھ دن مدرسہ عبدالرّب دہلی میں پائی پھر دارالعلوم مئو (ضلع اعظم گڑھ) میں پڑھا، آخر میں دارالعلوم دیوبند میں دو سال رہ کر ۱۳۴۵ھ میں دورۂ حدیث کے امتحان میں سب سے زیادہ کامیابی کے نمبر حاصل کئے۔

فراغت کے بعد امروہہ کے مدرسہ چلّہ میں تین سال درس و تدریس میں گزارے چار سال تک دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بحیثیت شیخ الحدیث کے درس دیا ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء

میں بریلی سے "الفرقان" کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا، "الفرقان" کی دو خاص اشاعتیں "مجدد الف ثانی نمبر" اور "شاہ ولی اللہ نمبر" کے نام سے شائع کیں، ابتدا "الفرقان" کا رُخ مناظرے کی جانب رہا، پھر ۱۳۶۱ھ / ۱۹۴۲ء سے الفرقان ایک علمی اور دینی پرچے میں تبدیل ہو گیا، ۱۳۴۳ھ سے تبلیغی جماعت سے وابستہ ہیں، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے بھی رکن ہیں۔

مولانا نعمانی اُردو کے کامیاب مضمون نگار اور مصنف ہیں، اُن کی تصانیف عام فہم ہوتی ہیں، طرز نگارش سادہ، سلیس اور شگفتہ ہے، عوام اور خواص دونوں حلقوں میں اُنکی کتابیں مقبول اور پسندیدہ ہیں، معارف الحدیث جس کی اب تک چھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں احادیثِ نبوی کا ایک جامع انتخاب اور شاہکار ہے، جس میں احادیث کی تشریح میں اس دور کی نفسیات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

اسلام کیا ہے؟ دین وشریعت اور "قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ اُن کی نہایت معرکہ آرا تصانیف ہیں، ان کے علاوہ کلمۂ طیبہ کی حقیقت، نماز کی حقیقت، آپ حج کیسے کریں؟ برکاتِ رمضان، تحقیق مسئلہ ایصال ثواب تصوف کیا ہے؟ تذکرہ امام ربانی ملفوظات مولانا محمد الیاسؒ، بوارق الغیب (دو جلدوں میں) معرکۃ القلم، حضرت شاہ اسمٰعیل شہید پر معاندین کے الزامات، خاکسار تحریک، قرآن علم کی روشنی میں، اسلام اور کفر کے حدود اور قادیانیت وغیرہ اُن کی اہم کتابیں ہیں۔

۱۳۶۲ھ میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے، آپ مجلس کے سب سے پرانے ممبر ہیں اور بہت باقاعدگی کے ساتھ مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کے اجلاسوں میں شرکت فرماتے ہیں۔

☆

مولانا حامد الانصاری غازی

آپ حضرت مولانا منصور انصاریؒ نواسہ حضرت نانوتویؒ کے خلف الرشید ہیں، ۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء میں انبہٹہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مالیر کوٹلہ میں اپنے وقت کے مشہور استاذ اور اپنے نانا حضرت مولانا صدیق احمد انبہٹویؒ سے حاصل کی، ۱۳۴۱ھ سے ۱۳۴۶ھ تک دار العلوم میں پڑھا۔ اُردو زبان کے شگفتہ نگار اور صاحبِ طرز ادیب اور ممتاز صحافی اور مقرر ہیں، "الجمعیۃ" دہلی "مدینہ" بجنور، اور "جمہوریت" بمبئی وغیرہ اخبارات کے مدیرِ مسئول رہ چکے ہیں، اسلام کا نظامِ حکومت اُن کی مشہور تصنیف ہے جو ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی ہے، سیرتِ نبوی پر خُلقِ عظیم کے نام سے بھی آپ کی ایک قابلِ قدر کتاب ہے، شاعری پر بھی اچھی قدرت حاصل ہے، سیاسیات پر اُن کی نظر بڑی گہری ہے، سیاسی لحاظ سے مدت تک جمعیۃ العلماء ہند سے وابستہ رہے۔ اور جمعیۃ علماء مہاراشٹر کے صدر رہ چکے ہیں، دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے ۱۳۸۲ھ سے ممبر ہیں۔

۱۳۹۲ھ ۱۹۷۲ء میں زیارتِ حرمین شریفین سے مشرف ہو چکے ہیں، اُن کی باوضع اور پُرکشش شخصیت خُلق، تواضع اور وقار کا ایک دلکش مجموعہ ہے، دار العلوم کی تقریب صد سالہ کے انتظامات کے لئے مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند نے آپ کو منتخب کیا ہے، جنھیں آپ نہایت خوش اسلوبی اور تن دہی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

مولانا قاضی زین العابدین سجّاد میرٹھی

شہر میرٹھ کے خاندان قضات سے تعلق رکھتے ہیں، اُن کا خاندان محمد تغلق (۷۲۵ھ تا ۷۵۲ھ) کے عہد سے میرٹھ میں قضات کے اہم منصب پر فائز اور علم و عمل میں ممتاز رہا ہے، قاضی صاحب اسی خاندان کے چشم و چراغ اور اپنی آبائی روایات کے

حامل ہیں [1]

قاضی صاحب تقریباً ۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مدرسہ دارالعلوم میرٹھ میں اور پھر مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ میں پائی، مولانا عبدالمومن دیوبندیؒ سے مشکوٰۃ اور بیضاوی تک پڑھا، عربی ادب کا ذوق مدرسہ امداد الاسلام کے استاذ مولانا اختر شاہ خاں صاحب کی صحبت میں پیدا ہوا، اسی زمانہ میں فاضل ادب عربی کا امتحان الہ آباد یونیورسٹی سے پاس کیا اور ہائی اسکول تک انگریزی پڑھی، حدیث کی تکمیل کے لئے ۱۳۴۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت مدنیؒ سے حدیث کا فیض حاصل کیا، اور ۱۳۴۶ھ میں امتیاز کے ساتھ دورۂ حدیث سے فراغت پائی۔

زمانہ طالب علمی ہی میں انھیں عربی قصائد لکھنے عربی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی

---

[1] قاضی صاحب کے بزرگ تحریک ولی اللہی سے وابستہ رہے ہیں، اُن کے جدِ امجد قاضی احمد اللہ شہیدؒ حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ شریک رہے، سید صاحبؒ کے ساتھ جو قافلہ ۱۲۳۶ھ ۱۸۲۱ء میں حج کے لئے گیا تھا اُس میں یہ بھی شامل تھے، بالا کوٹ کے معرکہ ۱۲۴۶ھ ۱۸۳۱ء میں جامِ شہادت نوش کیا، اُن کے دادا قاضی عبدالباریؒ نے اپنے منصب کی عظیم ذمہ داری کے باوجود ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں نمایاں حصہ لیا، مولوی محمد ہاشم جن کے مطبع ہاشمی سے آخری دور میں حضرت نانوتویؒ کا تعلق رہا ہے اسی خاندان کے بزرگ تھے۔ قاضی صاحب کے والد ماجد مولانا بشیر الدینؒ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی اور مولانا ناظر حسن دیوبندی کے ارشد تلامذہ میں تھے، انھیں حضرت مولانا فضلِ رحمٰن گنج مرادآبادی سے حدیث کی سند حاصل تھی، حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا تذکرہ عزیزیہ اور ملفوظاتِ عزیزی وغیرہ کتابیں انھوں نے مرتب کر کے شائع کی ہیں۔

مہارت حاصل ہو گئی تھی، اور اُردو کے معیاری جرائد میں اُن کے ترجمے شائع ہونے لگے تھے، مولانا تاجور نجیب آبادی جو اس زمانے میں لاہور سے "ادبی دنیا" کے نام سے ایک ماہنامہ نکالتے تھے "ادبی دنیا" کے جوائنٹ ایڈیٹر کے لئے اُن کی نظر انتخاب قاضی صاحب پر پڑی اور وہ لاہور چلے گئے ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء میں جب دہلی میں ندوۃ المصنفین قائم ہوا تو اس کے رفقائے تحریر میں قاضی صاحب بھی شامل تھے، اسی زمانے میں اُنھوں نے تاریخ ملت کے تین حصے نبیِ عربی، خلافتِ راشدہ اور خلافتِ بنواُمیہ، لکھے، ان کے علاوہ قاضی صاحب اور بھی بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، اُن کی اہم تصانیف یہ ہیں، بیان اللسان (عربی اُردو لغت) قاموس القرآن (الفاظِ قرآنی کی لغت) انتخاب صحاح ستہ، سیرِ طیبہ، شہیدِ کربلا، کلام عربی وغیرہ۔ بیان اللسان جس میں مادہ سے قطع نظر ہر لفظ کو اپنی اصل صورت میں لکھ کر مکمل صرفی ونحوی تشریح کی گئی ہے، بار بار طبع ہو چکی ہے، اسی طرح قاموس القرآن جس میں الفاظ قرآنی کی تحقیق لغوی کے علاوہ تمام اہم الفاظ پر جامع و مکمل نوٹ لکھے گئے ہیں، یہ بہت مقبول لغت ہے۔

ایک زمانے میں میرٹھ سے "الحرم" کے نام سے ایک مؤقر ماہنامہ بھی نکالتے رہے ہیں، قاضی صاحب کا طرزِ نگارش سادہ شگفتہ، عام فہم اور دل کش ہوتا ہے، عربی سے اُردو میں ترجمہ کرنے پر اُنھیں کامل دسترس حاصل ہے۔

۱۹۵۷ء میں پروفیسر محمد مجیب صاحب نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں تاریخ اور تفسیر کی پروفیسری کے لئے آپ کو دعوت دی، جہاں ایک عرصے تک آپ اس منصب پر فائز رہے[۱]۔

---

[۱] ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی مسلمانوں کی دو اہم تعلیم گاہیں سمجھی جاتی ہیں، ایک مسلم یونیورسٹی علیگڈھ اور دوسری جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ان دونوں اداروں میں دینیات کا شعبہ قریب قریب فضلائے دارالعلوم (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

۱۳۸۲ھ سے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں، اس کے علاوہ مجلس منتظمہ ندوۃ العلماء لکھنؤ فیکلٹی دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند وغیرہ کے رکن بھی ہیں، اور آل انڈیا دینی تعلیم بورڈ کے صدر ہیں۔

مولانا شمس الحق فریدپوری

ضلع فریدپور (بنگلہ دیش) کے رہنے والے تھے، تقریباً ۱۳۲۸ھ میں پیدا ہوئے، پہلے مظاہر علوم سہارن پور میں تعلیم پائی، پھر دارالعلوم میں داخلہ لیا اور یہاں سے ۱۳۴۶ھ میں فراغت حاصل کی۔

مولانا فریدپوری نے اپنی علمی اور تبلیغی خدمات کے لئے ڈھاکہ میں جامعہ قرآنیہ کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا، مدرسہ کے لئے عالی شان عمارتیں بنوائیں اور مسجد تعمیر کرائی یہ مدرسہ ڈھاکہ کے دینی مدارس میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔

مولانا شمس الحق بنگلہ زبان کے بڑے اچھے مصنف تھے، انھوں نے بنگال کے مسلمانوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دیوبند سے ہی متعلق رہا ہے، مسلم یونیورسٹی میں سب سے پہلے ناظم دینیات مولانا عبداللہ انصاریؒ تھے، پھر اُن کے فرزندِ رشید مولانا احمد میاں انصاری نے اس منصب کو سنبھالا اور آخر میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اپنی زبردست جد وجہد سے اس شعبہ کو جو پہلے معمولی حالت میں تھا یونیورسٹی کی دوسری علمی فیکلٹیوں کے مساوی پہنچا دیا ہے، اور اب دینیات کے شعبہ کو یونیورسٹی میں وہی حیثیت حاصل ہے جو دوسری فیکلٹیوں کو ہے۔

جامعہ ملیہ دہلی میں پہلے خواجہ عبدالحیٔ مرحوم ناظمِ دینیات رہے، اور پھر قاضی زین العابدین سجاد اسی منصب پر فائز ہوئے، اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ یہ تینوں عظیم ادارے مسلک کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مربوط ہوگئے ہیں۔

کو دینی تعلیم سے روشناس کرانے کے لئے بڑی خدمت انجام دی، بہشتی زیور کا بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا، جو بنگال میں بہت مقبول ہوا، اس کے علاوہ انھوں نے حضرت تھانوی کی اور کئی کتابوں کو بنگلہ زبان میں منتقل کیا ہے۔

اخلاص اور خیر خواہی کے ساتھ حق گوئی اور بے باکی اُن کی خاص صفت تھی مشرقی پاکستان کے حکام کے ساتھ اُن کے گہرے تعلقات تھے۔ لیکن جب دین کا معاملہ آجاتا تو پوری بے باکی اور جرأت کے ساتھ اپنی بات کہنے سے چوکتے نہ تھے، آخر عمر میں صحت خراب ہوگئی تھی۔ مگر دینی خدمات کے لئے ان کے عزم و حوصلے میں کبھی کمی نہیں آئی۔

ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ میں تقریباً ۶۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔

مولانا سیّد فخر الحسن

۱۰ رجب ۱۳۲۳ھ کو اپنے آبائی وطن قصبہ عمری ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئے، مظہر حسین تاریخی نام ہے، قرآن شریف، اُردو دینیات اور ابتدائی فارسی کی تعلیم حافظ نسیم الدین اور حافظ عبد القادر امروہی سے حاصل کی، آپ کے والد ماجد مدرسہ شاہی مراد آباد میں کتب خانہ کے ناظم تھے، اس لئے تقریباً ۱۳۳۵ھ میں مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخل ہو گئے، یہاں فارسی کی تکمیل کی اور درسِ نظامی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں، پھر مظاہر علوم سہارن پور میں داخلہ لیا اور متوسطات کی تحصیل کی، ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے، اور ۱۳۴۷ھ میں دورۂ حدیث کی تکمیل کر کے فارغ التحصیل ہوئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ عالیہ فتح پوری میں مدرس مقرر ہوئے، وہاں سے آپ بہار چلے گئے اور مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں صحاح کی بعض کتابیں پڑھانے پر مامور کئے گئے، مگر ڈیڑھ سال کے بعد پھر مدرسہ عالیہ فتح پوری میں واپس آگئے، اور آخر میں مدرسہ

عالیہ کے صدر مدرس بنائے گئے، ۱۳۶۲ھ میں آپ کو دارالعلوم میں بلا کر طبقۂ علیا کا مدرس مقرر کیا گیا اور صحیح مسلم اور امورِ عامہ وغیرہ کتابیں دی گئیں، دارالعلوم میں آپ کے درسِ صحیح مسلم اور تفسیر بیضاوی کو خاص شہرت حاصل رہی ہے، چنانچہ بیضاوی کی آپ کی درسی تقریر التفسیر الحاوی کی جلد اوّل شائع ہو کر قبولِ عام حاصل کر چکی ہے، وعظ و تقریر میں بھی دستگاہ حاصل ہے۔

۱۳۸۷ھ میں حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ کی وفات کے بعد آپ کو دارالعلوم کا صدرالمدرسین بنایا گیا، جس پر آپ اب تک فائز ہیں۔

حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے آپ کو اجازت و خلافت حاصل ہے۔

مولانا قاضی سجّاد حسین کرتپوری

۱۳۲۸ھ میں پیدا ہوئے، کرت پور ضلع بجنور کے رہنے والے ہیں ۱۳۴۷ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، الہ آباد بورڈ سے مولوی عالم اور فاضل ادب کے امتحانات اور پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور مولوی فاضل کے امتحانات پاس کئے۔

مدرسہ عالیہ فتح پوری میں پہلے مدرس مقرر ہوئے، پھر صدر مدرسین بنائے گئے۔

حضرت مولانا مدنیؒ سے بیعت کا شرف حاصل ہے، شیخ سعدی کی گلستاں، بوستاں کریما، اور دیوانِ حافظ شیرازی، مالابد منہ، گلزار دبستاں، حمد باری، اور پندنامہ وغیرہ فارسی کی درسی کتابوں پر آپ نے اردو میں مفید اور سہل حواشی لکھے ہیں، اور ان کتابوں کو نہایت صحت و اہتمام کے ساتھ طبع کرایا ہے، سبعہ معلقہ کی ایک شرح بھی اردو میں انھوں نے توضیحات کے نام سے لکھی ہے۔

حکومت ہند نے ان علمی خدمات کے اعتراف میں آپ کو فارسی کا ایوارڈ دیا ہے،

روزنامہ الجمعیۃ وغیرہ میں ان کے بعض مضامین شائع ہوئے ہیں، اُردو تحریر اور تقریر دونوں پر انھیں اچھی قدرت حاصل ہے، علم و فضل کے ساتھ خلیق متواضع اور بلند اخلاق عالم ہیں، جمعیۃ العلماء ہند کے مدتوں سے رکن ہیں، دینی تعلیمی بورڈ دہلی کے جنرل سکریٹری کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں، ہمدرد دواخانہ دہلی (وقف) کے نائب متولی ہیں۔

مولانا مسیح اللہ خاں

آپ کا تعلق ضلع علی گڑھ کے مشہور شروانی خاندان سے ہے ۱۳۳۰ھ میں اپنے وطن سرائے برلہ ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے، ابتداً سرکاری اسکول میں درجہ ششم تک پڑھا، بچپن ہی سے ذکر و نوافل، اوراد و وظائف اور دینی تعلیم حاصل کرنے کا شوق دامنگیر تھا، اس لئے سرکاری اسکول سے بددل ہو کر تعلیم چھوڑ دی، بالآخر مجبور ہو کر والد صاحب نے دینی حاصل کرنے کی اجازت دے دی، مشکوٰۃ المصابیح تک اپنے وطن میں پڑھا، ۱۳۴۸ھ میں دارالعلوم میں داخلہ لیا، اور ۱۳۴۹ھ میں دورۂ حدیث کی تکمیل کرکے مزید دو سال تک دارالعلوم میں رہ کر معقولات کی کتابیں، امورِ عامہ، قاضی مبارک تصریح، شرح چغمنی سبع شداد وغیرہ پڑھیں۔

زمانۂ تعلیم ہی میں حضرت تھانویؒ سے بیعت کا شرف حاصل کر لیا تھا، اور پھر جلد ہی ۱۳۵۱ھ میں خلافت سے سرفراز ہو گئے، حضرت تھانویؒ نے ایک مرتبہ اپنے گیارہ مخصوص خلفاء کے نام ایک اعلان میں تحریر فرمائے تھے اُس میں لکھا تھا کہ:-

"اپنے چند مجازین کے نام لکھتا ہوں، جن کے طرزِ تعلیم پر مجھے اعتماد ہے، ان میں سے جس سے چاہیں اپنی تربیت متعلق کر لیں"

ان گیارہ مخصوصین میں مولانا مسیح اللہ خاں صاحب کا اسم گرامی بھی شامل تھا ۱۳۵۷ھ میں حضرت تھانویؒ نے انھیں جلال آباد کے ایک مدرسہ میں مدرس بنا کر

بھیجدیا، اُس وقت یہ مدرسہ صرف ایک مکتب کی حیثیت میں قائم تھا. مگر چند ہی سالوں میں آپ کی مخلصانہ جد وجہد اور خونِ جگر کی آبیاری ہی سے اس مدرسہ کا شمار جو اب مفتاح العلوم کے نام سے موسوم ہے، ہندوستان کے بڑے مدارسِ عربیہ میں ہوتا ہے، مولانا موصوف کی کمال جد وجہد اور سعیٔ بلیغ سے مدرسہ اور مسجد کی عظیم الشان عمارتیں تعمیر ہوچکی ہیں مدرسہ کا احاطہ نہایت وسیع اور مسجد دیدہ زیب ہے۔

آپ کے یہاں جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ ایک، عام مجلس ہوتی ہے جس میں مدرسے کے اساتذہ وطلبار کے علاوہ گردو نواح کے مُریدین کا ایک بڑا مجمع ہوتا ہے، اسمیں حضرت تھانوی کے ملفوظات ومواعظ خود پڑھ کر سُناتے ہیں، اُن کے مُریدین کا حلقہ کافی وسیع ہے، پیچیدہ مسائل ومباحث کو آسان اسلوب میں مثالوں اور واقعات وحکایات کے ذریعے سے سمجھانے میں اُنھیں خاص ملکہ حاصل ہے۔

فنِ تصوّف پراُن کی ایک کتاب شریعت وتصوّف ہے، جو حضرت تھانوی کی تصوّف سے متعلق کتابوں سے ماخوذ ہے، کتاب وسنّت کی روشنی میں تصوّف کے مسائل ومضامین کو نہایت سہل اور آسان انداز میں اس طرح سمجھایا گیا ہے کہ ایک عام آدمی بھی ان مسائل کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ مولانا کا فیضان عام ہے اور ہند سے گزر کر بیرونِ ہند تک پہونچ رہا ہے۔

مولانا محمد یوسف بنوری

ضلع پشاور کے ایک اہلِ علم اور خاندانِ سادات کے فرد ہیں، اُن کے والدِ ماجد مولانا محمد زکریا صاحب بلند پایہ عالم اور معروف شخصیت تھے، اُن کا خاندان حضرت مجدّد اَلفِ ثانی کے وقت سے صوبہ سرحد کا واجب الاحترام خاندان رہا ہے، اگرچہ مولانا بنوری نے باقاعدہ دارالعلوم میں داخلہ نہیں لیا مگر ان کا تعلیمی تعلق ہمیشہ دارالعلوم کے اساتذہ ہی سے رہا ہے،

انھوں نے جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل میں حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ سے حدیث کی تحصیل کی ہے، اور اس طرح اُن کی علمی اور تعلیمی زندگی ہمیشہ دارالعلوم دیوبند سے مربوط رہی ہے، ذہین، طباع منکسرالمزاج اور وسیع النظر عالم ہیں، حضرت شاہ صاحب کے علوم و معارف کے امین ہیں، معارف السنن علم الحدیث میں اُن کی بلند پایہ تصنیف ہے، جس میں حضرت علامہ محمد انور شاہ رحمہ اللہ کے علوم کو پورے تثبت اور اتقان کے ساتھ محفوظ کر دیا ہے۔

جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل اور پھر پاکستان کے مرکزی مدارس میں درسِ حدیث میں مشغول رہے، اپنی غیر معمولی علمی صلاحیتوں کی بنا پر پاکستان کے علاوہ ممالک اسلامیہ کے علمی حلقوں میں بھی مقبول و متعارف ہیں، موتمر عالمِ اسلامی قاہرہ اور رابطہ عالمِ اسلامی مکہ مکرمہ سے رابطہ قائم ہے، سندھ کے مشہور مدرسہ ٹنڈواللہ یار میں عرصے تک شیخ الحدیث رہے پھر کراچی میں نیوٹاؤن کی مسجد میں ایک مدرسہ قائم کیا اور محض متوکلانہ انداز سے مسجد میں تعلیم کا آغاز کر دیا، حق تعالےٰ نے ان کا صدق و اخلاص قبول فرمایا، اور آج وہ پاکستان کا ایک مرکزی دارالعلوم شمار کیا جاتا ہے، مصارف مدرسہ کے بارہ میں انتہائی محتاط اور زہد و تقویٰ کے پابند ہیں۔

مولانا موصوف صاحبِ قلم بھی ہیں، ان کی اُردو شستہ اور ادیبانہ ہوتی ہے، آپ نے مدرسہ کے لئے ایک رسالہ بھی "بینات" کے نام سے جاری کیا ہوا ہے، جس میں ممتاز اہلِ قلم کے محققانہ مضامین شائع ہوتے ہیں، قادیانی فرقہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے میں آپ کی خدمت کا بڑا حصہ ہے، وجیہہ و شکیل شخصیت رکھتے ہیں، ادب عربی میں انھیں وہی قدرت حاصل ہے، جو ایک اہل زبان کو ہو سکتی ہے، مصر اور عرب ممالک کے علماء اُن کی قابلیت اور فضل و کمال کے معترف ہیں، یہ سطور لکھی جا چکی تھیں کہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۷ء (۱۳۹۷ھ) کی صبح کو اسلام آباد میں مولانا بنوری واصل بحق ہو گئے، انا للہ و انا الیہ راجعون!

مولانا منت اللہ رحمانی

۹ رجمادی الثانی ۱۳۳۲ھ کو خانقاہ رحمانی مونگیر میں پیدا ہوئے، ان کے والد ماجد حضرت مولانا سید محمد علیؒ [۱] (وفات ۱۳۴۶ھ ؍ ۱۹۲۷ء) اپنے وقت کے یگانۂ روزگار عالم اور حضرت شاہ فضلِ رحمٰن گنج مراد آبادیؒ (وفات ۱۳۱۳ھ) [۲] کے اجلّۂ خلفاء میں سے تھے، قرآن شریف اور فارسی، عربی کی ابتدائی تعلیم وطن میں پائی، ۱۱ سال کی عمر میں حیدر آباد دکن چلے گئے، وہاں ایک سال رہکر مفتی عبداللطیف صاحب (وفات ۱۳۷۹ھ ؍ ۱۹۲۷ء) سے عربی صرف ونحو اور منطق کی کتابیں پڑھیں، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوکر چار سال تک زیرِ تعلیم رہے، اسی دوران میں اُس وقت کے نامور عالم مولانا حفیظ اللہ (وفات ۱۳۶۲ھ) سے حجۃ اللہ البالغہ کا درس لیا، ندوۃ العلماء کے ممتاز طلباء میں مولانا رحمانی کا شمار ہوتا تھا، ۱۳۴۹ھ میں تکمیلِ علوم کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اور ۱۳۵۲ھ میں دارالعلوم سے سندِ فراغ حاصل کی، حضرت مولانا مدنیؒ کے مخصوص تلامذہ میں ہیں، انگریزی زبان سے بھی بقدرِ ضرورت واقفیت ہے تقریر و تحریر دونوں میں بہرہ وافر رکھتے ہیں، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، اُن کا طرزِ نگارش سادہ، عام فہم اور دل کش ہے، انھیں زبان وبیان پر پوری طرح قدرت حاصل ہے۔

۱۳۵۵ھ میں بہار اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، ۱۳۶۱ھ میں خانقاہ رحمانی کے سجادہ نشین بنائے گئے، خانقاہ رحمانی کو اُن کے والد ماجد نے مشرقی ہندوستان میں ایک بڑا علمی، دینی اور تبلیغی مرکز بنا دیا تھا، مسندِ سجادگی پر متمکن ہونے کے بعد خلقِ خدا کی اصلاح پر متوجہ

---

[۱] حضرت مولانا سید محمد علیؒ کے حالات کے لئے سیرت مولانا سید محمد علی دیکھئے۔ [۲] تفصیل کے لئے تذکرہ مولانا فضلِ رحمٰن مصنفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے مراجعت کی جائے۔

ہو گئے، بہار اڑیسہ اور بنگال میں اُن کے مُریدین و مسترشدین کا ایک وسیع حلقہ ہے، ۱۳۸۳ھ سے دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے رکن ہیں، مجلس میں اُن کی اصابت رائے کو اہم مقام حاصل ہے، ۱۳۷۶ھ میں اُن کو امارتِ شرعیہ صوبہ بہار و اڑیسہ کا امیرِ شریعت منتخب کیا گیا، افادۂ باطنی کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری رہتا ہے غرض کہ ان کی ذات شریعت و تصوّف کے ایک حسین سنگم کی حیثیت رکھتی ہے۔

جامعہ رحمانی کا ازسرِ نو قیام اور اُس کی غیر معمولی ترقی اُن کا ایک اہم علمی اور انتظامی کارنامہ ہے، جامعہ رحمانی کا شمار اس وقت بہار کے بڑے دینی مدارس میں ہوتا ہے، جامعۂ رحمانی کے کتب خانے نے اُن کے زمانے میں بڑی ترقی کی ہے، کتب خانے میں قدیم و جدید علوم کی منتخب کتابوں کا گراں قدر ذخیرہ موجود ہے۔

مولانا رحمانی کے زمانے میں امارتِ شرعیہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا ہے، بہار اور اڑیسہ میں جا بجا اس کی شاخیں قائم ہیں، یہ ادارہ شرعی قوانین کو اپنے حلقۂ اثر میں قائم کئے ہوئے ہے۔

مولانا رحمانی ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۴ء میں مؤتمر عالم اسلامی قاہرہ (مصر) میں ہندوستان کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت فرما چکے ہیں، سفرنامۂ مصر اس علمی اور ثقافتی سفر کی تاریخی یادگار ہے۔

آل انڈیا مُسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے مُسلمانوں کے عائلی قوانین کے سلسلے میں اُن کی زبردست خدمات ہیں اُن کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ جن مختلف المسالک نمائندگانِ مذہب کو حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیّب صاحب (صدر مُسلم پرسنل لا بورڈ) نے ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا تھا، مولانا رحمانی کو ان سب مختلف المسالک جماعتوں کا اعتماد حاصل ہے۔

مولانا شریف حسن دیوبندیؒ

دیوبند کے رہنے والے تھے ۹ راگست ۱۹۲۰ء کو دیوبند میں پیدا ہوئے، اور یہیں حافظ عبدالخالق مرحوم سے قرآن شریف حفظ کیا، پھر تین سال تک فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں بہٹ (ضلع سہارن پور) کے مدرسہ میں رہ کر پڑھیں، بعد ازاں دارالعلوم میں داخل ہو کر درسِ نظامی کے نصاب کی تکمیل کی، ۱۳۵۸ھ میں دورۂ حدیث سے فارغ التحصیل ہوئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد شوال ۱۳۶۰ھ ۱۹۴۱ء میں مدرسہ امدادالعلوم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں صدر مدرس مقرر ہوئے، اُنھیں جملہ علوم و فنون میں کامل دست گاہ حاصل تھی، حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے فیضِ صحبت سے حدیث اور افتاء سے خاص مناسبت پیدا ہوئی، تقریباً ۱۳۶۴ھ میں مدرسہ اشاعت العلوم بریلی کے صدرالمدرسین بنائے گئے۔ وہاں درسِ حدیث کے ساتھ افتاء کے فرائض بھی انجام دیئے، ۹ سال کے بعد جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل (ضلع سورت) میں شیخ الحدیث مقرر ہوئے، وہاں صحیح بخاری اور جامع ترمذی زیرِ درس رہیں۔

۱۳۸۳ھ میں اُنھیں دارالعلوم دیوبند میں بلایا گیا، علم حدیث سے خاص شغف تھا، حضرت مولانا فخرالدین احمدؒ کے بعد بخاری شریف کے درس کو سنبھالنا اُن کا بڑا علمی کارنامہ ہے، تادمِ واپسیں عملاً شیخ الحدیث کے فرائض انجام دیتے رہے، ان کی پوری زندگی درس و تدریس اور علومِ دینیہ کے طلباء کی خدمت میں گزری، اُن کا درس علمی مواد سے بھرپور ہوتا تھا۔ طلباء حدیث ان کے درس سے مطمئن ہو کر اُٹھتے تھے، وفات سے چند گھنٹے قبل تک ان کا علمی فیضان جاری رہا۔

مولانا شریف حسن صاحب علم و عمل، تقویٰ و طہارت اور فضائلِ اخلاق و

شمائل میں علماء اکابر کی یادگار تھے، وہ اپنے علمی تبحر اور علم حدیث سے خصوصی تعلق وشغف اور اپنی پاکیزہ نفسی کے باعث اپنے معاصرین علماء میں ممتاز سمجھے جاتے تھے، ہر چھوٹے بڑے سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے، ظاہر و باطن دونوں پاک تھے، طبیعت نہایت مرنجان مرنج پائی تھی۔

۱۴، ۱۵ر جمادی الثانی ۱۳۹۷ھ کی درمیانی شب میں تقریباً ۹۵ سال کی عمر میں بعارضۂ قلب چند گھنٹوں کی مختصر علالت کے بعد واصل بحق ہو گئے، رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ قبرستانِ قاسمی اُن کی ابدی آرام گاہ ہے۔

مولانا اشرف علی کمرلائی

بنگلہ دیش کے ضلع کمرلا کے رہنے والے ہیں ۱۳۶۴ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی، درس وتدریس کے علاوہ تقریر وخطابت، وعظ وتلقین، دینی وسماجی اصلاح اور تصنیف وتالیف کے ذریعے سے بنگال میں قابلِ قدر علمی خدمات انجام دیتے رہے ہیں، مدرسہ لاوڑی، دارالعلوم جبرلا کھ پور سینیر مدرسہ، ہیبت نگر کے مدرسہ عالیہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں، درسِ نظامی کی قریب قریب ساری ہی کتابیں پڑھانے کا اُن کو اتفاق ہوا ہے، بنگال میں سیکڑوں طلبا ان سے دینی وعلمی فیض حاصل کر چکے ہیں، اپنے علاقے میں فتویٰ نویسی کا اہم کام بھی انجام دیتے ہیں، اور میدانِ مناظرہ میں اپنی صلاحیتوں کے غیر معمولی جوہر دکھا کر اہلِ علم سے دادو تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

بنگلہ زبان کے فصیح البیان اور پُرجوش مقرر ہونے کے ساتھ وہ ایک کامیاب مضمون نگار، مترجم اور مصنف بھی ہیں، عرصہ ہوا جب اُنھوں نے شمائل ترمذی اور صحیح البخاری کے ترجمے بنگلہ زبان میں شروع کئے تھے، یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ ترجمے پورے ہوئے یا نہیں۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب سے بیعت ہیں، عالم باعمل ہیں

نظام اسلام پارٹی کے ناظم ہیں اپنے ملک میں میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرانے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے ہیں۔

مولانا مفتی محمود

ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے ضلع میں کلاچی کے رہنے والے ہیں، سالِ پیدائش تقریبًا ۱۳۴۲ھ ہے، ابتدأ وطن اور بلوچستان میں تعلیم پائی، شوال ۱۳۶۴ھ میں دارالعلوم میں داخلہ لیا اور ۱۳۶۵ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی، نجم المدارس کلاچی وغیرہ میں درس وتدریس کی خدمات پانچ چھ سال تک انجام دیں، کوٹ اعظم میں قرآن شریف اور اُردو کا ایک مدرسہ جاری کیا۔

اُنھیں حدیث اور فقہ میں اچھی بصیرت حاصل ہے، پاکستان میں اُنکے فتاویٰ وقعت اور اعتماد کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، پاکستان کے ممتاز علماء میں اُن کا شمار ہوتا ہے، دینی علوم میں بصیرت کے ساتھ ساتھ عصری علوم پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں، حق گوئی میں جری اور بے باک ہیں، جمعیۃ العلمائے اسلام پاکستان میں نظامت کے منصب پر فائز ہیں، ایک زمانے میں پاکستان اسمبلی کے ممبر رہ چکے ہیں، صوبہ سرحد میں کچھ عرصے تک وزیر اعلیٰ بھی رہے ہیں، اور اپنے دورِ حکومت میں بہت سے شرعی منکرات کو آپنے مٹا دیا تھا، مصر کی موتمر عالمِ اسلامی میں پاکستان کی نمائندگی کر چکے ہیں۔

آج بھی اُن کی علمی اور سیاسی خدمات کا سلسلہ جاری ہے، قادیانی فرقہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے میں آپ کی مساعی اہمیت رکھتی ہیں، آج کل پاکستان کے متحدہ محاذ کے صدر ہیں، پاکستان کی سیاسیات میں اُنھیں نمایاں مقام حاصل ہے۔

☼

باب پنجم

صدر مدرسین

دارالعلوم دیوبند اپنے آغاز ہی سے ہندوستان میں علمِ حدیث کا سب سے بڑا مرکز رہا ہے، اسی خصوصیت کی کشش تھی کہ ہندوستان کے علاوہ دُور دراز ملکوں کے طلبار بھی یہاں کھنچے چلے آتے ہیں، دارالعلوم میں صدارتِ تدریس کی مسند پر ہمیشہ ایسے علمار فائز رہے ہیں جو اپنے علم و فضل خصوصاً علمِ حدیث کے ساتھ زہد و تقویٰ اور سلوک و معرفت میں یگانۂ روزگار سمجھے جاتے ہیں، طالبانِ علم اُن سے علومِ ظاہری کے ساتھ ساتھ باطنی فیضان بھی حاصل کرتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد یعقوبؒ نانوتوی

دارالعلوم کے اس عظیم منصب پر سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ فائز ہوئے، اُنھوں نے اپنے والدِ ماجد حضرت مولانا مملوک علیؒ اور حضرت شاہ عبدالغنی مجدّدی دہلویؒ سے تحصیل علوم کی تھی۔

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی ۱۳ر صفر ۱۲۴۹ھ کو نانوتہ میں پیدا ہوئے، منظور احمد غلام حسین اور شمس الضحیٰ اُن کے تاریخی نام ہیں۔

قرآن مجید نانوتہ میں حفظ کیا، محرم ۱۲۶۰ھ میں جب کہ ان کی عمر گیارہ سال کی تھی انکے والد ماجد اُن کو دہلی لے گئے، میزان منشعب اور گلستاں سے ان کی تعلیم شروع ہوئی، تمام علوم متداولہ اپنے والد ماجد سے حاصل کئے، البتہ علم حدیث کی تحصیل حضرت شاہ عبدالغنی مجددی سے کی، علوم منقول و معقول میں اپنے والد ماجد کے مثل تھے، ذہن نہایت رسا پایا تھا۔

ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء میں حضرت مولانا مملوک علیؒ کا انتقال ہوگیا، اس کے ایک سال بعد تک دہلی میں قیام رہا، بعدازاں اجمیر کے گورنمنٹ کالج میں اُن کا تقرر ہوگیا، مکتوباتِ یعقوبی میں لکھا ہے:۔

"اجمیر میں ۳۰ روپے پر ملازم ہوکر تشریف لے گئے، اُس وقت آپ بہت کم سن تھے، پرنسپل اجمیر کالج نے دیکھ کر کہا "مولوی تو اچھا ہے، مگر نو عمر اور کم سن ہے، پرنسپل کی سفارش پر آپ کو ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ دیا گیا، مگر آپ نے قبول نہیں کیا، بعدازاں آپ کو سو روپے ماہوار پر بنارس بھیجا گیا، وہاں سے ڈیڑھ سو روپے کی تنخواہ پر ڈپٹی انسپکٹر بنا کر سہارن پور میں تقرر ہوا، یہیں غدر کا واقعہ پیش آیا[1]"

اُس زمانے میں نانوتہ میں قیام رہا، سرکاری ملازمت سے استعفا دے کر سبکدوش ہوگئے، اور میرٹھ میں منشی ممتاز علی کے مطبع میں ملازم ہوگئے، سوانح قاسمی میں خود لکھتے ہیں:۔

"منشی ممتاز علی صاحب نے میرٹھ میں چھاپہ خانہ کیا، مولوی (محمد قاسم) صاحب کو پرانی دوستی کے سبب بلالیا، وہی تصحیح کی خدمت تھی، یہ کام برائے نام تھا، مقصود اُن کا مولوی صاحب کو اپنے پاس رکھنا تھا، احقر اس زمانے میں بریلی اور لکھنؤ ہوکر میرٹھ میں

---

[1] مکتوباتِ یعقوبی ص ۵ مطبوعہ تھانہ بھون ۱۹۲۹ء۔

اسی چھاپے خانہ میں نوکر ہو گیا[1]، ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۶ء میں دیوبند تشریف لائے اور یہاں صدارتِ تدریس کی مسند پر فائز ہوئے، دارالعلوم کے پہلے شیخ الحدیث تھے، اُن کے فیضِ تعلیم و تربیت نے بہت سے ممتاز علماء پیدا کئے، جو آسمانِ علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے، ۱۹ سال کی مدت میں ۷۷ طلباء نے آپ سے علوم نبویہ کی تحصیل کی، جن میں مولانا عبدالحق پور قاضوی مولانا عبداللہ انبہٹوی، مولانا فتح محمد تھانوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا خلیل احمد انبہٹوی، مولانا احمد حسن امروہی، مولانا فخرالحسن گنگوہی، مولانا حکیم منصور علی خاں مرادآبادی مولانا مفتی عزیزالرحمٰن دیوبندی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حافظ محمد احمد اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ———— رحمہم اللہ جیسے مشاہیر اور یگانۂ عصر علماء شامل ہیں۔

حضرت مولانا محمد یعقوبؒ اور اُن کے تلامذہ کے فیضِ تعلیم کو دیکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اس وقت ہند و پاک بنگلہ دیش، افغانستان اور وسط ایشیا میں جس قدر علماء موجود ہیں، ان کی بڑی تعداد اسی خوانِ علم کی زلہ ربا ہے، اُن کے حلقۂ درس کی نسبت اشرف السوانح میں لکھا ہے کہ:۔

"حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ جو علاوہ ہر فن میں ماہر ہونے کے بہت بڑے صاحبِ باطن اور شیخِ کامل بھی تھے، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے مولانا ممدوح سے بڑے بڑے فیوض و برکات حاصل کئے ہیں اور زیادہ تر علوم عجیبہ و غریبہ انھیں سے حاصل فرمائے ہیں، اور مولاناؒ کے اکثر اقوال و احوال و حقائق و معارف نہایت لُطف لے کر بیان فرمایا کرتے ہیں، اور اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ حلقۂ درس کیا ہوتا تھا حلقۂ توجہ ہوتا تھا، یہ حال تھا کہ تفسیر کا سبق ہو رہا ہے، آیات کا مطلب بیان فرما رہے ہیں، اور آنکھوں سے زار و قطار

---

[1] سوانح قاسمی، ص ۲۰، ۲۱۔

آنسو جاری ہیں[1]۔"

حضرت مولانا محمد یعقوبؒ نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے سلوک و معرفت کے مقامات طے کئے تھے، اکثر جذب و کیف کی حالت طاری رہتی تھی، دنیوی علائق کی جانب مطلق توجہ نہ تھی، انھوں نے جو خطوط اپنے ایک مرید منشی محمد قاسم نیانگری کے نام لکھے ہیں وہ سلوک و معرفت کا مرقع اور حقائق تصوف کا دستور العمل ہیں، سالک کے لئے وہ ایک جامع ہدایت نامہ ہیں، راقم سطور کے فاضل دوست محمد ایوب صاحب قادری کی رائے ہے کہ مکتوبات یعقوبی چشتی سلسلے کے مشہور شیخ مخدوم جہانگیر اشرف سمنانی (وفات ۸۰۸ھ) کے مکتوبات کا مختصر اردو ایڈیشن معلوم ہوتے ہیں، ان خطوط کا مقصود حیات اتباع سنت اور اطاعت خداوندی ہے[2]۔

باوجودیکہ مزاج میں جلال اور "جذب" کا غلبہ تھا اور اس کے رعب و اثر کا یہ عالم تھا کہ لوگ بات کرتے ہوئے گھبراتے تھے، مگر آپ ہر شخص سے نہایت اخلاق و تواضع کے ساتھ پیش آتے تھے، اپنے بزرگوں کی طرح مزاج میں بڑا استغنا تھا، جس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے، کہ ایک صاحب نے جن کو مولانا کے مزاج میں بڑا دخل تھا عرض کیا کہ فلاں نواب صاحب کی بڑی خواہش ہے کہ ایک مرتبہ آپ ان کے یہاں تشریف لے جائیں، مولانا نے فرمایا، "ہم نے سنا ہے کہ جو مولوی نواب صاحب کے یہاں جاتا ہے، نواب صاحب اسکو سو روپے دیتے ہیں، ہمیں وہ خود بلا رہے ہیں اس لئے شاید دو سو روپے دے دیں، سو دو سو روپے ہمارے کے دن کے، ہم وہاں جاکر مولویت کے نام کو دھبہ نہ لگائیں گے[3]۔"

---

[1] اشرف السوانح جلد اوّل ص ۳۳ شائع کردہ کتب خانہ اشرفیہ دہلی۔

[2] مولانا احمد حسن نانوتوی ص ۱۹۷ مطبوعہ جاوید پریس کراچی۔

[3] ارواح ثلاثہ، امین حکایت ۳۹۹ ص ۲۴۰۔

مکتوبات یعقوبی کے دیباچہ نگار حکیم امیر احمد عشرتی لکھتے ہیں :۔

"آپ کے صدہا شاگرد مرید اور شاگردوں کے شاگرد بلاد ہندوستان، کابل و بخارا وغیرہ میں موجود ہیں، آپ جامع علوم معقول و منقول ہیں فاضل اجل اور عالم ہونے کے علاوہ سالک و مجذوب بھی تھے، اور جیسے کہ آپ روحانی طبیب تھے، اسی طرح امراض ظاہری کا بھی علاج کرتے تھے۔

آپ نہایت خوش وضع، خوش خُلق، خوش خُو، خوش لہجہ و خوش گفتگو تھے، بڑے صاحب کمال و مکاشفات تھے، آپ سے بہت پیشین گوئیاں صادر ہوئیں، جن میں بعض کا صدور ہو چکا ہے، جو باقی ہیں اُن کا انتظار ہے"[1]

مولانا کے کشف کے حیرت انگیز واقعات سننے میں آئے ہیں، ایک مرتبہ چھتہ لی مسجد میں یہ ذکر چھڑا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں ایسا زبردست تسلط حاصل کر لیا ہے کہ اُنکا اُکھڑنا آسان نہیں رہا، مولاناؒ اس مجلس میں موجود تھے، چونک کر بولے کیا کہا ـــــ رات کو اِن کی حکومت ہوگی اور دن کو اُن کی، ہندوستان بغیر جنگ کے صف کی طرح پلٹ جائیگا۔"

کون کہہ سکتا ہے کہ ۱۴، ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی شب میں ایسا ہی نہیں ہوا!

دوسرا واقعہ ارواح ثلاثہ میں ایک ایسے شخص کی روایت سے درج ہے جو خود اُس وقت موجود تھا، اس کا بیان ہے کہ اس زمانے میں ملکہ وکٹوریہ کی تاج پوشی کا جلسہ ہوا، حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ دہلی میں مقیم تھے، اور دن میں اکثر غائب رہتے تھے، راوی کہتا ہے کہ میں نے دریافت کیا کہ "آپ کہاں غائب رہتے ہیں"؟ فرمایا کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ نواح دہلی میں جس جس جگہ تمہارا قدم جائے گا وہ جگہ آباد کر دی جائے گی، اس لئے میں شہر کے اطراف میں گشت کیا کرتا ہوں تاکہ ویران شدہ مقامات پھر سے آباد ہو جائیں۔

---

[1] ارواح ثلاثہ مابین حکایت ۳۹۴ و ۴۰۴۔

راوی کا بیان ہے کہ جن جن مقامات پر مولانا پھرے تھے وہ جگہ نئی دہلی کے نام سے آباد ہونی شروع ہو گئی ہے[1]۔

آپ نے دو حج کئے، پہلا حج ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۱ء میں حضرت مولانا محمد قاسم قدس سرہٗ کی معیت میں کیا گیا، حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور حضرت حاجی محمد عابدؒ دیوبندی بھی ساتھ تھے، یہ سفر پنجاب اور سندھ کے راستے سے کیا گیا، بیاضِ یعقوبی میں خود انھوں نے اس سفر کی مفصل یادداشت لکھی ہے، دوسرے حج کے لئے ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں تشریف لے گئے اس مرتبہ بھی علماء کی ایک بڑی جماعت کی معیت رہی، حضرت مولانا نانوتوی، حضرت مولانا گنگوہی، حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا حکیم ضیاء الدین رام پوری، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی وغیرہ حضرات کے علاوہ اس مقدس قافلے میں تقریباً سو آدمی تھے[2]۔

مولوی جمال الدینؒ[3] مدار المہام بھوپال، حضرت مولانا مملوک علیؒ کے شاگرد تھے، انھوں نے اسی تعلق کی بنا پر حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کو ایک بڑے مشاہرہ پر بھوپال طلب فرمایا، مگر آپ نے دارالعلوم کی قلیل تنخواہ کے باوجود دارالعلوم سے ترک تعلق کو پسند نہ فرمایا اور

---

[1] ارواح ثلاثہ حکایت نمبر ۲۴۴ [2] مکتوبات یعقوبی، ص ۱۵۱ ۔ [3] مولوی جمال الدین نواحِ دہلی کے ایک قصبے کوتانہ کے رہنے والے تھے، ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء میں پیدا ہوئے، حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اور حضرت شاہ رفیع الدینؒ سے تحصیل علم کی، سابقہ ریاست بھوپال میں وزارتِ عظمیٰ پر فائز تھے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے خاص ارادت تھی، شاہ صاحب کی کئی کتابیں طبع کرائیں، جن میں حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفاء خاص اہمیت کی حامل ہیں، مولوی صاحب کی ایک کتاب کوکب دری ہے، جس میں قرآن مجید کے لغات کے معنی اُردو میں لکھے ہیں، ان کی صاحبزادی ذکیہ بیگم نواب سید صدیق حسن خاں کی پہلی بیوی تھیں، جن سے نواب علی حسن خاں اور نواب نور الحسن خاں تھے ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء میں انتقال ہوا۔

(مآثر صدیقی جلد دوم ص ۴۴ ــ ، ۵ و مکتوب مولانا خالد انصاری بھوپالی مؤرخہ ۲۱ اگست ۱۹۵۱ء بنام راقم سطور)

اپنے بھانجے مولانا خلیل احمد انبہٹوی کو بھوپال بھیج دیا۔

مولانا محمد یعقوبؒ شعر وشاعری سے ذوق رکھتے تھے، گمنام تخلص تھا، اُنھوں نے دہلی میں بزمانۂ طالب علمی، غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، صہباؔئی، اور آزردہ جیسے یگانۂ روزگار شعراء کو دیکھا تھا۔ اور ان کی مجالس سخن کے ہنگاموں سے اُن کے کان آشنا تھے، اپنے ایک خط میں اپنے مرید منشی محمد قاسم نیانگری کو مشورہ دیا ہے کہ وہ دردؔ سوداؔ اور ذوقؔ کے کلام کو پڑھا کریں، اس میں درد واثر ہے، مولانا کا فارسی اور اُردو کلام بیاضِ یعقوبی میں درج ہے، اشعار میں قدرتِ کلام کے ساتھ سوز وگداز اور درد واثر پایا جاتا ہے۔

تصانیف میں تین رسالے اُن کی یادگار ہیں، سوانح قاسمی اگرچہ بہت مختصر سوانح حیات ہے مگر زبان و بیان اور حالات و واقعات کے لحاظ سے بہت قابلِ قدر ہے۔

ان کا دوسرا مجموعہ مکتوباتِ یعقوبی ہے جو ۴۰ خطوط پر مشتمل ہے، یہ خطوط استفسارات کے جوابات میں لکھے گئے ہیں، ان میں راہِ سلوک کی دشواریوں کا حل، مسائلِ شرعیہ کا ذکر اور طریقت وسلوک کا دستور العمل بیان کیا گیا ہے۔

تیسرا مجموعہ بیاضِ یعقوبی ہے، یہ سفرِ حج کے حالات، کتبِ احادیث کی اسانید، منظومات اور عملیات وغیرہ پر مشتمل ہے، آخر میں طبی نسخے درج ہیں، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے دونوں مجموعوں پر حسبِ ضرورت حواشی تحریر فرمائے ہیں۔

وفات سے چند دن پہلے وطنِ مالوف نانوتہ تشریف لے گئے تھے، وہیں بمرضِ ہیضہ ۳ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔[1]

مکتوباتِ یعقوبی کی یادداشت میں لکھا ہے:۔

شبِ شنبہ یکم ربیع الاوّل ۱۳۰۲ھ جناب مولوی محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

---

[1] مکتوباتِ یعقوبی، ص ۱۵۳

اچانک بعد فراغت نمازِ عشاء در ہیضہ مبتلا شدہ، بیہوش شدند شب دوشنبہ قریب یک بجے وفات از جہاں فانی یافت، قبر شریف اوشاں در مقام نانوتہ جانب شمال لب سڑک سہارنپور واقع باغ لوکہ اُو را معین الدین پرورش کردہ است واقع شد انا للہ وانا الیہ راجعون ا۔ یں واقعہ جانکاہ است[1]

مکتوباتِ یعقوبی اور ارواح ثلاثہ میں جستہ جستہ آپ کے حالات ملتے ہیں۔

حضرت مولانا سیّد احمد دہلویؒ

مولانا موصوف نہایت جلیل القدر علماء میں سے تھے، منقولات کے ساتھ علوم معقولہ میں امام وقت سمجھے جاتے تھے، خصوصاً فنِ ریاضی و ہیئت میں تو اُن کا آوازۂ شہرت یورپ تک پہنچا ہوا تھا، حضرت مولانا محمد قاسمؒ فرمایا کرتے تھے کہ "مولوی سیّد احمد صاحب کو خداوندِ کریم نے فنون ریاضی میں وہ استعداد اور مناسبت عطا فرمائی ہے کہ ان فنون کے موجدوں کو بھی شاید اتنی ہی ہو"

قیامِ دارالعلوم کے تیسرے سال ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں مدرسِ دوم کی حیثیت سے بلائے گئے حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کی وفات پر مسندِ صدارت تفویض ہوئی، جس پر چھ سال تک فائز رہے، اس مدت میں ۲۸ طلباء نے اُن سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی، دارالعلوم کی صدر مدرسی کے دَوران ۱۳۰۶ھ میں حج کیا۔

۱۳۰۷ھ/۱۸۸۵ء میں دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کر کے بھوپال تشریف لے گئے، اور وہیں انتقال فرمایا۔

مولانا سیّد احمد دہلوی، حضرت نانوتویؒ سے بیعت تھے، حضرت تھانویؒ اپنی مثنوی زیر و بم کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

---

[1] مکتوبات یعقوبی، ص ۱۵۰۔

"جناب مولانا (سید احمد) بالخصوص در فنِ ریاضیہ ید طولیٰ می داشتند و کمالِ مہارت این فنون مشہور و معروف[1]"

جن شعروں پر مذکورہ بالا حاشیہ لکھا گیا ہے وہ یہ ہیں:-

دوُمی آں سالکِ شرعِ نبی	مولوی سید احمد دھلوی
وصفِ ذہنِ اُو اگر سازد رقم	ختم نبود بشکند صد ہا قلم
خاتمِ معقول و علم فلسفہ	ہم ریاضی و علومِ مشکلہ
پارسا و متقی، کم گو، حلیم	ہم سخی و ہم جواد و ہم کریم

افسوس ہے کہ مولانا سید احمدؒ کے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن

حضرت شیخ الہند دار العلوم کے سب سے پہلے شاگرد ہیں، اُن ہی کی نسبت کہا گیا ہے کہ جس نے سب سے پہلے اُستاد کے سامنے کتاب کھولی وہ محمود تھا، حضرت شیخ الہندؒ کی پیدائش ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء میں بریلی میں ہوئی، جہاں اُن کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی سرکاری محکمہ تعلیم سے وابستہ تھے، ابتدائی تعلیم اپنے مشہور عالم چچا مولانا مہتاب علی مرحوم سے حاصل کی، قدوری اور شرح تہذیب پڑھ رہے تھے کہ دار العلوم کا قیام عمل میں آیا، آپ اس میں داخل ہو گئے، ۱۲۸۶ھ میں نصابِ دار العلوم کی تکمیل کے بعد حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں رہ کر علم حدیث کی تحصیل فرمائی، بعد ازاں فنون کی بعض اعلیٰ کتابیں والد ماجد سے پڑھیں ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء میں حضرت نانوتویؒ کے دستِ مبارک سے دستارِ فضیلت حاصل کی[2]۔ زمانۂ تعلیم ہی میں آپ کا شمار حضرت نانوتویؒ کے ممتاز تلامذہ میں ہوتا تھا، اور حضرت نانوتویؒ خاص طور سے شفقت فرماتے تھے،

---

[1] مثنوی زیروبم بحوالہ القاسم دار العلوم نمبر ماہ محرم ۱۳۴۷ھ ص ۱۹ و ۲۰ -

[2] روداد دار العلوم ۱۲۹۰ھ ص ۱۰

چنانچہ اُن کی اعلیٰ علمی اور ذہنی صلاحیتوں کے پیشِ نظر دارالعلوم کی مدرسی کے لئے اکابر کی نظرِ انتخاب اُن کے اوپر پڑی اور ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں مدرس چہارم کی حیثیت سے آپ کا تقرر عمل میں آیا، جس سے بتدریج ترقی پاکر ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں صدارت کے منصب پر فائز ہوئے۔

ظاہری علم وفضل کی طرح باطن بھی آراستہ تھا، ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں اپنے استاد حضرت نانوتویؒ کی معیت میں حج سے مشرف ہوئے، مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ سے شرفِ بیعت حاصل کیا، اس سفرِ حج میں علماء کا ایک بڑا قافلہ بن گیا تھا، جس میں حضرت نانوتویؒ کے علاوہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ، مولانا محمد منیر نانوتویؒ، حکیم ضیاء الدین رام پوریؒ، مولانا احمد حسن کان پوری جیسے علمائے مشاہیر شامل تھے، قافلے کے جملہ حضرات کی تعداد سو کے قریب تھی، حضرت شیخ الہندؒ کو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے خلافت بھی حاصل تھی، دارالعلوم میں صدارتِ تدریس کا مشاہرہ اس وقت ۷۵ روپے تھا مگر آپ نے ۵۰ روپے سے زیادہ کبھی قبول نہیں فرمائے، بقیہ ۲۵ روپے دارالعلوم کے چندے میں شامل فرمادیتے تھے۔ آپ کی زبردست علمی شخصیت کے باعث طلباء کی تعداد ۲۰۰ سے بڑھ کر ۶۰۰ تک پہنچ گئی تھی، آپ کے زمانے میں ۸۶۰ طلباء نے حدیثِ نبوی سے فراغت حاصل کی، حضرت شیخ الہندؒ کے فیضِ تعلیم نے حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت مولانا منصور انصاری، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندی، مولانا سید فخر الدین احمد، حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہی، حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہم اللہ تعالے جیسے مشاہیر اور نامور علماء کی جماعت تیار کی۔

حضرت شیخ الہندؒ کے حلقۂ درس کی خصوصیات کی نسبت مولانا میاں اصغر حسینؒ

نے لکھا ہے :۔

"حلقۂ درس کو دیکھ کر سلفِ صالحین و اکابر محدثین کے حلقۂ حدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا۔ قرآن و حدیث حضرت کی زبان پر تھا، اور ائمہ اربعہ کے مذاہب ازبر، صحابہ و تابعین، فقہاء و مجتہدین کے اقوال محفوظ۔ تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتی تھیں، نہ منہ میں کف آتا تھا، نہ مغلق انفاظ سے تقریر کو جامع الغموض اور بھدی بناتے تھے، نہایت سُبک اور سہل الفاظ با محاورہ اُردو میں اس روانی اور جوش سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا کہ دریا اُمنڈ رہا ہے، یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے، ہزاروں دیکھنے والے موجود ہیں کہ وہی منحنی اور منکسر المزاج ایک مُشتِ استخوان، ضعیف الجثہ، مردِ خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی مسکین طالب علم معلوم ہوتا تھا، مسندِ درس پر تقریر کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیرِ خدا ہے، جو قوت و شوکت کے ساتھ حق کا اعلان کر رہا ہے، آواز میں کرختگی آمیز بلندی نہ تھی، لیکن مدرسے کے دروازے تک بے تکلف قابل فہم آواز آتی تھی، لہجے میں تصنع اور بناوٹ کا نام نہ تھا، لیکن خدا تعالیٰ نے تقریر میں اثر دیا تھا، بات دل نشین ہو جاتی تھی۔ اور سُننے والا بھی یہ سمجھ کر اُٹھتا تھا کہ وہ جو فرما رہے ہیں حق ہے۔

بہت سے ذی استعداد اور ذہین و فطین طالب علم جو مختلف اساتذہ کی خدمتوں میں استفادہ کرنے کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے اپنے شکوک و شبہات کے کافی جواب پانے کے بعد حضرت مولانا کی زبان سے آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویّہ کے معانی اور مضامینِ عالیہ سُن کر سرِ نیاز خم کر کے معترف ہوتے کہ یہ علم کسی کو نہیں ہے اور ایسا محقق عالم دنیا میں نہیں ہے۔

مسائل مختلف فیہا میں ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ بلکہ دیگر مجتہدین کے مذاہب بھی بیان فرماتے اور مختصر طور سے دلائل بھی نقل کرتے لیکن جب امام ابو حنیفہؒ کا نمبر آتا تو مولانا کے قلب میں انشراح، چہرے پر بشاشت، تقریر میں روانی، لہجے میں جوش پیدا ہو جاتا

تھا دلیل پر دلیل، شاہد پر شاہد، قرینے پر قرینہ بیان کرتے چلے جاتے تقریر رکتی ہی نہ تھی اور اس خوبی سے مذہب امام اعظمؒ کو ترجیح دیتے تھے کہ سلیم الطبع اور منصف المزاج لوٹ جاتے تھے، دور کی مختلف المضامین احادیث جن کی طرف کبھی خیال بھی نہ جاتا تھا پیش کرکے اس طرح مدعا ثابت فرماتے کہ بات دل میں اُترتی چلی جاتی اور سامعین کا دل گواہی دیتا اور آنکھوں سے نظر آجاتا تھا کہ یہی جانب حق ہے۔

بایں ہمہ ائمہ اسلام کا ادب واحترام اور اُن کے کمالات کا اعتراف حضرت کی تعلیم کا ایک جزلاینفک ہوگیا تھا، خود بھی ایسی ہی تقریر فرماتے اور صراحت سے ذہن نشین کراتے کہ مذاہب مجتہدین حق ہیں اور وہ سب مُستدل بالکتاب والسنۃ، اُن کی تنقیص، موجبِ بدبختی اور سوء ادب باعثِ خسران ہے۔

محدثین میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور ائمہ مجتہدین میں امام اعظمؒ کے ساتھ خاص تعلق تھا[1]۔

مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں کہ" میں نے حضرت شیخ الہندؒ سے حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی حجۃ الاسلام پڑھی، کتاب پڑھتے ہوئے کبھی کبھی یوں محسوس کرتا کہ جیسے علم اور ایمان میرے دل میں اوپر سے نازل ہو رہا ہے[2]۔

ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کا آغاز

پہلی جنگِ عظیم ابھی شروع نہیں ہوئی تھی مگر اُس کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے، برطانوی حکومت سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف اعصابی جنگ شروع کرچکی تھی، روز بروز حالات کی نزاکت بڑھتی جارہی تھی، یہاں تک کہ ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء میں جنگ کا خوفناک

---

[2] شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک ص ۲۶۶

[1] حیات شیخ الہندؒ مصنفہ مولانا میاں سید اصغر حسین ص ۲۳ - ۲۵

شعلہ بھڑک اُٹھا، یہ زمانہ حضرت شیخ الہندؒ کے لئے بڑی بے چینی اور اضطراب کا تھا، انڈین نیشنل کانگریس کا نصب العین اُس وقت تک حقوق طلبی کی حد سے آگے بڑھنے نہیں پایا تھا یہ حالات تھے جنہوں نے حضرت شیخ الہندؒ کو ایک انقلابی تحریک کی داغ بیل ڈالنے پر مجبور کردیا، اُنھوں نے مسلح انقلاب کے ذریعے سے برطانوی حکومت کا تختہ اُلٹ دینے کا ایک منصوبہ تیار کیا، جیساکہ آگے چل کر معلوم ہوگا یہ بڑا منظّم منصوبہ تھا۔

۱۳۳۰ھ ۱۹۱۱ء کا زمانہ دنیائے اسلام کے لئے سخت ابتلا کا زمانہ تھا، یورپ کی حکومتوں نے ایک خفیہ معاہدے کے ذریعے یہ طے کیا کہ ترکوں کی حکومت کا خاتمہ کردیا جائے، اس کا آغاز ترکی کے مقبوضہ علاقے طرابلس پر اٹلی کے حملے سے ہوا، فرانس نے مراکش پر غاصبانہ قبضہ کرلیا، بلقان کی عیسائی ریاستوں نے ترکوں پر پے در پے حملے شروع کردیئے، اس کارروائی کے پس پردہ تمام تر برطانوی سیاست کارفرما تھی، یہ واقعات ہر دردمند مُسلمان کے لئے تشویشناک تھے، ترکوں کے خلاف انگریز اور دوسری یورپی قومیں جس طرح برسرِ جنگ تھیں اور اُن کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا تہیہ کرچکی تھیں اس سے مُسلمانوں کے جذبات بیحد مشتعل تھے، اس لئے انگریزوں سے نفرت بڑھ رہی تھی، اس وقت ہندوستان کے مُسلمانوں میں بڑا جوش اور ہیجان پھیلا ہوا تھا، ساری دنیا کے مُسلمان خلافتِ عثمانیہ کو اسلام کی پشت پناہ سمجھتے تھے اور اُسے عظمت واحترام کی نظروں سے دیکھتے تھے، اس کے حکمرانوں کو خلیفۃ المسلمین اور خادم الحرمین الشریفین کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اس زمانے میں ہندوستان کے اندر مسلح انقلاب کے ذریعے سے انگریزوں کا اقتدار ختم کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر ایک منصوبہ تیار کیا، اس کے لئے اُنھوں نے نہایت منظم طور پر اپنا پروگرام مرتب کیا تھا، اُن کے شاگردوں اور رفقائے کار کی ایک بڑی جماعت جو ہندوبیرونِ ہند کے اکثر ممالک میں پھیلی ہوئی تھی، اُن کے مجوزہ پلان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نہایت سرگرمی اور جانبازی کے ساتھ کوشاں تھی، شاگردوں میں مولانا

عبیداللہ سندھی مولانا محمد میاں منصور انصاری اور دوسرے بہت سے تلامذہ اس میں شامل تھے، جنھوں نے حضرت شیخ الہندؒ کے سیاسی اور انقلابی پروگرام کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیں، یہ بڑی منظم تحریک تھی، اس نے آزادی کے لئے آئندہ پورے ہندوستان میں فضا ہموار کردی، یہ کام دو محاذوں سے شروع کیا گیا تھا، ایک محاذ اندرونِ ملک کا تھا، اور دوسرا ملک سے باہر، دونوں محاذوں پر مسلح جدوجہد کی تیاری کی جارہی تھی۔

اس وقت عام خیال تھا کہ طاقت کے بغیر انگریزوں کا ہندوستان سے نکال دینا ممکن نہیں ہے، اور چونکہ ہندوستانیوں سے ہتھیار چھین لئے گئے ہیں، اس لئے جنگِ آزادی شروع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلحہ اور سپاہ کی غیر ملکی امداد و اعانت حاصل کی جائے، اس سلسلے میں حضرت شیخ الہندؒ کی نظر سب سے پہلے افغانستان پر گئی، ہندوستان اور افغانستان کی سرحدیں ملی ہوئی ہونے کی وجہ سے وہاں سے مدد اور اسلحہ ملنا سب سے زیادہ آسان تھا، اسی کے ساتھ ہندوستان کی سرحد پر بسے ہوئے آزاد قبائل سے مدد لی جاسکتی تھی، اسلحہ اور سپاہ کا مرکز باغستان کے آزاد علاقے کو بنایا گیا تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ نے صوبہ سرحد کے اُن علماء سے جو دارالعلوم کے طالب علم رہ چکے تھے رابطہ قائم کیا، اُن کا منصوبہ یہ تھا کہ افغانستان سے لے کر ہندوستان تک انگریزوں کے خلاف ایک جال بچھا دیا جائے اور کسی مناسب موقع پر ہندوستان اور آزاد قبائل کی منظم طاقت برطانوی ہند پر حملہ آور ہو، اور دوسری طرف ملک بھر میں جنگ آزادی کا آغاز کردیا جائے، انکا خیال تھا کہ یہ ایک ایسی صورت ہوگی جس کا انگریز مقابلہ نہ کرسکیں گے۔

ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے باہر کی حکومتوں سے بھی اس سلسلے میں مدد لینا ضروری تھا، اس بناء پر آپ نے مولانا عبیداللہ سندھی کو ایک خاص مشن پر کابل جانے کا حکم دیا اور مولانا محمد میاں منصور انصاری کو آزاد قبائل میں جہاد کی تلقین کے لئے بھیجا اور ترکوں سے مدد حاصل کرنے کے لئے خود حجاز کا سفر کیا، انگریز اس زمانے میں جرمنی سے جنگ میں مصروف تھے

رولٹ کمیٹی[1] کے پیراگراف ۱۶۴ میں سرکاری طور پر ریشمی خطوط کی تحریک کے متعلق جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے :۔

" اگست ۱۹۱۶ء / ۱۳۳۴ھ میں ریشمی خطوط کے واقعات کا انکشاف ہوا، یہ ایک منصوبہ تھا جو ہندوستان میں اس خیال سے تجویز کیا گیا تھا کہ ایک طرف شمال مغربی سرحد پر گڑبڑ پیدا کرے اور دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں کی شورش سے اسے تقویت دے کر برطانوی حکومت کو ختم کر دیا جائے، اس منصوبے کو عمل میں لانے کے لئے مولوی عبید اللہ نامی ایک شخص نے اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ اگست ۱۹۱۵ء / ۱۳۳۳ھ میں شمال مغربی سرحد کو عبور کیا عبید اللہ پہلے سکھ تھا بعد میں مسلمان ہوا، اس نے دیوبند میں مذہبی تعلیم حاصل کی، عبید اللہ نے جن لوگوں پر اپنا اثر ڈالا ان میں سب سے بڑی شخصیت مولانا محمود حسن کی تھی، جو مدتوں اس درس گاہ کے صدر مدرس رہے ہیں، عبید اللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے فارغ التحصیل علماء کے ذریعے سے ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف ایک عالمگیر اسلامی تحریک چلائے، مولانا محمود حسن کے مکان پر خفیہ مجالس قائم ہوتی تھیں، کہا جاتا ہے کہ سرحد کے کچھ آدمی بھی ان میں شریک ہوتے تھے، ۸ ستمبر ۱۹۱۵ء / ۱۳۳۳ھ کو مولانا محمود حسن نے ہندوستان چھوڑ دیا اور حجاز پہنچ گئے عبید اللہ اور مولانا محمود حسن کا اہم مقصد یہ تھا کہ بیک وقت ہندوستان پر باہر سے بھی حملہ کرایا جائے اور ہندوستان میں بھی بغاوت پھیلائی جائے، عبید اللہ اور اس کے دوستوں نے پہلے ہندوستانی متعصب جماعتِ مجاہدین سے ملاقات کی پھر کابل پہنچے، وہاں عبید اللہ کی ملاقات ترک جرمن مشن سے ہوئی، کچھ عرصے کے بعد اس کا دیوبندی دوست محمد میاں بھی اس

---

[1] ہندوستان میں عام سیاسی بے چینی کا میلان دیکھ کر برطانوی حکومت نے ۱۹۱۷ء / ۱۳۳۶ھ میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی تھی جس نے بہت سی خفیہ جماعتوں کے حالات کا سراغ لگایا، اس تحقیقاتی کمیٹی کا صدر ایک انگریز جج رولٹ تھا، اسی کے نام پر یہ کمیٹی موسوم ہے۔ (تاریخ ہند ہاشمی فرید آبادی ص ۴۴۳)

سے جا ملا، یہ شخص مولانا محمود حسن کے ساتھ حجاز چلا گیا تھا، اور وہاں سے ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۶ء میں جہاد کا ایک اعلان حاصل کر کے واپس آیا تھا، جسے مولانا محمود حسن نے حجاز کے ترکی سپہ سالار غالب پاشا سے حاصل کیا تھا، یہ دستاویز "غالب نامہ" کے نام سے مشہور ہے، محمد میاں نے اس کی فوٹو کاپیاں راستے میں ہندوستان اور سرحدی قبائل میں تقسیم کیں۔

عبید اللہ اور اس کے ساتھیوں نے برطانوی حکومت کے خاتمے پر عارضی حکومت کے لئے ایک تجویز تیار کی تھی، اس تجویز کے مطابق مہندر پرتاپ[۱] نامی ایک شخص کو صدر ہونا تھا، یہ شخص ایک معزز خاندان کا جوشیلا ہندو ہے، ۱۳۳۲ھ ۱۹۱۴ء کے آخر میں اسے سوئزرلینڈ، اٹلی اور فرانس وغیرہ جانے کا پاسپورٹ دیا گیا تھا، یہ سیدھا جنیوا گیا، اور وہاں بدنام زمانہ ہردیال[۲] سے ملا، جس نے اسے جرمن قونصل سے ملایا، وہاں سے یہ جرمن آیا اور ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا، خود

---

۱ راجہ مہندر پرتاپ ضلع متھرا کے ایک رئیس تھے، ۱۳۳۲ھ ۱۹۱۴ء میں ہندوستان سے سوئزرلینڈ چلے گئے اور امریکن غدر پارٹی میں شامل ہو گئے، پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں جرمنی سے جو مشن افغانستان بھیجا گیا تھا اس میں جرمن اور ترک ممبران کے ساتھ یہ بھی شریک تھے، قیام کابل کے زمانے میں عارضی حکومت کی جانب سے روسی ترکستان کے گورنر اور زار روس کو جو خطوط بھیجے گئے تھے، ان پر عارضی حکومت کے صدر کی حیثیت سے راجہ مہندر پرتاپ نے دستخط کئے تھے، ان خطوط میں دونوں حکومتوں سے برطانیہ کا ساتھ چھوڑنے اور ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے میں مدد دینے کی درخواست کی گئی تھی۔

(نقش حیات جلد دوم ص ۲۱۱، ۲۱۲ و ۲۴۲)

راجہ مہندر پرتاپ ہندوستان کی آزادی سے کچھ پہلے اپنی سیاسی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر کے ہندوستان واپس آ گئے تھے، اب تک بقید حیات ہیں دہرہ دون میں قیام ہے، خود راجہ مہندر پرتاپ کے بیان کے مطابق وہ اس وقت تک کے لئے صدر مقرر ہوئے تھے جب تک کانگریس حکومت بنائے۔ اس عارضی حکومت میں مولوی برکت اللہ وزیر اعظم اور مولانا سندھی کو وزیر داخلہ بنایا گیا تھا۔ (میری داستان حیات MY LIFE STORY ص ۴۸)

۲ جن حریت پسند ہندوستانیوں نے امریکہ اور یورپ (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

خود عبیداللہ کو وزیر ہند اور برکت اللہ کو وزیراعظم بننا تھا، برکت اللہ[1] کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا۔

۱۹۱۶ء / ۱۳۳۴ھ کی ابتدا میں مشن کے جرمن ممبر اپنے مقصد میں ناکام ہو کر افغانستان سے چلے گئے[2] مگر ہندوستانی ممبر وہیں رہے، انھوں نے عارضی حکومت کی جانب سے روسی ترکستان کے گورنر اور زارِ روس کو خطوط بھیجے، جن میں اُن سے برطانیہ کا ساتھ چھوڑنے اور ہندوستان

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کے ملکوں میں بیٹھ کر آزادی کے لئے کوششیں شروع کر دی تھیں، ان میں لالہ ہردیال کی غدر پارٹی کو خاصی شہرت حاصل ہوئی ہے، [1] مولانا برکت اللہ نے بھوپال میں تعلیم پائی تھی، وہ اصلاً فتح پور کے رہنے والے تھے، مگر خود اپنے آپ کو بھوپالی لکھتے تھے، قرآن مجید اور صحاحِ ستہ کے گویا حافظ تھے، میٹرک تک انگریزی بھی پڑھی تھی، تبلیغِ اسلام کے جوش میں انگلستان گئے وہاں سے امریکہ پہنچے اور کچھ عرصے تک ٹوکیو یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر رہے، ہر مقام پر تبلیغ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کی تنظیم اور آزادیٔ وطن کے لئے کوشاں رہتے تھے، امیر حبیب اللہ خاں نے بامراد ان کو اپنے پاس ٹھیرا لیا تھا، مگر کچھ مدت کے بعد روس چلے گئے، لینن اُن کی بڑی عزت کرتا تھا۔

روس سے جرمنی، فرانس اور سوئزرلینڈ گئے، آخر میں کیلی فورنیا جاکر وفات پائی۔

(سرگزشت مجاہدین، غلام رسول مہر ص ۵۱۳)

[2] افغانستان میں جرمن مشن کی ناکامی سے ہندوستان کی آزادی چوتھائی صدی کے لئے مؤخر ہو گئی، افغانستان کے فرماں روا امیر حبیب اللہ خاں نے جرمن مشن سے کہا تھا کہ ہندوستان پر افغانستان سے حملہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے انڈین نیشنل کانگریس سے معاہدہ ہو جانا چاہیے، اور اس کے لئے ہندوستانی لیڈروں میں سے مولانا محمد علی یا پنڈت موتی لال نہرو میں سے کسی لیڈر کو کابل آنا چاہیئے، مگر جرمن مشن افغانستان کو اس نوع کی یقین دہانی میں کامیاب نہ ہوسکا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ دیوبند ص ۲۲۲ تا ۲۲۴ اور مشاہدات کابل و یاغستان ص ۲۲ بحوالہ سرگزشت مجاہدین مولانا غلام رسول مہر ص ۵۱۵

میں برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لئے امداد طلب کی گئی تھی، ان خطوط پر راجہ مہندر پرتاپ کے دستخط تھے، زارِ روس کو جو خط لکھا گیا تھا وہ سونے کی تختی پر تھا، اس عارضی حکومت کی ایک تجویز یہ بھی تھی کہ ترکی حکومت سے روابط قائم کئے جائیں، اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے عبیداللہ نے ۹ جولائی ۱۹۱۶ء / ۱۳۳۴ھ کو مولانا محمود حسن کے نام ایک خط لکھا، اس کے ساتھ دوسرا خط محمد میاں انصاری کا تھا، جس میں غالب نامہ کی اشاعت کا ذکر تھا، عارضی حکومت اور "حزبُ اللہ" کے نام سے فوج کے قیام کی تجویز درج تھی، اس فوج کی بھرتی ہندوستان سے کرنی تجویز ہوئی تھی، عارضی حکومت کا کام اسلامی حکومت کے درمیان اتحاد کا سلسلہ قائم کرنا تھا، مولانا محمود حسن سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ سارے واقعات سلطنتِ عثمانیہ تک پہنچا دیں، یہ خطوط زرد ریشم پر لکھے گئے ہیں[1]۔

عبیداللہ کے خط میں حزبُ اللہ کا مکمل و مرتب نقشہ تھا، اس فوج کا مرکز مدینہ میں قائم ہونا تھا، خود مولانا محمود حسن کو اس کا سالارِ اعلیٰ بننا تھا، ثانوی مرکز مقامی سالاروں کے ماتحت قسطنطنیہ، طہران اور کابل میں قائم ہونے تھے، کابل کا سالار عبیداللہ کو بننا تھا، اس فہرست میں تین سرپرستوں بارہ جنرلوں اور کئی اعلیٰ فوجی عہدہ داروں کے نام درج ہیں، یہ "ریشمی خطوط" برطانوی حکومت کے ہاتھ آگئے ہیں، ان خطوط میں جو اطلاعات درج ہیں انکی وجہ سے چند پیش بندیاں مناسب سمجھی گئیں، ۱۹۱۶ء / ۱۳۳۵ھ میں مولانا محمود حسن اور اُن کے چار ساتھی برطانوی حکومت کے قبضے میں آگئے، وہ اس وقت برطانوی نگرانی میں جنگی قیدی ہیں، غالب نامہ پر دستخط کرنے والا غالب پاشا بھی جنگی قیدی ہے، اس نے یہ اقرار کیا ہے کہ محمود حسن پارٹی نے میرے سامنے ایک خط رکھا تھا جس پر میں نے دستخط کئے ہیں[2]"

---

[1] انہی خطوط کی وجہ سے حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک "ریشمی خطوط" کے نام سے موسوم ہے۔

[2] ذاتی ڈائری مولانا عبیداللہ سندھیؒ ص ۵۳، ۶۰ بحوالہ نقش حیات جلد دوم ص ۲۳۸ - ۲۴۴

شیخ الہندؒ نے اپنی مجوزہ اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے پیرانہ سالی کے باوجود ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء میں حجاز کا سفر فرمایا، وہاں کے ترکی گورنر غالب پاشا اور انور پاشا سے جو اسوقت ترکی کے وزیر جنگ تھے ملاقات فرما کر بعض اہم امور طے کئے۔ آپ حجاز سے براہ بغداد بلوچستان ہوتے ہوئے سرحد کے آزاد قبائل میں پہنچنا چاہتے تھے کہ اچانک جنگِ عظیم کے دوران میں شریف حسین والیٔ مکہ نے انگریز حکام کے ایماء پر آپ کو گرفتار کر کے اُن کے حوالے کر دیا، یہ گرفتاری رفقاء سمیت ۲۳ صفر ۱۳۳۵ھ کو ہوئی، حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عزیر گل، حکیم نصرت حسین اور مولوی وحید احمد بھی گرفتار کئے گئے، مکہ مکرمہ سے آپ کو جدہ لے جایا گیا، وہاں ایک ماہ کے قریب نظر بند رکھا گیا، ۱۸ ربیع الاوّل ۱۳۳۵ھ (۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء) کو جہاز پر سوار کرا کر سوئز لے جایا گیا، اور پھر وہاں سے مالٹا لے جایا گیا، جو برطانوی قلمرو میں جنگی مجرموں کے لئے محفوظ ترین مقام سمجھا جاتا تھا، حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے رفقاء کے بیانات لئے گئے، بیان کے دوران جو سوالات کئے گئے انمیں یہ تین سوال اہم تھے :۔

(۱) آپ کا مدینہ منورہ میں غالب پاشا اور دوسرے ترکی وزراء سے ملاقات کا مقصد کیا تھا ؟

(۲) آپ نے ترکوں کے خلاف تکفیر کے فتویٰ پر دستخط کرنے سے کیوں گریز کیا ہے ؟

(۳) افغانستان میں مولانا عبید اللہ سندھی کی سیاسی سرگرمیوں کی تفصیل دریافت کی گئی تھی۔

اِدھر ہندوستان میں حضرت شیخ الہندؒ کے رفقاء سے تفتیش کی گئی، غرض کہ ہندوستان میں ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ (ستمبر ۱۹۱۶ء) سے لے کر ایک سال سے کچھ زائد مدت تک تفتیش کا سلسلہ جاری رہا، "سفرنامہ اسیرِ مالٹا" اور "نقشِ حیات" میں اس کی پوری تفصیلات درج ہیں،

مالٹا میں سوا تین سال مع رفقاء نظر بند رکھا گیا، جنگ کے ختم ہونے پر آپ کو ہندوستان آنے کی اجازت ملی اور ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ ۱۹۲۰ء کو آپ نے ساحل بمبئی پر قدم رنجہ فرمایا، دیوبند پہنچ کر آپ سب سے پہلے دارالعلوم میں تشریف لائے، بعد ازاں مکان تشریف لے گئے۔

ہندوستان پہنچتے ہی حضرت شیخ الہندؒ تحریکِ خلافت میں شریک ہو گئے، برطانوی حکومت کے خلاف آپ نے ترکِ موالات کا فتویٰ دیا، جس سے ملک میں زبردست ہیجان پیدا ہو گیا، حضرت شیخ الہندؒ کے منصوبے کے انکشاف کے بعد اگرچہ ریشمی خطوط کی تحریک بظاہر ختم ہو گئی، مگر حضرت شیخ الہندؒ کے جذبۂ حریت میں کوئی کمی نہیں آئی، ہندوستان پہنچنے پر برطانوی حکومت نے مختلف ذرائع سے اُن کو سیاسیات سے کنارہ کش رہنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر انھوں نے اسے مسترد کر دیا، بمبئی میں جہاز سے اُترنے پر مولانا شوکت علی مرحوم اور خلافت کمیٹی کے ممبروں سے ملاقات ہوئی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنؤ سے، اور گاندھی جی احمد آباد سے آکر بمبئی میں ملے، دوسرے لیڈروں سے بھی باتیں ہوئیں[1]، حضرت شیخ الہندؒ خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء ہند کے ساتھ آزادیٔ وطن کی تحریک

---

[1] سر رحیم بخش جو اس زمانے کی سربرآوردہ شخصیت تھے [illegible] ریاستوں کے حلقوں میں اُنھیں خاص اثر و رسوخ حاصل تھا، برطانوی حکام کے ایماء سے وہ بھی استقبال کے لئے ساحل بمبئی پر موجود تھے، اُنھوں نے مختلف طریقوں سے اس کی کوشش کی کہ حضرت شیخ الہند سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کرلیں، مگر حضرتؒ نے بشدت انکار فرما دیا۔

مولوی سر رحیم بخش ٹھسکامیراں ضلع کرنال کے ایک راجپوت زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے وہ ابتداء میں لاہور چیفس کالج کے ہوسٹل میں سپرنٹنڈنٹ اور طلباء کے اتالیق تھے، جس میں والیان ریاست کے بچے پڑھتے تھے، پھر ریاست بہاول پور میں کونسل آف ریجنسی کے (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

میں شریک ہوگئے اور اس طرح ہندوستان کی آزادی کے لئے مسلح بغاوت کا منصوبہ ختم ہوگیا۔

مولانا عبیداللہ سندھی کی ذاتی ڈائری کے دیباچہ نگار نے لکھا ہے کہ:۔

"شیخ الہندؒ کی جماعت کو گزشتہ جنگِ عظیم میں وہ ہی حیثیت حاصل تھی جو دوسری جنگ کے دوران آزاد ہند فوج اور آزاد حکومت ہند کو حاصل رہی ہے، جس طرح بعد از جنگ کی موجودہ سرگرمیاں دراصل دورانِ جنگ کی باغیانہ جدوجہد کی ترقی یافتہ صورت ہے اسی طرح تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء/۱۳۳۸ھ تا ۱۹۲۲ء/۱۳۴۱ھ) کی سیاسی جدوجہد حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت اور ان کے شرکاء کار کی سرگرمیوں کی ترقی یافتہ صورت تھی، اگر آزاد ہند کے کارناموں کا سہرا سبھاش چندر بوس کے سر ہے تو پہلی جنگِ عظیم کے بعد کی سرگرمیوں کا مرکز حضرت شیخ الہندؒ تھے اُنکی سیاسی سرگرمیاں ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ سے شروع ہوئی تھیں اور اس پروگرام کا جزو تھیں جس کو مولانا عبیداللہ سندھی شاہ ولی اللہؒ کی سیاسی تحریک کے نام سے یاد کرتے ہیں۔"[1]

پہلی جنگِ عظیم میں خلافت عثمانیہ کی شکست کے بعد ہندوستان میں تحریکِ خلافت بڑے زور شور سے شروع ہوئی، یہ درحقیقت ملک کی آزادی کے لئے عظیم پیمانے پر ایک منظم کوشش کا آغاز تھا جس کے سامنے انڈین نیشنل کانگریس کی ملک گیر سیاست ماند پڑ گئی تھی، گاندھی جی نے اس وقت اپنے غیر معمولی سیاسی تدبر اور دُور بینی کا ثبوت دیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) پریذیڈنٹ مقرر ہوئے نیک اور دین دار اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت کا تعلق تھا، اُن کے ذریعے سے بھاولپور میں متعدد دینی اصلاحات عمل میں آئیں ایک عرصے تک مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کے سرپرست رہے، دارالعلوم دیوبند سے بھی اُنھیں تعلق تھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تحریک کے بھی حامی تھے، ۳؍ محرم ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء کو ۷۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

[1] دیباچہ ذاتی ڈائری مولانا عبیداللہ سندھیؒ۔ سید محبوب رضوی

اُنھوں نے موقع کے سنگین حالات کی نزاکت کا احساس کر کے انڈین نیشنل کانگریس کو خلافت کمیٹی کے ساتھ مربوط کر دیا، جس کے نتیجے میں ہندوستان کی قومی تحریک میں اتنی توانائی اور زور پیدا ہوگیا کہ انگریز حکمرانوں کو ہندوستان کا سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ اس مربوط اور متحدہ جدوجہد کا یہ اثر ہوا کہ ہندوستان نے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ آزادی کی منزلیں طے کرلیں اور صرف ۲۰ سال کی مدت میں ملک آزاد ہوگیا۔

جدوجہد آزادیٔ ہند کی تاریخ میں اس اہم موڑ کو نظر انداز کر دینا قرینِ انصاف نہیں ہے، اگر گاندھی جی اُس وقت کانگریس اور خلافت کمیٹی کو مربوط نہ کر دیتے تو ہندوستان کے لئے آزادی کی منزل اس قدر جلد طے کرلینا ہرگز آسان نہ ہوتا!

ہندوستان تشریف لانے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ تحریکِ خلافت میں شریک ہوگئے آپ نے برطانوی حکومت کے خلاف ترکِ موالات کا فتویٰ دیا جس سے ملک میں زبردست ہیجان پیدا ہوگیا، حتیٰ کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تک کو لوگ بند کرنے پر آمادہ ہوگئے، اس زمانے میں حضرت شیخ الہندؒ سخت علیل تھے، لیکن اسی حالت میں آپ علی گڑھ تشریف لے گئے، اور جامعہ ملّیہ اسلامیہ (جو بعد کو دہلی منتقل ہوگئی) کا افتتاح ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء (۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ) کو علی گڑھ کی جامع مسجد میں کیا، اس موقع پر آپ نے جو اہم سیاسی خطبہ دیا تھا وہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

حضرت شیخ الہندؒ کا ایک نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ اُن کی مساعی سے علی گڑھ اور دیوبند ایک پلیٹ فارم پر نظر آنے لگے، اور علی گڑھ اور دیوبند کے مابین جو بُعد تھا وہ بڑی حد تک کم ہوگیا، غرض کہ آپ علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے علاوہ سیاست و تدبر میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اگرچہ مالٹا سے واپسی کے بعد صحت بگڑ چکی تھی اور قویٰ پیرانہ سالی کے باعث نہایت ضعیف ہوگئے تھے مگر بایں ہمہ آپ نے نہایت شدّ و مد کے ساتھ سیاسی کاموں میں حصہ لیا، طبیعت اس بارِ گراں کی متحمل نہ ہوسکی، اسی دَوران میں علی گڑھ کا سفر پیش آیا، واپسی کے بعد

جب حالت زیادہ تشویشناک ہوگئی تو بغرض علاج ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے یہاں دہلی لیجایا گیا، حکیم اجمل خاں بھی شریکِ علاج تھے، مگر وقتِ موعود آچکا تھا ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ (۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء) کی صبح کو عازم ملکِ بقا ہوگئے۔

جنازہ دیوبند لایا گیا اور اگلے روز حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی قبر مبارک کے قریب یہ گنجینۂ فضل و کمالات دُنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہوگیا۔

شاگردوں میں بے شمار علماء و فضلاء کے علاوہ قرآن مجید کا اُردو ترجمہ، ادلۂ کاملہ، ایضاح الادلہ، احسن القریٰ، جہد المقل، الابواب والتراجم اور مختلف فتاویٰ اور سیاسی خطبات تصنیفی یادگار ہیں۔

مندرجہ ذیل کتابوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے تفصیلی حالات درج ہیں:۔

(۱) حیاتِ شیخ الہندؒ، مصنفہ مولانا میاں اصغر حسین دیوبندیؒ

(۲) نقشِ حیات، مصنفہ مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ

(۳) اسیرِ مالٹا، مصنفہ مولانا مدنیؒ

(۴) تذکرہ شیخ الہندؒ، مصنفہ مولانا عزیز الرحمٰن بجنوری

(۵) تحریک شیخ الہند، مرتبہ مولانا سیّد محمد میاںؒ

ایک بے بنیاد الزام

حضرت شیخ الہند کی گرفتاری کے لئے بعض لوگوں نے اہتمام دارالعلوم کو ذمہ دار قرار دیا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی یہ تحریک نہایت رازدارانہ اور خفیہ تھی مخصوص افراد کے علاوہ کسی کو اس کا علم نہ تھا، برطانوی حکومت کو اہتمام کے ذریعے سے تحریک کے خفیہ رازوں کا پتہ چلا، جس کے نتیجے میں گرفتاری عمل میں آئی، گرفتاری کے اسباب کا جائزہ لینے اور صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ گرفتاری کے سلسلے میں جو واقعات پیش آئے اُن کا

غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تاکہ واقعے کی اصلیت کا پتہ چل سکے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کی جو صورت پیش آئی اُس کو دیکھتے ہوئے اس الزام کی صحت پر یقین کرنا مشکل ہے۔ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ جو اس گرفتاری کی اہم سرکاری دستاویز ہے اس میں لکھا ہے کہ "اس سازش کا انکشاف اگست ۱۹۱۶ء میں ہوا"۔[1]

یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اگست ۱۹۱۶ء مطابق شوال ۱۳۳۴ھ کا یہ وہ زمانہ تھا جس میں حضرت شیخ الہندؒ حجاز میں مقیم تھے اور ٹھیک ایک سال قبل اگست ۱۹۱۵ء میں حج کے لئے تشریف لے جاچکے تھے، اور حج کے بعد اپنے سیاسی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف تھے، سرحد کے آزاد قبائل کو انگریزوں کے خلاف جنگ برپا کرنے کے لئے غالب پاشا گورنر حجاز سے وہ مشہور ترغیبی خط لکھوایا جاچکا تھا جو ہندوستان کی تاریخ میں "غالب نامہ" کے نام سے موسوم ہے، "غالب نامہ" کے حصول کے بعد حضرت شیخ الہندؒ خود آزاد قبائل میں پہنچنے کی تیاری کر رہے تھے کہ مکہ مکرمہ میں اچانک اُن کو مع رفقاء کے گرفتار کرلیا گیا، یہ تمام تفصیل حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کی خود نوشت سوانح نقش حیات سے ماخوذ ہے۔

حیاتِ شیخ الہندؒ جو حضرت مولانا میاں اصغر حسین کی تالیف ہے اور رجب ۱۳۳۹ھ میں حضرت شیخ الہندؒ کے انتقال (۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ) کے تین چار ماہ بعد لکھی گئی ہے۔ اس میں حضرت میاں صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"سفرِ حج کے وقت تک حضرت کے طرزِ عمل پر گورنمنٹ کو کوئی شبہ نہ تھا، آپ کا سفرِ حج مذہبی سفرِ حج سمجھا گیا، یہی وجہ ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے حضرت کی روانگی اور بمبئی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے نقشِ حیات جلد دوم ص ۲۲۸ ۔ مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۴ء

پہونچنے کے بعد روانگی جہاز تک کوئی غیر معمولی تفتیش و جستجو نہیں ہوئی اور نہ کسی قسم کے خاص سوال وجواب کی نوبت آئی، بمبئی میں پاسپورٹ حاصل کرنے کے وقت حضرت اور آپ کے رفقاء سے کچھ زیادہ تحقیقات وسوالات نہیں کئے گئے، بلکہ دیگر حجاج کی طرح معمولی اُمور دریافت کر کے پاسپورٹ دے دیا گیا[1]

حضرت مولانا مدنیؒ نقشِ حیات میں تحریر فرماتے ہیں کہ عام لوگوں میں یہ مشہور ہوگیا کہ مولانا (شیخ الہندؒ) دیوبند سے ہجرت کر کے جارہے ہیں، اور اب ہمیشہ حرمین شریفین ہی میں عمر بسر فرمائیں گے، اور چونکہ مولانا مرحوم نے بخوفِ وفات اپنی جائیداد شرعی طریقے پر ورثا میں تقسیم کر دی تھی، اس لئے اور بھی لوگوں کو اس خیال سے تقویت ہوئی، مولانا نے ایک عرصے تک کے لئے اپنے گھر کے مصارف کا بھی انتظام کر دیا تھا"[2]

واقعۂ سفر کی اس نوعیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ برطانوی حکومت حضرت شیخ الہندؒ کے سفرِ حجاز کے وقت تک اُن کی سیاسی تحریک سے بے خبر تھی، یا کم از کم اس کے پاس کوئی ایسا ثبوت موجود نہیں تھا، جس کی بنیاد پر وہ کوئی قانونی کارروائی کرسکتی، اگر اہتمام دارالعلوم کے ذریعے سے برطانوی حکومت کو حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کا علم ہوچکا تھا جیسا کہ بعض حلقوں کی جانب سے کہا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی اطلاع سفرِ حج سے پہلے ہی حکومت کو مل جانی چاہیئے تھی اور اُسی وقت سے تحقیق کا سلسلہ شروع ہوجانا چاہیئے تھا، مگر اس کی تردید برطانوی حکام کی اُس روش سے ہوتی ہے جو اُس نے ایک سال کے بعد اختیار کی، نقشِ حیات میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں ذیقعدہ ۱۳۳۴ھ (ستمبر ۱۹۱۶ء) سے لے کر ایک سال سے کچھ زائد عرصے تک تفتیش کا سلسلہ جاری رہا[3] گویا حضرت شیخ الہندؒ اور اُن کے رفقاء ومتوسلین کی

---

[1] حیات شیخ الہندؒ ص ۳۱ و ۳۲۔ [2] نقش حیات جلد دوم ص ۲۰۵

[3] نقش حیات جلد دوم ص ۲۲۸ - ۲۰۴

گرفتاری اور تحقیقات کا سلسلہ ستمبر ۱۹۱۶ء میں اُس وقت شروع ہوا جب وہ حجاز میں مقیم تھے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر برطانوی حکومت کو اہتمام دارالعلوم کے ذریعے سے حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کا علم ہو چکا تھا، تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں حکومت ہرگز اُن کو سفرِ حجاز کی اجازت نہیں دے سکتی تھی، اور پھر ایک ایسے ملک میں جانے کے لئے جہاں ترکوں کی حکومت قائم تھی، اور جن سے انگریزوں کی وہ جنگ چھڑی ہوئی تھی جو پہلی جنگِ عظیم کے نام سے موسوم ہے، حکومت کے نزدیک حضرت شیخ الہندؒ کا "جرم" بھی بڑا سنگین تھا، یعنی انگریزوں کے خلاف "بغاوت" برپا کرنا، اور ترکوں کی امداد لے کر برطانوی حکومت کا تختہ اُلٹ دینا، اندریں حالات برطانوی حکومت کی جانب سے کسی کارروائی کا نہ کیا جانا اور انکو رفقاء سمیت سفرِ حجاز کی اجازت دے دینا سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کرنے کا موقع تو برطانوی حکومت کو بعد میں بالکل اتفاقی طور پر ہاتھ آ گیا، اس کی صورت یہ ہوئی کہ شریفِ مکہ نے جنگِ عظیم کے دَوران ترکی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور وہ انگریزوں کا حلیف بن گیا، انگریزوں نے شریفِ مکہ سے حضرت شیخ الہندؒ کو جنگی مجرم کی حیثیت سے طلب کیا تو شریفِ مکہ نے حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کر کے برطانوی حکام کے حوالے کر دیا، اس لئے کہ برطانوی حکومت نے شریفِ مکہ کو ترکوں کے خلاف بغاوت برپا کرنے میں مدد دی تھی، اگر شریفِ مکہ ترکوں سے بغاوت نہ کرتا تو ترکی حکومت کی حدود میں حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کرنے کی کوئی صورت ممکن نہ تھی۔

اس وقت کے برطانوی دَور کا جو خُفیہ سرکاری ریکارڈ "ریشمی خطوط سازش کیس" کے عنوان سے ابھی حال میں منظرِ عام پر آیا ہے اس سے بھی الزام کے غلط ہونے کی تائید ہوتی ہے، سرکاری ریکارڈ میں حضرت شیخ الہندؒ کے سفرِ حج کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اگست ۱۹۱۶ء میں برطانوی حکام کو جب ریشمی خطوط ہاتھ آئے اُس وقت اِس تحریک کا علم ہو سکا، سرکاری

رپورٹ میں ہے کہ :-

"محمود حسن اور خلیل الرحمٰن[1] کے بارے میں یو، پی، سی، آئی، ڈی سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان دونوں کو غیر وفادار سمجھا جاتا ہے، نیز محمود حسن کو مسلمانوں سے چندے کی بڑی بڑی رقمیں مل رہی ہیں، اور یہ کہ وہ اور ڈاکٹر انصاری (ڈاکٹر مختار احمد انصاری) حلیف اور شرکار کار ہیں، ان کے بارے میں شبہ ہے کہ سرحد پار کے مخالف اور منحرف لوگوں سے ان کا رابطہ ہے اور اس مشن کے سامنے سیاسی مقاصد ہیں[2]۔"

آگے چل کر لکھا ہے :-

"یہ بھی افواہ تھی کہ وہ حجاز میں چند خاص ترک افسروں سے ملاقات کریں گے، لیکن بروقت کوئی ایسی اطلاع نہیں مل سکی جس سے اُن کو ہندوستان ہی میں روکا جا سکے[3]،

۱۹۱۵ء کے موسم خزاں میں اور ۱۹۱۶ء کے موسم بہار میں ان پارٹیوں کے بعض اراکین ہندوستان لوٹ آئے، لیکن جب تک ریشمی خطوط کے ذریعے ہمیں عبیداللہ کی سازش اور محمود حسن کے اُس سے تعلق کے بارے میں قابلِ اطمینان واقفیت حاصل نہ ہوئی اُن سے پوچھ تاچھ نہیں کی گئی[4]۔"

اس سرکاری خفیہ رپورٹ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ سفرِ حج کے ایک سال بعد تک برطانوی حکام کو حضرت شیخ الہندؒ کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں صرف شبہات تھے، اور ان کے علم میں کوئی قابلِ وثوق اطلاع نہ تھی۔ برطانوی حکام کو تحریک کا پتہ اُس وقت چلا جب اُن کو ریشمی خطوط دستیاب ہو گئے۔

---

[1] صحیح نام خلیل احمد ہے، اس سے مراد ہیں، حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری۔

[2] تحریک شیخ الہند مرتبہ مولانا محمد میاں صاحب ص ۱۴۵ مطبوعہ الجمعیۃ بکڈپو دہلی ۱۹۷۵ء

[3] ایضاً ص ۱۷۱ [4] ایضاً ص ۱۷۲

اس لئے صحیح بات وہی معلوم ہوتی ہے جو رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں بتلائی گئی ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کا علم حکومت کو اُس زمانے میں ہوا جب کہ وہ ۱۹۱۶ء میں مکہ مکرمہ میں مقیم تھے، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ جو اس گرفتاری میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ تھے، اُن کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، حضرت مولانا مدنیؒ اپنی خود نوشت سوانح نقشِ حیات میں لکھتے ہیں:۔

"حجاز میں حضرت شیخ الہندؒ کے قیام پر ایک سال گزر چکا تھا، ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کو خیال ہوا کہ حضرت کے پاس اخراجات کے لئے روپیہ ختم ہو چکا ہوگا، اس لئے روپیہ بھیجنا چاہیئے، ذیقعدہ ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۶ء میں اس کے لئے حضرت شیخ الہندؒ کے ایک قریبی عزیز کو حجاز بھیجا گیا، راستے میں عزیز مذکور کی سختی کے ساتھ تلاشی لی گئی، مگر پولیس کو کچھ ہاتھ نہ آیا، حج کے بعد واپسی پر حضرت شیخ الہندؒ نے اُن کو تحریک سے متعلق بعض اہم باتیں بتلائی تھیں، اُنھیں میں یہ بات بھی تھی کہ ترکی کے وزیر جنگ انور پاشا کے خطوط کس طرح مولوی ہادی حسن صاحب کے ذریعے سے ہندوستان بھیجے گئے ہیں، یہاں برطانوی حکام غالب نامہ کی تلاش میں سرگرداں تھے، عزیز مذکور جب حجاز سے واپس ہو کر بمبئی پہنچے تو اُن کو گرفتار کر کے الہ آباد لے جایا گیا، وہاں خفیہ پولیس کے حکام نے ان کو ڈرا دھمکا کر تمام راز معلوم کر لئے"[1]

حضرت مولانا مدنیؒ نے تفتیش کی اس کارروائی کو "افشائے راز" سے تعبیر فرمایا ہے، "عزیز مذکور" کے ذریعے سے پولیس کو جو راز معلوم ہوئے ان کی نسبت حضرت مدنیؒ نے لکھا ہے کہ:۔

"ان میں کچھ ایسی باتیں بھی تھیں جو اگر ثابت ہو جاتیں تو نہ معلوم کتنوں کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑتا، کتنے عبور دریائے شور اور حبسِ دوام کی سزا پاتے"[2]

---

[1] نقشِ حیات جلد دوم ص ۲۲۸ - ۲۲۳ [2] نقشِ حیات جلد دوم بعنوان افشائے راز ص ۲۳۱

جیساکہ اوپر گزر چکا ہے کہ ایک طرف تو حضرت مدنیؒ کے الفاظ میں عزیز مذکور کے ذریعے ہندوستانی پولیس کو تمام رازوں کا علم ہوگیا، ٹھیک اسی زمانے میں دوسری طرف صورت یہ پیش آئی کہ جولائی ۱۹۱۶ء ۱۳۳۴ھ میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور حضرت مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ نے جو افغانستان میں حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کے سرگرم کارکن تھے، مولانا سندھی کی ذاتی ڈائری اور نقشِ حیات کے متفقہ بیان کے مطابق ان دونوں حضرات نے حضرت شیخ الہندؒ کو خطوط لکھے[1]، جن میں "غالب نامہ" کی فوٹو کاپیوں کی آزاد قبائل میں تقسیم کرنے کی اطلاع دی گئی تھی، اس کے علاوہ ان خطوط میں افغانستان کے سیاسی حالات، افغانستان میں عارضی حکومت کی تشکیل کا ذکر، حزب اللہ کے نام سے فوجی تنظیم قائم کرنے کی اطلاع، فوجی مرکزوں کے مقامات، فوجی اور سول عہدیداروں کے ناموں وغیرہ کی تفصیلات درج تھیں یہ تحریریں اور خطوط نہایت احتیاط کے ساتھ کاغذ کے بجائے ریشم کے کپڑے پر لکھے گئے تھے، یہ دستاویزات ایک معتمد شخص عبدالحق کو دے کر اُسے سندھ روانہ کیا گیا، اور یہ ہدایت کردی گئی کہ وہ ان کو نہایت رازدارانہ طور پر احتیاط کے ساتھ شیخ عبدالرحیم کو پہنچا دے، شیخ صاحب اس تحریک کے اہم رکن تھے، شیخ صاحب کے نام جو خط تھا اُس میں لکھا تھا کہ وہ حج کے لئے جائیں اور ان دستاویزات کو حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں پیش کردیں، عبدالحق نے احتیاط برتنے کی ہدایت کے باوجود اعتماد کا حق ادا کرنے میں بڑی کوتاہی کا ثبوت دیا، راستے میں اُس نے اپنی سادہ لوحی سے ملتان کے ایک شخص خان بہادر حق نواز خاں[2] پر بھروسہ کرتے ہوئے اُن سے دستاویزات کا ذکر کردیا، خان بہادر کے فرزند اللہ نواز خاں اُس وقت افغانستان میں ہندوستان کی عارضی حکومت کے سکریٹری تھے، غالباً اس مغالطے کی وجہ سے عبدالحق

---

[1] نقشِ حیات جلد دوم ص ۲۴۲

[2] تحریک شیخ الہند میں سرکاری ریکارڈ کے حوالے سے یہ نام رب نواز خاں لکھا ہوا ہے

نے خان بہادر کو تحریک کا ہمدرد خیال کیا، مگر خان بہادر کی وفاداری برطانوی حکومت سے وابستہ تھی، اُنھوں نے عبدالحق کو بہلا پھسلا کر دستاویزات کو دیکھنے کے لئے لے لیا، اور اُن کو دیکھ کر واپس کرنے کے بجائے پنجاب کے گورنر سر مائیکل اوڈوائر کے حوالے کر دیا،[1] برطانوی حکومت کے حکّام "غالب نامہ" کی تلاش میں سرگرداں تھے اور حضرت شیخ الہندؒ سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے تفتیش کا سلسلہ جاری تھا، اچانک ان دستاویزات کے ہاتھ لگ جانے سے تحریک کی جملہ کارروائیوں کا برطانوی حکّام کو انکشاف ہوگیا، یہ وہی خطوط تھے جو ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں "ریشمی خطوط" کے نام سے مشہور ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے واضح طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے سفرِ حجاز تک اُن کی سیاسی سرگرمیوں سے برطانوی حکام بے خبر تھے، سفرِ حجاز کے بعد اُن کا سُراغ مِلا، مگر تفتیش کے باوجود کوئی ثبوت دستیاب نہ ہوسکا۔

حضرت مولانا مدنیؒ کے بیان کے مطابق ۱۳۳۴ھ کے اواخر (ستمبر ۱۹۱۶ء)[2] میں ایک طرف تو ان صاحب سے زبانی طور پر حالات کا انکشاف ہوا جن کو "عزیز مذکور" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے، اور پھر ٹھیک اُسی کے قریبی زمانے میں وہ "ریشمی خطوط" ہاتھ لگ گئے جن کو عبدالحق کے ذریعے سے روانہ کیا گیا تھا، جس کے نتیجے میں بقول حضرت مولانا مدنیؒ "ایک سال سے زائد عرصے تک تفتیش کا سلسلہ جاری رہا" یہ دونوں واقعے حضرت شیخ الہندؒ کے قیام مکّہ مکرمہ کے دَوران پیش آئے ہیں۔

یہاں یہ واضح رہے کہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے کابل سے شیخ عبدالرحیم صاحب کے

---

[1] نقشِ حیات جلد دوم، ص ۱۷۰ و ۱۲۹۴ و ۲۴۴، بحوالہ ذاتی ڈائری مولانا سندھیؒ۔

[2] سرکاری ریکارڈ میں ریشمی خطوط کے برطانوی حکّام کو دستیاب ہونے کی تاریخ ۱۵ اگست ۱۹۱۶ء لکھی ہے۔ دیکھئے تحریک شیخ الہندؒ ص ۱۸۲۔

پاس ریشمی خطوط کے ساتھ جو خط روانہ کیا تھا اس پر ۹ رمضان یوم دوشنبہ درج ہے، یہ ۱۳۳۴ھ کا واقعہ ہے، اس لئے اسے ۹ رمضان ۱۳۳۴ھ یوم دوشنبہ مطابق ۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء سمجھنا چاہیئے۔

مولانا منصور انصاری کا خط جو ۸ رمضان کا لکھا ہوا ہے اُس کا سن بھی یہی (۱۳۳۴ھ) ہے، اس کی مطابقت ۹ جولائی ۱۹۱۶ء سے ہوتی ہے۔

حق نواز خاں کو یہ خطوط عبدالحق کے ذریعے سے ۱۵ اگست ۱۹۱۶ء کو ملے، اس کا مطلب ہے کہ ریشمی خطوط لکھے جانے کے پانچ ہفتے کے بعد برطانوی حکّام کے ہاتھ لگ گئے تھے، ان واقعات میں کسی ایسی بات کا کوئی سُراغ نہیں ملتا جس سے یہ سمجھا جاسکے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے قیام دیوبند کے زمانے میں اُن کے سیاسی منصوبے کا حکومتِ ہند کو علم ہوگیا تھا، غرض کہ جہاں تک حالات کے منطقی تجزیے کا تعلق ہے، اہتمام دارالعلوم پر اس الزام کے ثابت ہونے کا تاریخی حقائق کی روشنی میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ

حضرت شاہ صاحبؒ کشمیر کے رہنے والے تھے، ۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) کو سادات کے ایک معزز علمی خاندان میں آپ کی ولادت ہوئی، یہ خاندان اپنے علم و فضل کے لحاظ سے کشمیر بھر میں ممتاز خاندان سمجھا جاتا ہے، ساڑھے چار سال کی عمر میں اپنے والد بزرگوار مولانا سیّد معظم شاہ سے قرآن مجید شروع کیا، غیر معمولی ذہانت و ذکاوت اور بے مثل قوتِ حافظہ ابتدائے عمر سے موجود تھی، چنانچہ ڈیڑھ سال کی قلیل مدت میں کتاب اللہ کے ساتھ فارسی کی چند ابتدائی کتابیں ختم کر کے علومِ متداولہ کی تحصیل میں مشغول ہوگئے، ابھی بمشکل ۱۴ سال کی عمر تھی کہ حصولِ علم کے جذبۂ بے پایاں نے ترکِ وطن پر آمادہ کر دیا، تقریباً تین سال ہزارہ کے مدارس میں رہ کر مختلف علوم و فنون میں دست گاہ حاصل کی، مگر دیوبند کی شہرت نے مزید تکمیل کے لئے بے چین بنا دیا۔

چنانچہ ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء[1] میں دیوبند تشریف لائے، حضرت شیخ الہندؒ مسندِ صدارت پر متمکن تھے، استاد نے شاگرد کو اور شاگرد نے استاد کو پہلی ہی ملاقات میں پہچان لیا کتب موقوف علیہ کے بعد حدیث و تفسیر کی کتابیں شروع کیں اور چند ہی سال میں دارالعلوم میں شہرت و مقبولیت کے ساتھ ایک امتیازی شان حاصل کرلی، پھر ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء تک حدیث و تفسیر اور فنون کی اعلیٰ کتابوں سے فارغ ہوکر آپ حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سندِ حدیث کے علاوہ باطنی فیوض سے بھی مستفیض ہوئے۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد آپ نے مدرسہ امینیہ دہلی میں کچھ دنوں فرائض تدریس انجام دیئے، ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء میں کشمیر چلے گئے، وہاں اپنے علاقے میں فیضِ عام کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا، ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے، کچھ مدت تک مجاز میں قیام رہا اور وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کا موقع ملا، ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء میں آپ دیوبند تشریف لائے، حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کو یہاں روک لیا، ۱۳۳۳ھ تک بغیر مشاہرہ کے کتبِ حدیث کے درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء کے اواخر میں جب شیخ الہندؒ نے سفرِ حجاز کا قصد کیا تو اپنی جانشینی کا فخر شاہ صاحبؒ کو بخشا، دارالعلوم کی مسندِ صدارت پر تقریباً ۱۲ سال تک جلوہ افروز رہے، ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء کے اوائل میں اہتمام دارالعلوم سے بعض اختلافات کے باعث آپ فرائضِ صدارت سے دست کش ہوکر جنوبی ہند کے مدرسہ ڈابھیل میں تشریف لے گئے، اور ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء تک وہاں درس حدیث کا مشغلہ جاری رہا۔

اگر حضرت شیخ الہندؒ نے دارالعلوم کا غلغلہ چار دانگ عالم میں بلند کیا، تو حضرت شاہ صاحبؒ نے دارالعلوم کی مسندِ تدریس پر رونق افروز ہوکر عالمِ اسلام کو علم دین کی روشنی سے منور

---

[1] بعض مضامین وغیرہ میں شاہ صاحبؒ کا داخلہ ۱۳۰۸ھ میں لکھا ہے، جو صحیح نہیں ہے، دیکھئے روداد دارالعلوم ۱۳۱۱ھ ص ۷، و رجسٹر داخلہ طلباء ۲۷۵

کر دیا، علم حدیث میں وہ عدیم النظیر محدّث تھے، علومِ فقہ میں فقیہہِ اعظم، اتباعِ شریعت میں صلحائے سلف کا نمونہ تھے، تو معرفتِ الٰہی میں جُنیدِ وقت اور شبلیِ عصر، اُن کا وجود شریعت کے لئے بھی موجبِ تقویت تھا اور طریقت کے لئے بھی وجہِ نازش، حضرت گنگوہیؒ سے شرفِ خلافت حاصل کیا تھا۔

اسلامی دُنیا نے اس قدر وسیع العلم اور باعمل علماء بہت کم پیدا کئے ہیں، شاہ صاحبؒ اگر ایک طرف اپنے معاصرین میں تبحّرِ علمی کے لحاظ سے عدیم النظیر تھے تو دوسری جانب زُہد و تقویٰ میں بھی اُن کی ذات بے مثل تھی، وہ ایک باکمال مفسّر، محدّث اور فلسفی تھے، آدمی میں ایک کمال کا ہونا بھی کم نہیں ہوتا، مگر اُن کی دستارِ کمال میں متعدد لعل آویزاں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے وجود سے علمی دنیا میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا تھا، تشنگانِ علوم کی جس کثیر تعداد نے اس بحرالعلوم سے سیرابی حاصل کی وہ آپ اپنی مثال ہے، مشرقِ وسطیٰ سے لیکر چین تک ان کے فیضانِ علم کا سیلاب موجیں مارتا رہا اور ہند و بیرونِ ہند کے ہزاروں تشنگانِ علوم نے اس سے اپنی پیاس بجھائی، غیر منقسم ہندوستان، عرب، ایران، عراق، افغانستان، چین، مصر، جنوبی افریقہ، انڈونیشیا اور ملائشیا میں بکثرت آپ کے تلامذہ پھیلے ہوئے ہیں، دارالعلوم میں آپ کے زمانۂ قیام میں ۸۰۹ طلباء نے دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔

حضرت شاہ صاحب کو قدرت کی جانب سے حافظہ ایسا عدیم النظیر بخشا گیا تھا کہ ایک مرتبہ کی دیکھی ہوئی کتاب کے مضامین و مطالب تو درکنار عبارتیں تک مع صفحات و سطور کے یاد رہتی تھیں، جو بات ایک مرتبہ کان یا نگاہ کے راستے سے دماغ میں پہونچ گئی وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتی تھی، اور دورانِ تقریر میں بے تکلف حوالے پر حوالے دیتے چلے جاتے تھے، اسی کے ساتھ مطالعے کا اس قدر شوق تھا کہ جملہ علوم کے خزانے اُن کے دامنِ جستجو کی وسعتوں کو مطمئن اور تشنگیٔ علم کو سیراب نہ کر سکتے تھے، کثرتِ مطالعہ اور قوتِ حافظہ کے باعث

گویا ایک متحرک و متکلّم کتب خانہ تھے، صحاحِ ستّہ کے علاوہ حدیث کی اکثر کتابیں تقریباً برنوکِ زبان تھیں، تحقیق طلب مسائل جن کی جستجو اور تحقیق میں عمریں گزر جاتی ہیں، سائل کے استفسار پر چند لمحوں میں اس قدر جامعیت کے ساتھ جواب دے دیتے تھے کہ اس موضوع پر سائل کو نہ تو شبہ باقی رہتا تھا اور نہ کتاب دیکھنے کی ضرورت، پھر مزید لطف یہ کہ کتابوں کے ناموں کے ساتھ صفحات و سطور تک کا حوالہ بھی بتلایا جاتا تھا، وہ ہر ایک علم و فن پر اس طرح برجستگی کے ساتھ تقریر فرماتے تھے کہ گویا اُن کو تمام علوم مستحضر ہیں، دورانِ تقریر بے شمار کتابوں کے حوالے بلا تکلّف دیتے چلے جاتے تھے، حتیٰ کہ اگر کسی کتاب کے پانچ پانچ اور دس دس حواشی ہوتے تو ہر ایک کی عبارت بقید صفحہ و سطر یاد ہوتی تھی، احادیث کا تمام ذخیرہ اور اُن کی صحت و عدمِ صحت کے متعلق طویل و عریض بحثیں، رُوات کے مدارج و مراتب برنوک زبان تھے، مشہور و معروف کتب خانوں کے اکثر مخطوطات نظر سے گزر چکے تھے، اور اس طرح حافظہ میں موجود تھے کہ گویا آج ہی اُن کا مطالعہ کیا ہے۔

پھر مطالعہ محض علومِ شرعیہ تک ہی محدود نہ تھا بلکہ جس فن کی بھی کتاب ہاتھ آتی اس کا شروع سے آخر تک ایک مرتبہ مطالعہ ضرور فرما لیتے تھے اور جب کبھی اُس کے متعلق بحث چھڑ جاتی تو اس کتاب کے مندرجات کو اس طرح حوالوں کے ساتھ بیان فرما دیتے کہ سُننے والے حیران و ششدر رہ جاتے، ایک مرتبہ کسی شخص نے علم جفر کے مشکل ترین مسائل حل کرنے کے لئے پیش کئے، شاہ صاحب نے حسبِ معمول برجستہ جوابات کے ساتھ متعدد کتب کے حوالے دے کر بتلا دیا کہ فلاں فلاں کتابوں کی جانب رجوع کیا جائے۔

شاہ صاحبؒ کا حافظہ غضب کا تھا، شیخ ابنِ ہمامؒ کی مشہور کتاب فتح القدیر جو آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے اس کا مطالعہ ۲۰ دن میں اس طرح کیا تھا کہ فتح القدیر کی کتاب الحج کی تلخیص بھی ساتھ ساتھ کرتے گئے تھے، اور ابنِ ہمام نے صاحبِ ہدایہ پر جو اعتراضات کئے ہیں اُن کے جوابات بھی لکھتے گئے۔ دورانِ درس میں ایک مرتبہ فرمایا کہ اب سے ۲۶ سال

پہلے میں نے فتح القدیر کا مطالعہ کیا تھا۔ بحمداللہ اب تک دوبارہ دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، اور آج بھی اس کا جو مضمون اور بحث پیش کروں گا اگر تم مراجعت کرو گے تو تفاوت بہت کم پاؤ گے۔

یہ ایک واقعہ ہے، اس طرح کے واقعات اُن کی زندگی میں بے شمار ہیں

علامہ اقبال مرحوم کو شاہ صاحبؒ سے بڑا تعلق تھا، اور اکثر علمی مباحث میں اُن سے رجوع کرتے تھے، اُن کا خیال تھا کہ اسلامی مسائل کی تدوینِ جدید کے لئے شاہ صاحب سے بہتر کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔

غرض کہ علوم تفسیر وحدیث اور فقہ کی جس قدر خدمات آپ نے انجام دیں وہ آپ اپنی مثال ہیں، متعدد معرکۃ الآرا مسائل پر کتابیں بھی تصنیف فرمائی ہیں، درسِ حدیث کی تقریر کی جامعیت کا اندازہ "فیض الباری" سے کیا جاسکتا ہے، جو صحیح بخاری کی تقریر ہے اور چار ضخیم جلدوں میں شائع ہے، درایت میں زبردست کمال حاصل تھا، دو مختلف ومعارض اقوال میں اپنی قوتِ استنباط کے زور سے بلاتکلّف ایک کو دوسرے پر ترجیح دے دیتے تھے، علوم نقلیہ وعقلیہ کے علاوہ علم تصوّف پر بھی اُن کی نظر مبصّرانہ تھی، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے شاہ صاحبؒ کی وفات پر "معارف" میں لکھا تھا:-

"اُن کی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کی اوپر کی سطح ساکن، لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے، وہ وسعتِ نظر، قوتِ حافظہ اور کثرتِ حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے، علومِ حدیث کے حافظ و نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند اور زُہد وتقویٰ میں کامل تھے، مرتے دم تک علم و معرفت کے اس شہید نے قال اللہ و قال الرسول کا نعرہ بلند رکھا۔"

مصر کے مشہورِ زمانہ عالم سید رشید رضا جب دیوبند تشریف لائے اور شاہ صاحبؒ سے اُن کی ملاقات ہوئی تو بے ساختہ بار بار کہتے تھے :۔

" ما رأیت مثل ھٰذا الأستاذ الجلیل ! میں نے اس جلیل القدر استاد جیسا کوئی عالم نہیں دیکھا !

بہرحال دارالعلوم کی یہ خوش قسمتی تھی کہ حضرت شیخ الہندؒ کے بعد صدارتِ تدریس کا کام آپ کے سپرد ہوا، بقول مولانا سید مناظر احسن گیلانی آپ کے زمانے میں طلباء کی استعداد میں بڑا انقلاب ہوا اور اچھے اچھے مستعد طلباء آپ کے حلقۂ درس سے مستفید ہو کر اُٹھے ۔

ملکی سیاست میں شاہ صاحبؒ اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کے مسلک کے پیرو تھے ۔ مسلمانانِ ہند میں صحیح اسلامی زندگی پیدا کرنا علماء کا اوّلین فریضہ سمجھتے تھے ۔ جمعیۃ العلماء ہند کے آٹھویں سالانہ اجلاس منعقدہ پشاور کا بصیرت افروز خطبۂ صدارت اس کا روشن ثبوت ہے ۔

علمی ذوق کا طبیعت پر اس قدر غلبہ تھا کہ عرصے تک نکاح اور متاہلانہ زندگی سے گھبراتے رہے مگر بالآخر بزرگوں کے شدید اصرار سے متاہلانہ زندگی اختیار فرمالی تھی اور اس کے بعد تنخواہ لینے لگے تھے ۔ ڈابھیل میں چند سال قیام فرمانے کے بعد آخر میں امراض کی شدّت سے مجبور ہو کر دیوبند جس کو آپ نے اپنا وطنِ اقامت بنالیا تھا چلے آئے تھے ، اور یہیں ۳ صفر المظفر ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء کو ۶۰ سال کی عمر میں رحلت فرمائی ۔ قبرِ مبارک عیدگاہ کے قریب ہے ۔

حضرت تھانویؒ نے نفحۃ العنبر کی تقریظ میں لکھا ہے :۔

" میرے نزدیک اسلام کی حقانیت کی بہت سی دلیلوں میں سے ایک دلیل حضرت مولانا انور شاہؒ کا وجود بھی ہے ، اگر اسلام میں کوئی کجی ہوتی تو مولانا انور شاہؒ یقیناً اسلام کو ترک کر دیتے ۔ "

حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات پر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے تعزیتی تقریر میں فرمایا تھا کہ :۔

"مجھ سے اگر مصر و شام کا کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تم نے حافظ ابنِ حجر عسقلانی، شیخ تقی الدین بن دقیق العید" اور سلطان العلماء شیخ عز الدین بن عبد السلام" کو دیکھا ہے ؟ تو میں استعارہ کر کے کہہ سکتا تھا کہ ہاں ! دیکھا ہے کیونکہ صرف زمانے کا تقدم و تاخر ہے ، اگر شاہ صاحبؒ بھی چھٹی یا ساتویں صدی میں ہوتے تو ان خصوصیات کے حامل ہونے کی وجہ سے اُن کے ہی مرتبہ میں ہوتے ۔"

شاہ صاحب کا قد درمیانہ ، رنگ سفید ، خوبصورت خد و خال ، پیشانی کشادہ ، اور آنکھیں مقناطیسی کشش رکھتی تھیں ۔

علامہ اقبال مرحوم کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں اسلام سے جو شغف پیدا ہو گیا تھا ، اُس میں شاہ صاحبؒ کے فیضانِ صحبت کو بھی بڑا دخل حاصل ہے ، علامہ موصوف نے اسلامیات میں شاہ صاحبؒ سے بہت کچھ استفادہ کیا تھا ، چنانچہ علامہ اقبال مرحوم آپ کا بے حد احترام کرتے تھے اور عقیدت و محبت کے جذبات کے ساتھ شاہ صاحبؒ کی رائے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتے تھے ۔

مختلف اسلامی مباحث پر عربی اور فارسی میں ایک درجن سے زائد تصانیف جو نہایت معرکتہ الآراء مسائل پر مشتمل ہیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں اور اُنسے کہیں زیادہ کتابیں طباعت کی منتظر ہیں ۔

مولانا محمد یوسف بنوری نے نفحۃ العنبر میں شاہ صاحبؒ کے تفصیلی حالات لکھے ہیں ، یہ کتاب عربی میں ہے ، دوسری کتاب حیات انور ہے ، یہ اُردو میں ہے ، حیات انور مختلف حضرات کے مضامین کا گراں قدر مجموعہ ہے ۔ الانور اور نقشِ دوام بھی اچھی سوانح حیات ہیں ،

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

حضرت مدنیؒ کا وطن موضع اللہ داد پور ٹانڈہ ضلع فیض آباد ہے ، ۱۹ ر شوال ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء کو ضلع اُناؤ کے ایک قصبہ بانگر مئو میں جہاں آپ کے والد ماجد سید حبیب اللہ صاحب ہیڈ ماسٹر تھے ، پیدا ہوئے ، ۱۹ پشت پیشتر آپ کا خاندان ہندوستان آیا تھا ، اپنے علم و تقویٰ کے لحاظ سے سادات کا یہ خاندان ہمیشہ ایک خاص عظمت اور شاہی زمانے میں ایک بڑی جاگیر کا مالک رہا ہے ۔

ابتدائی تعلیم پرائمری اسکول میں حاصل کرنے کے بعد بعمر ۱۴ سال ۲ جمادی الثانی ۱۳۰۹ھ / ۱۸۹۱ء کو آپ دیوبند تشریف لائے ، میزان الصرف میں داخلہ لیا ، یہاں حضرت شیخ الہندؒ نے خاص شفقت و عنایت سے آپ کی تعلیم و تربیت فرمائی ، دار العلوم کے نصاب کی تکمیل اور سات سال یہاں کے علمی ماحول میں گزارنے کے بعد جب وطنِ مالوف تشریف لیگئے تو والد ماجد شوقِ ہجرت میں مدینۃ الرسول کے لئے رختِ سفر باندھ چکے تھے ، آپ بھی والدین کے ہمراہ روانہ ہوگئے ، روانگیٔ حجاز سے قبل آپ حضرت گنگوہیؒ سے بیعت ہوچکے تھے ، مکہ مکرمہ میں پیر و مرشد کی ہدایت کے بموجب کچھ عرصے تک حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہٗ سے بھی کسبِ فیض کیا بعد ازاں مدینہ منورہ میں والد ماجد کے ساتھ مقیم ہوگئے ہرچند آپ نے ہندوستان سے ہجرت کا قصد نہیں فرمایا تھا تاہم والد صاحب کی حیات تک آغوشِ پدری کو چھوڑ کر ہندوستان واپس آنا پسند نہیں کیا ۔

قیام مدینہ کے زمانے میں تقریباً دس سال تک مسجد نبوی میں درس حدیث کی خدمت تنگی اور عسرت کے باوجود توکلاً علی اللہ انجام دی ، عموماً روزانہ ۱۲ ، ۱۲ گھنٹے تک مسلسل درس و تدریس کا مشغلہ جاری رہتا تھا ، مختلف جماعتیں یکے بعد دیگرے حاضر ہو کر آپ کے فیضانِ علمی سے سیراب ہوتی تھیں ، مسجد نبوی میں آپ کا درسِ حدیث وہاں کے تمام شیوخِ حدیث سے زیادہ پسندیدہ اور مقبول تھا ، اور اس کی شہرت نے مختلف اسلامی ممالک کے طالبانِ علم کی

ایک بڑی تعداد کو آپ کے گرد جمع کر دیا تھا، حجاز کی مقدس سرزمین اور خاص مسجدِ نبوی میں ایک ہندوستانی عالم کی جانب اس قدر کشش اور قبول عام کا باعث آپ کے طریق درس کی اس خصوصیت کو سمجھنا چاہیئے جو آپ کو دارالعلوم کے اساتذہ سے ورثہ میں ملی تھی۔

مدینہ منورہ کے قیام کے زمانے میں آپ کئی مرتبہ ہندوستان تشریف لائے اور حضرت گنگوہیؒ سے خلعتِ خلافت حاصل کیا، ۱۳۲۹ھ ۱۹۱۱ء میں تقریباً ایک سال دیوبند میں قیام فرما کر تدریسی خدمات انجام دیں، ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء میں جب حضرت شیخ الہند حجاز تشریف لے گئے، تو آپ ہی کے یہاں قیام فرمایا اور آپ ہی کے ذریعے سے ترکی کے وزیرِ جنگ انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات فرما کر اپنی انقلابی اسکیم اُن کے سامنے پیش کی تھی، جب عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی اور شریف حسین نے حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کیا تو آپ بھی حضرت شیخ الہندؒ کے رفقاء میں شامل تھے، چنانچہ سوا تین سال تک آپ کو بھی مالٹا میں جنگی قیدی کی حیثیت سے رہنا پڑا، ۱۳۳۸ھ ۱۹۲۰ء میں جب مالٹا سے رہائی ہوئی تو آپ حضرت شیخ الہندؒ کی معیت میں ہندوستان تشریف لائے، مالٹا سے واپسی کا زمانہ تحریکِ خلافت کے آغاز کا زمانہ تھا، آپ یہاں پہونچ کر حضرت شیخ الہندؒ کی قیادت میں سیاست میں شریک ہو گئے، اس زمانے میں آپ کی مجاہدانہ اور فروشانہ قربانیوں نے مسلمانوں کے دلوں کو آپ کی عظمت و محبت سے لبریز کر دیا تھا، حضرت شیخ الہندؒ کی وفات پر متفقہ طور سے آپ کو ان کا جانشین تسلیم کر لیا گیا، سیاسی کاموں میں شرکت و انہماک کے باعث آپ کو متعدد مرتبہ کئی کئی سال تک جیل میں بھی رہنا پڑا، اور ملک کی آزادی کے لئے قید و بند کی ہوش رُبا صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔

۱۳۴۶ھ ۱۹۲۷ء میں جب حضرت شاہ صاحبؒ دارالعلوم سے مستعفی ہوئے تو آپ کے سوا جماعت دارالعلوم میں کوئی ایسی شخصیت موجود نہ تھی جو دارالعلوم کی اس مہتم بالشان جگہ کو اس کے شایانِ شان پُر کر سکے، اس لئے اکابر کی نظرِ انتخاب آپ ہی پر پڑی، آپ کے زمانۂ صدارت میں طلباء کی تعداد

میں دو گنے سے بھی زیادہ اضافہ ہوا، اور خاص دورۂ حدیث کی جماعت میں تو یہ اضافہ تین گنے سے بھی متجاوز ہے، ۱۳۴۶ھ سے ۱۳۷۷ھ تک ۳۲ سال کی مدت میں آپ کے زمانۂ صدارت میں ۳۸۵۴ طلبار نے دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی، جب کہ حضرت مولانا مدنیؒ کے عہد صدارت سے قبل فضلار کرام کی تعداد ۲،۱۵۱ ہے۔

آپ کا درسِ حدیث مضامین کے تنوع اور جامعیت کے لحاظ سے دنیائے اسلام میں اپنی نوعیت کا واحد درس سمجھا جاتا تھا، چنانچہ اس کی عظمت و شہرت اور کشش سال بسال طلبار کی تعداد میں اضافے کا موجب ہوتی رہی، حدیث نبویؐ میں آپ کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع ہے، اور برِ صغیر کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں آپ کے شاگرد موجود نہ ہوں جس طرح آج دنیائے اسلام میں دارالعلوم کو علوم نبویہ کی تعلیم میں طغرائے امتیاز حاصل ہے اسی طرح آپ کا علمی فیضان بھی امتیازِ خاص رکھتا ہے۔

حضرت مولانا مدنیؒ کے روزانہ کے مشاغل اور معمولات یہ تھے:۔

"آخر شب میں نماز فجر تک تہجد اور ذکر و وظائف وغیرہ، نماز فجر کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ تلاوت قرآن مجید اور مطالعۂ کتب۔ اس کے بعد مردانے میں مہمانوں کے ساتھ چائے اور ناشتہ پھر تقریباً ۱۲ بجے تک صحیح بخاری اور ترمذی شریف کا درس، دوپہر کے کھانے اور نماز ظہر کے بعد ڈاک دیکھنا اور خطوط کے جواب لکھنا اور مہمانوں سے بات چیت۔ نماز عصر کے بعد مغرب تک پھر صحیح بخاری کا درس ہوتا تھا، مغرب کی نوافل میں کم از کم ایک پارہ کی تلاوت کا روزانہ معمول تھا، اس سے فراغت کے بعد رات کا کھانا، نماز عشار کے بعد بھی اکثر صحیح بخاری کا درس ہوتا تھا، جو ۱۲ بجے شب تک جاری رہتا تھا۔

دسترخوان نہایت وسیع تھا، عموماً کم از کم دس، پندرہ مہمان آپ کے دسترخوان پر ضرور موجود رہتے تھے۔

محرم ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء میں حضرت مولانا مدنیؒ پر مدراس کے سفر میں دل کا دورہ پڑا، دیوبند تشریف

لانے پر ڈاکٹروں نے تشخیص کیا کہ قلب کا پھیلاؤ بڑھ گیا ہے، مقامی اور بیرونی ڈاکٹروں کا علاج ہوتا رہا، مگر افاقہ نہ ہوا، پھر یونانی علاج شروع کیا گیا، اس سے مرض میں قدرے تخفیف محسوس ہوئی۔ ۱۰/۱۱ جمادی الاولیٰ (۳/۴ دسمبر) کو طبیعت کافی پرسکون رہی، ۱۲/ جمادی الاولیٰ (۵/ دسمبر) کی صبح کو طبیعت کافی بشاش ہوگئی، کئی دن کے بعد دوپہر کو غذا تناول فرمائی اور پھر لیٹ گئے، ۳/ بجے کے قریب نمازِ ظہر کے لئے جب بیدار کرنا چاہا تو پتہ چلا کہ حضرت مدنیؒ واصل بحق ہوچکے ہیں۔ ۹ بجے شب میں جنازہ دارالحدیث میں لاکر رکھا گیا، حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارن پور نے نمازِ جنازہ پڑھائی! ور ۱۲/۱۳/ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ (۵/۶/ دسمبر ۱۹۵۷ء) کی درمیانی شب میں اس خزینۂ علم و معرفت کو سپردِ خاک کردیا گیا جس نے ۳۲ سال تک دارالعلوم میں حدیثِ نبوی کی شمع کو روشن رکھا تھا۔ اور جس کے خرمنِ فضل و کمال سے خوشہ چینی کرنے میں طالبانِ علم نبوت نے ہمیشہ فخر محسوس کیا ہے۔

حضرت مولانا مدنیؒ کے تفصیلی حالات کے لئے خود ان کی خودنوشت سوانح نقشِ حیات الجمعیۃ کا شیخ الاسلام نمبر، اور انفاسِ قدسیہ مصنفہ مفتی عزیزالرحمٰن بجنوری سے مراجعت کی جائے۔

منصبِ صدارت کی تقسیم

دارالعلوم میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ (جو دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے) کے زمانے سے یہ دستور چلا آرہا تھا کہ صحیح بخاری کا سبق صدر مدرس سے متعلق ہوتا تھا۔ بعد میں جب تعلیمات کے انتظامی امور بڑھے تو اُن کا تعلق بھی صدر مدرس ہی سے رکھا گیا، حضرت مولانا مدنیؒ کی وفات سے منصبِ تدریس بخاری شریف میں جو عظیم خلا پیدا ہوا اُس کو پُر کرنے کے لئے مجلس شوریٰ نے عارضی طور پر اس منصب کو دو جگہ تقسیم کردیا، صدر مدرسی اور تعلیمی امور کی نگرانی حضرت مولانا محمد ابراھیم بلیاویؒ کے حصے میں آئی۔ اور صحیح بخاری کے سبق کے لئے حضرت مولانا سیّد فخرالدین احمدؒ کا انتخاب کیا گیا۔ مجلسِ شوریٰ کی تجویز کے الفاظ

یہ ہیں :۔

"مجلسِ شوریٰ اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد نور اللہ مرقدہٗ کے سانحۂ ارتحال کے بعد دارالعلوم کے لئے ایسی کامل و عظیم شخصیت کا مثل نظر نہیں آتا، اس لئے مجلس شوریٰ دارالعلوم کے تعلیمی نظام کو بہتر سے بہتر بنانے کیلئے باتفاق رائے یہ طے کرتی ہے کہ دارالعلوم کے صدر المدرسین اور ناظم تعلیمات کے منصب پر حضرت مولانا محمد ابراھیم صاحب کو فائز کیا جائے، اور علمِ حدیث کی عظمت و جلالت کی امتیازی شان کے پیشِ نظر حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب کو شیخ الحدیث کے منصب پر فائز کیا جائے۔

مجلس شوریٰ کی تجویز میں آگے چل کر کہا گیا ہے کہ "شیخ الحدیث کا یہ مخصوص اور ممتاز عہدہ دارالعلوم کے دستور میں مستقل حیثیت نہیں سمجھا جائے گا"۔ چنانچہ حضرت علامہ بلیاویؒ کی وفات کے بعد منصب صدارتِ تدریس حضرت مولانا فخر الدین احمد کو تفویض کر دیا گیا۔

(تجویز نمبر ۳ مجلس شوریٰ منعقدہ ۱۶ ر رجب ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء)

یہ پہلا موقع تھا کہ صحیح بخاری پڑھانے والے استاذ کے لئے شیخ الحدیث کا منصب قائم کیا گیا، اور انتظامی امور صدر المدرسین سے متعلق کئے گئے۔ ظاہر ہے کہ انتظامی امور پر بخاری شریف کے درس کو فوقیت اور عظمت حاصل ہے، دارالعلوم دیوبند کا درسِ حدیث روزِ اوّل سے ممتاز اور نمایاں رہا ہے!

اس لحاظ سے صدر المدرسین کے عنوان میں حضرت مولانا محمد ابراھیم صاحب بلیاویؒ کے حالات سے قبل حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ کا تذکرہ پیش کیا جانا زیادہ مناسب ہوگا تاکہ اساتذۂ بخاری شریف کا سلسلہ جو سندِ حدیث کی جان ہے منقطع نہ ہونے پائے۔

مولانا سید فخر الدین احمد

وطنِ مالوف ہاپوڑ ہے، آپ کے آباء و اجداد میں سید قطب اور سید عالم اپنے دوسرے

دو بھائیوں کے ساتھ عہدِ شاہ جہاں میں ہرات سے دہلی آئے۔ یہ حضرات اپنے زمانے کے ممتاز علماء میں سے تھے، شاہ جہاں نے اُن کے درس و تدریس کے لئے ہاپوڑ میں ایک مدرسہ تعمیر کرا دیا سیّد عالم کا سلسلۂ نسب ۲۶ واسطوں سے حضرت امام حسینؓ پر منتہی ہوتا ہے۔

۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء میں آپ کی ولادت اجمیر میں ہوئی، جہاں آپ کے دادا سیّد عبدالکریم محکمۂ پولیس میں تھانہ دار تھے، چار سال کی عمر میں تعلیم کا آغاز ہوا قرآن شریف والدہ ماجدہ سے پڑھا، فارسی کی تعلیم اپنے خاندان کے بزرگوں سے حاصل کی، عمر کے بارھویں سال اپنے خاندانی بزرگ اور عالم مولانا خالد سے عربی صرف و نحو شروع کی، اسی دوران میں آپ کے والد ماجد کو اپنے آبائی مدرسہ کے احیاء کا خیال پیدا ہوا جو ۱۸۵۷ھ کی داروگیر کی نذر ہو گیا تھا، چند سال اس میں تعلیم پانے کے بعد آپ کو گلاؤٹھی کے مدرسہ منبع العلوم میں بھیجدیا گیا۔ وہاں مولانا ماجد علی سے مختلف کتابیں پڑھیں، بعد ازاں اپنے اُستاذ مولانا ماجد علی کے ساتھ دہلی چلے گئے۔ دہلی کے مدارس میں معقولات کی کتابیں پڑھیں، ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء میں دارالعلوم میں آئے، حضرت شیخ الہندؒ نے امتحان داخلہ لیا، امتحان میں امتیازی نمبروں سے سرفراز ہوئے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی ہدایت کے مطابق ایک سال کے بجائے دو سالوں میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی، دارالعلوم کے زمانۂ طالب علمی ہی میں طلباء کو معقولات کی کتابیں پڑھانے لگے تھے۔

۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد دارالعلوم میں مدرس مقرر ہو گئے، مگر پھر کچھ عرصے کے بعد اکابرِ دارالعلوم نے شوال ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء میں آپ کو مدرسہ شاہی مراد آباد میں بھیجدیا جہاں تقریباً ہم سال قیام رہا تقریباً نصف صدی کی اس طویل مدّت میں بہت سے طلباء حدیث نے آپ سے اکتسابِ فیض کیا ہے[1]

---

[1] ایضاح البخاری جلد اوّل ص ۱۲۰

مولانا ممدوح چونکہ حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ کے خاص تلامذہ میں سے تھے، اس لئے آپ کے درسِ حدیث میں دونوں جلیل القدر استادوں کے رنگ کی آمیزش پائی جاتی تھی، چنانچہ آپ کا درسِ بخاری نہایت مبسوط اور مفصّل ہوتا تھا، جس میں حدیث کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث ہوتی تھی، فقہاء کے مذاہب کو بیان کرنے کے بعد احناف کے فقہی مسلک کی تائید و ترجیح کی وضاحت میں ایسے پُر زور دلائل پیش فرماتے تھے جس کے بعد سامع کے ذہن میں کوئی ادنیٰ خلجان باقی نہیں رہتا تھا، اثناء درس میں صحیح بخاری کی مختلف شروح کے ساتھ ساتھ اپنے اساتذہ کے علوم و معارف بھی جا بجا پیش فرماتے رہتے، درسِ حدیث میں آپ کی تقریر مبسوط و مفصّل ہونے کے علاوہ سہل اور دل نشین ہوتی تھی، اس لئے کم استعداد کے طلباء کو بھی استفادے کا پورا پورا موقع مل جاتا تھا، اندازِ بیان نہایت پاکیزہ اور شستہ ہوتا تھا، جس میں آپ کے جمالِ ظاہری کی تمام خصوصیات بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں آپ کے درسِ بخاری شریف کو شہرتِ تام اور قبول حاصل تھی۔

اپنے دور میں وہ یگانۂ روزگار عالم اور درسِ حدیث کے بے مثل استاذ تھے اور طلباء ان سے تلمذ پر فخر محسوس کرتے تھے۔

۱۳۷۷ھ ۱۹۵۷ء میں حضرت مولانا مدنیؒ کی وفات کے بعد دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے اراکین نے دار العلوم دیوبند کے لئے آپ کا انتخاب کیا، حضرت مولانا مدنیؒ نے مرض وفات میں باصرار آپ کو مراد آباد سے بلا کر اپنی جگہ صحیح بخاری کے درس کے لئے مامور کیا تھا، اس سے پہلے بھی دو مرتبہ حضرت مولانا مَدنیؒ کی گرفتاری اور رخصت کے زمانے میں آپ دار العلوم میں صحیح بخاری کا درس دے چکے تھے، ۱۳۹۰ھ ۱۹۷۰ء میں پونے تین سو کے قریب طلباء آپ کے درسِ حدیث میں شریک تھے، کم و بیش دورۂ حدیث کے طلباء کی یہی تعداد ہر سال رہتی تھی۔

تعلیمی مشاغل کے علاوہ ملکی سیاسیات سے بھی آپ کو تحریکِ خلافت کے زمانے سے تعلق رہا، اس کے نتیجے میں قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں، حضرت مولانا مَدنیؒ کی

جمعیۃ علماء ہند کی صدارت کے زمانے میں دو مرتبہ نائب صدر رہے اور بعد ازاں مسندِ صدارت پر فائز ہوئے، اور تادمِ واپسیں جمعیۃ علماء ہند کی صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے، آخر عمر میں جب صحت نے جواب دے دیا تو بغرض علاج و تبدیل آب و ہوا اُن کو مراد آباد لے جایا گیا، مگر وقتِ موعود آچکا تھا۔ مراد آباد میں کچھ عرصہ علیل رہ کر ۲۰ صفر ۱۳۹۲ھ (۵ اپریل ۱۹۷۲ء) کی تاریخ میں نصف شب کے بعد انتقال فرمایا، اطلاع ملنے پر دارالعلوم اور دہلی سے بہت سے حضرات مراد آباد پہنچ گئے۔

حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے نماز جنازہ پڑھائی بعد دوپہر علم و فضل کا یہ آفتابِ جہاں تاب سرزمینِ مراد آباد میں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ!

دارالعلوم دیوبند میں صحیح بخاری کے درس کا یہ عظیم تعلیمی منصب تقریباً ۶۰ سال سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں مسلسل چلا آرہا تھا، حضرت مولانا فخر الدین احمدؒ کی وفات کے بعد یہ تسلسل ختم ہو گیا۔

علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ[1]

۱۳۰۴ھ میں مشرقی یوپی کے شہر بلیا کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے، اُن کا خاندان پنجاب کے ضلع جھنگ سے جون پور آیا اور پھر کچھ مدت کے بعد بلیا میں آباد ہو گیا، جون پور میں فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم مشہور طبیب مولانا حکیم جمیل الدین نگینوی سے حاصل کی، اور معقولات کی کتابیں مولانا فاروق احمد چریاکوٹی اور مولانا ہدایت اللہ خان (تلمیذ مولانا فضل حق خیر آبادی) سے پڑھیں، دینیات کی تعلیم کے لئے مولانا عبدالغفار کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا جو حضرت

---

[1] اگرچہ شیخ الحدیث کی حیثیت سے حضرت مولانا فخر الدین احمدؒ کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، مگر صدر المدرسین کی حیثیت سے حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا۔

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، ۱۳۲۵ھ کے اواخر میں دار العلوم دیوبند میں داخل ہوکر اولاً ہدایہ اور جلالین وغیرہ کتابیں پڑھیں اور ۱۳۲۷ھ میں دار العلوم سے فارغ التحصیل ہوئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد اسی سال میں مدرسہ عالیہ فتح پوری کے مدرس دوم بنائے گئے، پھر عمری ضلع مرادآباد کے مدرسہ میں کچھ عرصے تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ ۱۳۳۱ھ میں آپ کو دار العلوم میں بلالیا گیا، ۱۳۴۰ھ سے ۱۳۴۴ھ تک مدرسہ دار العلوم مئو ضلع اعظم گڈھ اور مدرسہ امدادیہ دربھنگہ (بہار) میں صدارتِ تدریس کی خدمات انجام دیں، ۱۳۴۴ھ میں آپ کو پھر دار العلوم دیوبند میں بلایا گیا ۱۳۳۳ھ کی روداد میں آپ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:-

"مولوی محمد ابراہیم صاحب تمام علوم میں کامل الاستعداد ہیں، معقول و فلسفہ کی تمام کتابیں نہایت خوبی سے پڑھاتے ہیں، فلسفہ و منطق اور کلام کے انتہائی اسباق صدرا، شمس بازغہ، قاضی مبارک، حمد اللہ، امور عامہ کے علاوہ شرح مطالع، شرح اشارات وغیرہ پڑھاتے ہیں، طلبار کا بہت زیادہ میلان ان کی طرف رہتا ہے، نہایت خوش تقریر ہیں، غرض یہ ایک نہایت قابلِ قدر اور شہرت و نفعت حاصل کرنے والے مدرس ہیں۔"

۱۳۶۲ھ میں پھر دار العلوم سے علیحدگی اختیار کی، اولاً جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مسندِ صدارت کو رونق بخشی، وہاں کے بعد کچھ عرصے تک مدرسہ عالیہ فتح پوری میں صدارتِ تدریس کی خدمات انجام دیں، اور بعد ازاں بنگال میں ہاٹ ہزاری ضلع چاٹگام کے مدرسہ میں صدر المدرسین رہے، اور بالآخر ۱۳۶۶ھ میں پھر دار العلوم دیوبند آگئے، ۱۳۷۷ھ میں حضرت مولانا مدنیؒ کی وفات کے بعد آپ دار العلوم کی مسند صدارتِ تدریس پر فائز ہوئے، اور تا دمِ واپسیں اس پر متمکن رہے ـــــ ان کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے، جو برِّ صغیر کے علاوہ ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

حضرت علامہ بلیاوی ہر علم و فن خصوصاً علم کلام و عقائد میں یگانۂ روزگار تھے، اُنھوں نے تفسیر و حدیث، عقائد و کلام اور دوسرے علوم کی نمایاں خدمات انجام دیں اُنکے درس و تدریس کی مدت ۱۳۲۷ھ سے ۱۳۸۷ھ تک ۶۰ سال ہوتی ہے، طلبا اُن کے درس میں بڑے شوق اور انہماک سے شریک ہوتے اور اُن کے افاداتِ عالیہ سے مستفید ہونے کے متمنی رہتے تھے، درس میں اختصار کے ساتھ بڑی جامعیت کی شان تھی، درس کا انداز نہایت باوقار ہوتا تھا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ لطائف و ظرائف کے پیرائے میں دقیقہ سنجی اور بالغ نظری سے اہم مسائل کو حل کرنے کا خاص ملکہ اور کمال حاصل تھا، قصص و حکایات کو مسائل پر اس طرح منطبق کر دیتے تھے کہ مسئلے کے تمام پہلو واضح اور منقح ہوجاتے تھے. اُن کے درس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ تلامذہ میں فن سے گہری مناسبت پیدا ہوجاتی تھی اور اُن پر علم و دانش کی راہیں کھل جاتی تھیں. وہ اپنے عہد میں عقائد و کلام و منطق و فلسفہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، حدیث میں روایت سے زیادہ درایت سے کام لیتے تھے حضرت نانوتویؒ کے علوم پر اُن کی گہری نظر تھی، حضرت شیخ الہندؒ سے تلمذ کے علاوہ بیعت کا شرف بھی حاصل تھا۔

علامہ بلیاویؒ کی تصانیف میں رسالہ مصافحہ اور رسالہ تراویح اُردو میں ہیں، ایک رسالہ انوار الحکمۃ فارسی میں ہے، یہ رسالہ منطق و فلسفہ کے مضامین پر مشتمل ہے سلم العلوم پر اُن کا حاشیہ عربی میں ضیاء النجوم ہے، میبذی اور خیالی پر بھی انھوں نے حواشی لکھے تھے جو ضائع ہوگئے ہیں، آخر میں جامع ترمذی پر حاشیہ لکھ رہے تھے جس کے پورے ہونے کی نوبت نہ آسکی۔

صحت عرصہ سے خراب ہوگئی تھی ۲۴ رمضان ۱۳۸۷ھ کی دوپہر کو ۸۴ سال کی عمر میں داعئ اجل کو لبیک کہا، قبرستانِ قاسمی میں آسودۂ خواب ہیں۔

۞

مولانا شریف حسن دیوبندیؒ

دیوبند کے رہنے والے تھے ۹ اگست ۱۹۲۰ء کو دیوبند میں پیدا ہوئے، اور یہیں حافظ عبدالغنی مرحوم سے قرآن شریف حفظ کیا، پھر تین سال تک فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں بہٹ (ضلع سہارن پور) کے مدرسہ میں رہ کر پڑھیں، بعدازاں دارالعلوم میں داخل ہوکر درس نظامی کے نصاب کی تکمیل کی ۱۳۵۸ھ میں دورۂ حدیث سے فارغ التحصیل ہوئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد شوال ۱۳۶۰ھ ۱۹۴۱ء میں مدرسہ امداد العلوم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں صدر مدرس مقرر ہوئے، انھیں جملہ علوم و فنون میں کامل دست گاہ حاصل تھی، حکیم الاُمّت حضرت تھانویؒ کے فیضِ صحبت سے حدیث اور افتار سے خاص مناسبت پیدا ہوئی، تقریباً ۱۳۶۴ھ میں مدرسہ اشاعت العلوم بریلی کے صدر المدرسین بنائے گئے، وہاں درسِ حدیث کے ساتھ افتار کے فرائض بھی انجام دیئے، ۹ سال کے بعد جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل (ضلع سورت) میں شیخ الحدیث مقرر ہوئے، وہاں صحیح بخاری اور جامع ترمذی زیرِ درس رہیں۔

۱۳۸۳ھ میں انھیں دارالعلوم دیوبند میں بلایا گیا، علم حدیث سے خاص شغف تھا، حضرت مولانا فخرالدین احمدؒ کے بعد بخاری شریف کے درس کو سنبھالنا اُن کا بڑا علمی کارنامہ ہے، تادمِ واپسیں عملاً شیخ الحدیث کے فرائض انجام دیتے رہے، ان کی پوری زندگی درس و تدریس اور علومِ دینیہ کے طلباء کی خدمت میں گزری، اُن کا درس علمی مواد سے بھرپور ہوتا تھا، طلباءِ حدیث اُن کے درس سے مطمئن ہوکر اُٹھتے تھے، وفات سے چند گھنٹے قبل تک اُن کا علمی فیضان جاری رہا۔

مولانا شریف حسنؒ صاحبِ علم و عمل، تقویٰ و طہارت اور فضائلِ اخلاق و شمائل میں علماءِ سلف کی یادگار تھے، وہ اپنے علمی تبحر اور علم حدیث سے خصوصی تعلق و شغف اور اپنی پاکیزہ نفسی کے باعث اپنے معاصرین علماء میں ممتاز سمجھے جاتے تھے، ہر چھوٹے بڑے سے

خندہ پیشانی سے ملتے تھے، ظاہر و باطن دونوں پاک تھے، طبیعت نہایت مرنجان مرنج پائی تھی۔

۱۴، ۱۵ جمادی الثانی ۱۳۹۷ھ کی درمیانی شب میں تقریباً ۵۸ سال کی عمر میں بعارضۂ قلب چند گھنٹوں کی مختصر علالت کے بعد واصل بحق ہو گئے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً قبرستانِ قاسمی ان کی ابدی آرام گاہ ہے۔

مولانا سیّد فخر الحسن صاحب ۱۰ رجب ۱۳۲۳ھ کو اپنے آبائی وطن قصبہ عُمری ضلع مرادآباد میں پیدا ہوئے، مظہر حسین تاریخی نام ہے، قرآن شریف اُردو دینیات اور ابتدائی فارسی کی تعلیم حافظ نسیم الدّین اور حافظ عبدالقادر امروہی سے حاصل کی، آپ کے والدِ ماجد مدرسہ شاہی مرادآباد میں کتب خانہ کے ناظم تھے، اس لئے تقریباً ۱۳۳۵ھ میں مدرسہ شاہی مرادآباد میں داخل ہو گئے، یہاں فارسی کی تکمیل کی اور درسِ نظامی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں، پھر مظاہر علوم سہارن پور میں داخلہ لیا اور متوسطات کی تحصیل کی، ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۱۳۴۷ھ میں دورۂ حدیث کی تکمیل کر کے فارغ التحصیل ہوئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ عالیہ فتح پوری میں مدرس مقرر ہوئے، وہاں سے آپ بہار چلے گئے اور مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں صحاح کی بعض کتابیں پڑھانے پر مامور کئے گئے مگر ڈیڑھ سال کے بعد پھر مدرسہ عالیہ فتح پوری میں واپس آ گئے، اور آخر میں مدرسہ عالیہ کے صدر مدرس بنائے گئے، ۱۳۶۲ھ میں آپ کو دارالعلوم میں بلا کر طبقۂ علیہ کا مدرس مقرر کیا گیا اور صحیح مُسلم اور اُمورِ عامہ وغیرہ کتابیں دی گئیں، دارالعلوم میں آپ کے درس صحیح مُسلم اور تفسیر بیضاوی کو خاص شہرت حاصل ہے۔ چنانچہ بیضاوی کی آپ کی درسی تقریر التقریر الحاوی کی جلد اوّل شائع ہو کر قبولِ عام حاصل کر چکی ہے، وعظ و تقریر میں بھی دستگاہ حاصل ہے۔

۱۳۸۷ھ میں حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ کی وفات کے بعد آپ کو دارالعلوم کا صدر المدرسین بنایا گیا، جس پر آپ اب تک فائز ہیں۔

حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے آپ کو اجازت و خلافت حاصل ہے،

مولانا نصیر احمد خاں صاحب

۲۱ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ کو ضلع بلند شہر کے موضع بسی میں پیدا ہوئے، حفظ قرآن مجید کے بعد فارسی اور عربی کی جملہ درسیات شروع سے آخر تک مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی (ضلع بلند شہر) میں پڑھیں ۱۳۶۲ھ میں دارالعلوم دیوبند کے دورۂ حدیث میں داخلہ لے کر کامیابی حاصل کی، ۱۳۶۳ھ میں فنون اور تجوید میں قرأت حفص وسبعہ عشر کی تکمیل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۳۶۵ھ کے اواخر میں دارالعلوم میں مدرس مقرر ہوئے ۱۳۹۱ھ میں تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ ان کی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے پیش نظر انھیں نیابتِ اہتمام کا منصب تفویض کیا گیا، بعد ازاں ۱۳۹۷ھ میں شیخ الحدیث کی مسند پر فائز ہوئے، ان کی شخصیت میں علمی اور انتظامی دونوں صلاحیتوں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

مولانا موصوف کے درسِ حدیث کو عام طور پر پسند کیا جاتا ہے، ان کی درسی تقریریں عام فہم مربوط اور مدلّل ہوتی ہیں، انھیں فن ہیئت میں بھی بڑا درک حاصل ہے۔ ہیئت کے رسالہ فتحیہ پر حاشیہ لکھا ہے جو دارالعلوم دیوبند کے نصابِ تعلیم میں شامل ہے طبیعت میں سادگی، تواضع وانکسار اور ظاہر و باطن میں یکسانیت پائی جاتی ہے، شگفتہ مزاج اور خوش خُلق ہیں۔

اربابِ اہتمام

حاجی سیّد محمد عابدؒ

حاجی صاحبؒ دیوبند کے نہایت متقی پرہیزگار اور صاحبِ اثر بزرگ تھے تعویذات اور عملیات کے فن میں دُور دُور تک شہرت تھی، بنارِ دارالعلوم کے شریک کار تھے، دارالعلوم کا منصبِ اہتمام اوّلاً آپؒ ہی کے سپرد ہوا تھا، حضرت تھانویؒ اپنی مثنوی زیر و بم میں فرماتے ہیں[1]:-

عاملِ کامل، ولی، مردِ خدا — پائے او در پائے فخرِ انبیار

ہم جمالی ہم جلالی، شانِ او — کانِ حلم و مخزنِ خُلقِ نکو

نقش و تعویذش مثالِ نقشِ قدر — فیضِ اُو بر خاص و عامی مثل بدر

حاجی صاحبؒ کا سالِ ولادت ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء ہے، قرآن شریف اور فارسی پڑھ کر علومِ دینیہ کی تعلیم کے لئے دہلی گئے، زمانۂ تعلیم میں تصوّف کا شوق ایسا دامن گیر ہوا کہ علوم کی تکمیل نہ کرسکے، متعدد بزرگوں سے خلعتِ خلافت حاصل کیا، میاں جی کریم بخش رام پوریؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس اللہ سرہٗ سے بھی شرفِ خلافت حاصل تھا۔

---

[1] مثنوی زیر و بم بحوالہ القاسم دارالعلوم نمبر بابت ماہ محرم ۱۳۴۷ھ ص ۱۹

حاجی صاحبؒ کے پیر میاں جی کریم بخش رام پوریؒ کو مولانا محمد حسن رام پوریؒ (وفات ۱۲۷۹ھ) سے خلافت حاصل تھی، میاں جی نے خواب میں دیکھا کہ آسمان پر ایک بہت بڑا ستارہ ہے، اور اس کے گرد اور بہت سے ستارے ہیں، بڑا ستارہ اُن کی گود میں آگیا ہے، میاں جیؒ نے صبح کو مُریدین سے فرمایا کہ مجھ سے کوئی سیّد بیعت ہوگا، جو متبع سنت ہوگا، اس سے لوگوں کو بڑا فیض پہنچے گا، اور وہ بہت سے دینی کام انجام دے گا۔[1]

حضرت حاجی صاحبؒ کا ۶۰ برس تک چھتہ کی مسجد میں قیام رہا، مشہور ہے کہ ۳۰ سال تک آپ کی تکبیرِ اُولیٰ فوت نہیں ہوئی، نمازِ تہجد کا ایسا التزام تھا کہ ۶۰ سال تک قضا کی نوبت نہیں آئی، صاحبِ کشف و کرامت بزرگ تھے، رُشد و ہدایت اور تذکیر و تزکیۂ قلوب کے علاوہ آپ کو "فنِ عملیات" میں زبردست ملکہ حاصل تھا۔ لوگ دُور دُور سے تعویذات و عملیات کے لئے حاضر ہوتے اور دامنِ اُمید گوہرِ مُراد سے بھر کر لوٹتے تھے، مختلف کاموں کی کثرت کے باوجود ضبطِ اوقات کا بے حد التزام تھا اور ہر کام ٹھیک اپنے وقت پر انجام پاتا تھا۔

آخر شب میں بیدار ہوتے، نمازِ تہجد اور اوراد و وظائف سے فارغ ہو کر فجر کی نماز چھتے کی مسجد میں ادا فرماتے۔ نماز کے بعد تلاوت فرما کر حجرے سے باہر تشریف لاتے، بیعت کے خواہش مندوں کو بیعت کرتے، تعویذات کے طالبین کو تعویذ دیتے، دوپہر تک یہ سلسلہ جاری رہتا، بعد ظہر متوسلینِ طریقت حاضر ہوتے، اس وقت ذکر و شغل ہوتا، اور عصر تک جاری رہتا، بعد مغرب ختمِ خواجگان کا معمول تھا، عشاء کے بعد اوّل وقت سو جاتے تھے۔

تعویذات کے ضرورت مند بعض اوقات حد سے زیادہ پریشان کرتے، مگر اخلاق و تواضع کا یہ عالم تھا کہ کبھی تُرش رُو ہوتے نہیں دیکھا گیا، اتباعِ سنت کا غائت اہتمام تھا، اُن کا مقولہ ہے کہ "بے عمل درویش ایسا ہے جیسے سپاہی بے ہتھیار، درویش کو چاہیئے کہ اپنے

---

[1] تذکرۃ العابدین ص ۶۳ و ۶۴ مطبوعہ دلی پرنٹنگ پریس دہلی ۱۳۳۳ھ

آپ کو چھپانے کے لئے عامل ظاہر کر دے"، وہ طریقۂ چشتیہ صابریہ کے بزرگ اور زہد و ریاضت کا مجسمہ تھے۔

ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ مُریدین میں حاجی محمد انور دیوبندیؒ نے نفس کُشی کے طور پر کھانا پینا قطعاً ترک کر دیا ہے، آپ نے بتاکید اُن کو لکھا کہ "یہ امرِ سُنّت کے خلاف ہے، بطریقِ مسنون کھانا پینا ضرور چاہیئے، خواہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو"[1]

انوارِ قاسمی میں سوانح مخطوطہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "حاجی صاحبؒ دیوبند میں ایک ذی وجاہت، صاحبِ اثر، عابد زاہد ہستی تھے، آپ کی بزرگی کا سکّہ دیوبند کے ہر خورد وکلاں، مرد و عورت، بچے اور بوڑھے کے دل پر تھا، اُن کے روحانی فیض نے دیوبند اور اطراف وجوانب بلکہ دوسرے صوبوں کے لوگوں کے دلوں کو بھی مسخر کر رکھا تھا، عابد وزاہد ہونے کے ساتھ بہت بڑے عامل بھی تھے، آپ کے تعویذوں کا روحانی فیض بیماروں پر تریاق کا کام کرتا تھا، آپ کی صورت کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا۔

پابندیٔ وضع، استقلالِ طبع، اُولوالعزمی، خوش تدبیری آپ کی مشہور ہے، باوجودیکہ دنیا کو ترک کر دیا ہے، مگر کوئی آپ سے مشورہ لیتا ہے تو اس میں ایسی اچھی رائے ہوتی ہے جیسے بڑے کسی ہوشیار دنیا دار کی"[2]

سوانح قاسمی میں سوانح مخطوطہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "اہلِ دیوبند کو آپ سے کمال درجے عقیدت ہے، آپ کی ذات فیضِ آیات سے خلائق کو بہت طرح کا نفع حاصل ہے غیر مذہب والے بھی آپ کے تعویذوں کے معتقد ہیں، گھر باہر، زمین، باغ جس قدر آپ کی مِلک میں تھا سب کا سب راہِ خدا میں دے کر محض خدا پر تکیہ کیا ہوا ہے۔"[3]

---

[1] تذکرۃ العابدین ص ۶۷ [2] انوارِ قاسمی جلد اول ص ۳۵۰ و ۳۵۱ مطبوعہ لاہور

[3] سوانح قاسمی جلد دوم ص ۲۲۹ و ۲۴۱ مطبوعہ نیشنل پریس دیوبند

اوقات و معمولات کے ضبط و نظم کا بڑا اہتمام رکھتے تھے، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ فرمایا کرتے تھے کہ "جاننے والا ہر وقت یہ بتا سکتا ہے کہ اِس وقت حاجی صاحبؒ فلاں کام میں مشغول ہوں گے، اگر کوئی جا کر دیکھے تو اسی کام میں اُن کو مشغول پائے گا"[1]

اشرف السوانح میں حضرت تھانویؒ کا ایک ملفوظ نقل کیا گیا ہے۔ لکھا ہے کہ "میں حاجی صاحبؒ کو بزرگ تو سمجھتا تھا، مگر یہ خیال نہ تھا کہ وہ شیخ اور مربّی بھی ہیں، لیکن اپنے ایک باطنی اشکال کے دوران اُن کے جوابِ شافی سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ کامل درجے کے شیخ اور مربّی تھے"[2]

دارالعلوم دیوبند کے لئے عوامی چندے کی تحریک کا آغاز آپ ہی نے فرمایا تھا، حاجی فضل حقؒ نے حضرت نانوتویؒ کی سوانح مخطوطہ میں لکھا ہے:۔

ایک دن بوقتِ اشراق (حضرت حاجی سیّد محمد عابدؒ) سفید رومال کی جھولی بنا اور اس میں تین روپے اپنے پاس سے ڈال چھتہ کی مسجد سے تنِ تنہا مولوی مہتاب علی مرحوم کے پاس تشریف لائے۔

مولوی صاحب نے کمال کشادہ پیشانی سے چھ روپے عنایت کئے اور دعا کی، اور بارہ روپے مولوی فضل الرحمٰن صاحب نے اور چھ روپے اس مسکین (سوانح مخطوطہ کے مصنف حاجی فضل حق صاحب) نے دیئے، وہاں سے اُٹھ مولوی ذوالفقار علی سلمہ اللہ تعالےٰ کے پاس آئے، مولوی صاحب ماشاءاللہ علم دوست ہیں، فوراً بارہ روپے دیئے، اور حسنِ اتفاق سے اس وقت سیّد ذوالفقار علی ثانی دیوبندی وہاں موجود تھے، اُن کی طرف سے بھی بارہ روپے عنائت کئے، وہاں سے اُٹھ کر یہ درویش بادشاہ صفت محلہ ابوالبرکات پہنچے، دو سو روپے

---

[1] اشرف السوانح جلد اوّل ص ۱۴۹

[2] " " ص ۱۵۰، ۲۴۸

جمع ہو گئے، اور شام تک تین سو روپے، پھر تو رفتہ رفتہ چرچا ہوا، اور جو پھل پھول اس کو لگے وہ ظاہر ہیں، یہ قصہ بروز جمعہ دوم ماہ ذیقعدہ ۱۲۸۲ھ میں ہوا۔[1]

دار العلوم کی مجلس شوریٰ کی رکنیت کے علاوہ تین مرتبہ اہتمام آپ کے سپرد ہوا، پہلی مرتبہ یوم تاسیس سے ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء تک دوسری مرتبہ ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء سے ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء تک اور تیسری مرتبہ ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء تک مجموعی طور پر مدت ۱۰ سال ہوتی ہے۔

جامع مسجد دیوبند کی تعمیر بھی آپ ہی کی جدوجہد اور سعی وکوشش کا نتیجہ ہے، آخر میں کثرتِ مصروفیت کے باعث آپ اہتمام سے مستعفی ہو گئے تھے، ان کے اثر و وجاہت سے دار العلوم کو کافی فوائد حاصل ہوئے، اور اس کا ہر قدم ترقی کی جانب گامزن رہا۔

پنجشنبہ، ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۲ء کو ۸۱ سال کی عمر میں وفات پائی، "مدار المہام بہشت بریں" مادہ سن وفات ہے، تذکرۃ العابدین میں آپ کے تفصیلی حالات مذکور ہیں۔[2]

مولانا رفیع الدینؒ

مولانا موصوف ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے، حضرت شاہ عبد الغنی مجددی کے مشہور خلفاء میں تھے، گو علمی حیثیت معمولی تھی، لیکن انتظامی اُمور کا زبردست ملکہ تھا اور اس بارے میں عجیب وغریب صفات کے مالک تھے، اُن کا شمار اپنے زمانے کے اولیائے کاملین میں تھا، دو مرتبہ دار العلوم کے

---

[1] سوانح مخطوطہ بحوالہ سوانح قاسمی جلد دوم ص ۲۵۸ و ۲۵۹

[2] حاجی صاحبؒ کو عابد حسین اور محمد عابد دونوں ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے، لیکن خود حاجی صاحبؒ کی جتنی تحریریں راقم سطور کی نظر سے گزری ہیں ان میں خود اُن کے قلم سے محمد عابد تحریر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اولاً ان کا نام عابد حسین تھا، مگر بعد میں غالباً انھوں نے خود اسے محمد عابد سے بدل لیا جیسا کہ حضرت حاجی امداد اللہؒ مہاجر مکی کا نام شروع میں امداد حسین تھا، مگر بعد میں امداد اللہ کر لیا، کچھ یہی صورت یہاں بھی ہوئی ہے۔

مہتمم مقرر ہوئے، پہلی مرتبہ ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء اور ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں حاجی صاحبؒ کے سفرِ حج کے زمانے میں اہتمام کی خدمات انجام دیں، پھر تقریباً ۳ سال کے بعد ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں مستقل مہتمم قرار پائے اور ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء کے اوائل تک اس منصب پر فائز رہے، آپ کے زمانے میں دارالعلوم نے بڑی ترقی کی جس کو بڑی حد تک آپ کے حُسنِ انتظام کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے، مشہور ہے کہ دیانت و امانت کے ساتھ انتظامی سلیقے کا بہت کم اجتماع ہوتا ہے مگر اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ کل مدّت اہتمام تقریباً ۱۹ سال ہے۔

دارالعلوم کی اکثر ابتدائی عمارتیں آپ ہی کے زمانۂ اہتمام میں تعمیر ہوئیں، اُن کے تعمیری ذوق کا اندازہ اس زمانے کی عمارتوں بالخصوص نودرے وغیرہ کی پختگی، اُستواری اور حسنِ تعمیر سے کیا جا سکتا ہے، یہ عمارت دارالعلوم کی عمارتوں میں ایک ممتاز شان اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مشہور ہے کہ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں جب نودرے کی عمارت کی (جو موجودہ عمارتوں میں سب سے پہلی عمارت ہے) بنیاد شروع کی گئی تو آپ نے خواب دیکھا کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجوّزہ مقام پر تشریف رکھتے ہیں، اور اُن سے خطاب فرما رہے ہیں کہ "یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے" یہ فرما کر خود عصائے مُبارک سے احاطہ و عمارت کا نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ "ان نشانات پر تعمیر کی جائے" مولانا نے صبح کو اُٹھ کر دیکھا تو نشانات موجود تھے، چنانچہ ان ہی نشانات پر بنیاد کُھدوا کر تعمیر شروع کرائی گئی۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمنؒ (وفات ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء) کو مولانا رفیع الدینؒ سے خلافت حاصل تھی، ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء میں آپ بقصدِ ہجرت مدینہ منورہ تشریف لے گئے، اور وہیں دو سال کے بعد ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں انتقال فرمایا اور جنّت البقیع میں دفن ہوئے۔

حاجی سید فضل حق دیوبندیؒ

حاجی صاحبؒ دیوبند کے خاندانِ ساداتِ رضویہ سے تھے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ سے شرفِ بیعت حاصل تھا، یہ شروع سے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔

حاجی محمد عابدؒ کے زمانۂ اہتمام میں سربراہِ کار کی حیثیت سے کئی سال تک دارالعلوم کی خدمات انجام دیں، ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں حاجی محمد عابد صاحبؒ کے مستعفی ہو جانے پر مہتمم مقرر ہوئے، اور تقریباً ایک سال تک اس خدمت کو انجام دے کر مستعفی ہو گئے۔

حاجی فضل حق صاحب نے حضرت نانوتویؒ کی ایک سوانح حیات لکھی تھی، جو ہنوز طبع نہیں ہوئی، سوانح قاسمی مؤلفہ مولانا مناظر احسن گیلانی میں سوانح مخطوطہ کے نام سے جا بجا اس کے اقتباسات دئے گئے ہیں، اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہایت جامع اور مکمل سوانح حیات ہوگی، تحریری صلاحیتوں کے ساتھ اُن میں انتظامی صلاحیت بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی، دارالعلوم کے تعلق سے قبل سہارن پور میں سرکاری محکمۂ تعلیم سے مدت تک وابستہ رہ چکے تھے۔

مولانا محمد منیر نانوتویؒ

مشہور عالم و مصنف مولانا محمد احسن نانوتویؒ اور مولانا محمد مظہرؒ کے چھوٹے بھائی تھے، ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے والد حافظ لطف علی سے حاصل کی، پھر دہلی کالج میں داخل ہو گئے، وہاں حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ، مفتی صدر الدین آزردہ اور حضرت شاہ عبدالغنی دہلویؒ سے علمی استفادہ کیا مولانا محمد منیرؒ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے ایک سرگرم کارکن اور مجاہد تھے، شاملی کے معرکے میں دوسرے اکابر کے دوش بدوش شریک رہے اور خوب دادِ شجاعت دی، جنگِ شاملی کے بعد رُوپوش ہو گئے تھے، معافیٔ عام کے بعد اپنے بڑے بھائی مولانا محمد احسن کے پاس بریلی پہنچے اور ۱۸۶۱ء/۱۲۷۸ھ میں بریلی کالج میں ملازم ہو گئے، پنشن ملنے تک بریلی میں قیام رہا، قیام بریلی کے زمانے میں اپنے بھائی مولانا محمد احسن کے مطبع صدیقی بریلی کے مہتمم بھی رہے، مولانا محمد منیر نقشبندی سلسلے میں بیعت تھے، اُنھوں نے امام غزالیؒ کی کتاب منہاج العابدین کا اُردو میں ترجمہ سراج السالکین کے نام سے کیا ہے جو مطبع صدیقی بریلی میں ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں طبع ہوا ہے، اُن کی دوسری تصنیف فوائدِ غریبہ ہے

یہ بھی تصوّف کے مسائل پر مشتمل ہے۔

ایک سال سے کچھ زائد مدت تک مہتمم رہے، دارالعلوم میں خارج اوقات میں طلباء کو عربی ادب کی کتابیں پڑھاتے تھے۔

دیانت و امانت میں مولانا منیرؒ کا بڑا پایہ تھا۔ ارواحِ ثلاثہ میں اُن کے متعلق ایک واقعہ لکھا ہے کہ مولانا دارالعلوم کی سالانہ روداد چھپوانے کے لئے ڈھائی سو روپے لے کر دہلی گئے، اتفاق سے وہاں روپے چوری ہو گئے، مولانا منیر اس حادثے کی کسی کو اطلاع کئے بغیر اپنے وطن نانوتہ آئے، اپنی زمین فروخت کر کے روپیہ فراہم کیا، اور اس سے روداد چھپوا کر لائے، مجلس شوریٰ کے ارکان کو جب اس کا علم ہوا تو اُنھوں نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے اس کے متعلق مسئلہ دریافت کیا، وہاں سے جواب آیا کہ "مہتمم صاحب امین تھے اور روپیہ چونکہ بلاتعدّی کے ضائع ہوا اس لئے ان پر تاوان نہیں آسکتا" ارکانِ مجلس نے حضرت گنگوہیؒ کا فتویٰ دکھا کر مولانا محمد منیر سے درخواست کی کہ اپنا روپیہ واپس لے لیں، مولانا نے فرمایا کہ "فتویٰ کی بات نہیں ہے، اگر خود مولانا رشید احمد صاحب کو ایسا واقعہ پیش آتا تو کیا وہ بھی روپے لے لیتے"؟ چنانچہ اصرار کے باوجود روپیہ لینے سے انکار کر دیا۔[1]

مولانا حافظ محمد احمدؒ

حافظ صاحبؒ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے فرزندِ رشید تھے، ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے، قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد والد ماجد نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گلاؤٹھی (ضلع بلند شہر) بھیجدیا گلاؤٹھی میں حضرت نانوتویؒ کا قائم کیا ہوا مدرسہ منبع العلوم تھا، حضرت مولانا عبداللہ انبہٹوی اس مدرسہ میں مدرس تھے، بعد ازاں مزید تعلیم کے لئے مراد آباد کے مدرسہ شاہیؒ میں بھیجے گئے، یہاں حضرت نانوتویؒ کے شاگردِ رشید حضرت مولانا احمد حسن امروہیؒ پڑھاتے تھے،

---

[1] ارواحِ ثلاثہ حکایت ۲۵۴، مولانا محمد احسن نانوتوی، ۱۵۷ – ۱۶۰

اُن سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھنے کے بعد دیوبند تشریف لائے اور حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے ترمذی شریف کے چند سبق پڑھے، دورۂ حدیث گنگوہ پہنچ کر حضرت گنگوہیؒ کے حلقۂ درس میں پورا کیا اور وہیں جلالین اور بیضاوی پڑھی۔

۱۳۰۳ھ ۱۸۸۵ء میں بحیثیت مدرس دارالعلوم میں تقرر ہوا اور مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھانے کی نوبت آئی ۱۳۱۰ھ ۱۸۹۲ء میں جب حضرت حاجی محمد عابدؒ اہتمام سے مستعفی ہوئے تو یکے بعد دیگرے دو مہتمم مقرر ہوئے (حاجی فضل حق دیوبندی اور مولانا محمد منیر نانوتوی) مگر ایک ایک سال سے زیادہ اہتمام نہ کرسکے، ہر سال کے تغیرات کی وجہ سے دارالعلوم کے نظام میں اختلال پیدا ہونے لگا تو ۱۳۱۳ھ ۱۸۹۵ء میں حضرت گنگوہیؒ نے اہتمام کے لئے حضرت حافظ صاحبؒ کا انتخاب فرمایا، حافظ صاحب نہایت منتظم اور صاحب اثر ووجاہت تھے، چنانچہ وہ بہت جلد دارالعلوم کے انتظام پر قابو یافتہ ہوگئے، اور تقرر کے وقت اُن سے جو توقعات قائم کی گئی تھیں بدرجۂ اتم اُن کے اہل ثابت ہوئے، حضرت شیخ الہندؒ جو صدرالمدرسین تھے خود اُستاد ہونے کے باوجود حافظ صاحبؒ کے اُستاذزادہ ہونے کی حیثیت کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

حافظ صاحبؒ کے زمانۂ اہتمام میں دارالعلوم نے غیر معمولی ترقی کی، جب اُنھوں نے عنانِ اہتمام اپنے ہاتھ میں لی تھی تو دارالعلوم کی آمدنی کا اوسط ۵ - ۶ ہزار روپیہ سالانہ تھا، آپ کے عہد میں یہ اوسط ۹۰ ہزار تک ترقی کر گیا، اسی طرح طلباء کا اوسط دو ڈھائی سو سے ترقی کرکے تقریباً نوسو تک پہنچ گیا، اس وقت کتب خانے میں ۵ ہزار کتابیں تھیں، آپ کے زمانے میں کتابوں کی تعداد ۴۰ ہزار تک پہنچ گئی، ۱۳۱۳ھ ۱۸۹۵ء تک عمارات دارالعلوم کی مالیت ۳۶ ہزار روپے تھی، آپ کے عہد میں یہ مالیت ۴ لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔

غرض کہ آپ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم نے معنوی اور صوری دونوں حیثیتوں سے نہایت عظیم الشان ترقی کی جو اس سے پہلے اس کو حاصل نہ ہوسکی تھی؛ آپ کے زمانۂ اہتمام

سے پہلے شعبہ جات اور دفاتر کا کوئی صاف ستھرا اور باقاعدہ نظام نہ تھا اور گو دارالعلوم معنوی حیثیت سے "دارالعلوم" بن چکا تھا مگر اپنی عمارتوں اور ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے آپ ہی کے زمانۂ اہتمام میں مدرسے دارالعلوم بنا، شعبہ جات اور دفاتر کی تشکیل عمل میں آئی، حلقۂ اثر میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا، غرض کہ ہر حیثیت سے دارالعلوم کا قدم روزافزوں ترقی کی جانب گامزن رہا، چنانچہ آپ کا دورِ اہتمام دارالعلوم کی تاریخ میں اس کی ترقیوں کا نہایت تابناک اور زرّیں دور سمجھا جاتا ہے۔

دارالحدیث کی عظیم الشان عمارت جو اپنی نوعیت کی ہندوستان بھر میں پہلی عمارت ہے آپ ہی کے عہد میں تیار ہوئی، جدید دارالاقامہ کا آغاز اور مسجد و کتب خانہ کی تعمیر بھی حافظ صاحب کے زمانے کی یادگاریں ہیں، ۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء کے اس عظیم الشان جلسۂ دستاربندی کی یاد اب تک لوگوں کے قلوب میں تازہ ہے، جس میں ایک ہزار سے زائد فضلاء کی دستاربندی ہوئی تھی۔

دارالعلوم کی ترقی کے سلسلے میں حافظ صاحبؒ نے ملک کے مختلف شہروں کے سفر کرکے دارالعلوم کے لئے بہت سے دوامی چندے مقرر کرائے خصوصاً سابق ریاست بھوپال، بھاولپور اور حیدرآباد کے سفر، دارالعلوم کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے، حیدرآباد سے دارالعلوم کی امداد سو روپے ماہانہ مقرر تھی، حافظ صاحبؒ حیدرآباد تشریف لے گئے، اور اپنے اثرات سے ڈھائی سو روپے مقرر کرائے، دوسرے سفر میں پانچ سو اور تیسرے میں ایک ہزار ماہانہ تک نوبت پہنچ گئی جو سقوطِ ریاست حیدرآباد تک جاری رہی۔

برطانوی گورنمنٹ کی جانب سے آپ کو "شمس العلماء" کا خطاب دیا گیا تھا، مگر آپ نے دارالعلوم کے حرّیت پسندانہ مسلک کی بناء پر حکومت کا خطاب یافتہ ہونا پسند نہیں کیا، چنانچہ خطاب واپس کردیا، یہ بھی آپ ہی کے زمانے کی خصوصیت ہے کہ دو مرتبہ صوبہ متحدہ کے گورنر دارالعلوم میں آئے، دارالحدیث کی مجوّزہ جگہ پر شہر کا پانی کا گندہ نالہ بہتا تھا،

اس کے سبب سے دارالحدیث کی تعمیر میں رکاوٹ پڑی ہوئی تھی، نیز گندے نالے کے قرب کے باعث دارالعلوم کی آب و ہوا بھی خراب رہتی تھی، اکابرِ دارالعلوم کی پیہم کوششوں کے باوجود مقامی حکام نالے کے ہٹائے جانے پر آمادہ نہ تھے، حضرت حافظ صاحبؒ نے گورنر کو دعوت دے کر اس مشکل کا حل نکال لیا، چنانچہ صوبائی گورنمنٹ کے حکم سے سرکاری مصارف پر گندہ نالہ ہٹا دیا گیا، حافظ صاحبؒ کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ دارالعلوم کی مشکل سے مشکل مہم کو آسانی سے سُلجھا دیتے تھے۔

طلبار کی چھوٹی چھوٹی جزئیات پر جہاں ہر وقت نظر رہتی تھی، اور اُن پر روک ٹوک اور ڈانٹ ڈپٹ رکھتے، وہیں اُن پر بے حد شفیق اور مہربان بھی تھے، طلبار کی معمولی معمولی ضرورتوں پر مربیانہ نظر رہتی تھی، بیمار طلبار کے علاج پر خاص توجہ فرماتے تھے، طلبار اور مدرسین پر حافظ صاحبؒ کا رُعب وداب ضرب المثل تھا، دسترخوان نہایت وسیع تھا، دارالعلوم کے مہمانوں کا بار بذاتِ خود نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ برداشت کرتے تھے۔

شروع سے درس وتدریس کا جو مشغلہ قائم ہوگیا تھا وہ زمانۂ اہتمام میں بھی کبھی بند نہیں ہوا، مشکوٰۃ المصابیح، جلالین شریف، صحیح مسلم، ابنِ ماجہ، مختصر المعانی، رسالہ میر زاہد وغیرہ کتابیں نہایت شوق سے پڑھاتے تھے، تقریر نہایت صاف ومربوط اور سُلجھی ہوئی ہوتی تھی، اپنے والد ماجد کے خاص علوم اور مضامین پر کافی عبور تھا۔

نظام دکن نے حافظ صاحبؒ کو ریاست حیدرآباد میں مفتیٔ اعظم کے عہدے پر مقرر فرمایا تھا، حکومت آصفیہ کے اس سب سے بڑے دینی منصب پر آپ ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۲ء سے ۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۵ء تک فائز رہے، حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں آپ نے نظام حیدرآباد کو دارالعلوم میں آنے کی دعوت دی تھی، جو منظور کر لی گئی تھی، پروگرام یہ تھا کہ نظام جب دہلی جائیں گے تو دارالعلوم کو بھی دیکھیں گے، ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۸ء میں نظام کے دہلی آنے کی توقع تھی، وعدے کی یاد دہانی کے لئے آپ حیدرآباد تشریف لے گئے جس وقت آپ حیدرآباد کا قصد فرما رہے تھے تو طبیعت ناساز تھی

ضعفِ پیری اور مسلسل علالت نے بہت کمزور کر دیا تھا مگر دارالعلوم کے مفاد کے لئے اپنی صحت کی پروانہ کرتے ہوئے حیدر آباد روانہ ہو گئے، وہاں پہنچ کر طبیعت زیادہ خراب ہو گئی پہلے تو انتظار رہا کہ طبیعت سنبھلے تو نظام سے ملاقات کی جائے مگر جب مرض دن بدن بڑھتا ہوا معلوم ہوا تو متوسلین اور رفقاءِ سفر کی رائے قرار پائی کہ دیوبند واپس لے جایا جائے چنانچہ واپسی کے قصد سے آپ حیدر آباد سے روانہ ہو گئے۔ مگر ابھی ٹرین حیدر آباد کی حدود میں ہی تھی کہ نظام آباد اسٹیشن پر حافظ صاحب جان۔ جانِ آفریں کے سپرد کر کے من مات فی السفر فھو شھید میں داخل ہو گئے، یہ ۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ ۱۹۲۸ء کا واقعہ ہے۔ وفات سے قبل زبان پر ذکر اللہ جاری تھا ۲۹ کے عدد پر عقدِ انامل تھا کہ اللہ کے لفظ کے ساتھ روح پرواز کر گئی۔

نظام آباد اسٹیشن پر نعش اُتار کر جنازہ تیار کیا گیا، متعلقین اور نظام دکن کو تار کے ذریعے اطلاع دی گئی، نظام کا جواب آیا کہ حافظ صاحب کا جنازہ حیدر آباد لایا جائے۔ نظام آباد اور حیدر آباد میں متعدد مرتبہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی، اگلے دن ۴ جمادی الاولیٰ کو سرکاری مصارف پر ایک مخصوص قبرستان میں جو "خطّہٴ صالحین" کے نام سے موسوم ہے ان کو سپرد خاک کیا گیا، نظام دکن نے تعزیت کرتے ہوئے نہایت تاسف کے ساتھ یہ پُراثر جملہ فرمایا:۔

"افسوس وہ مجھے لینے آئے تھے مگر خود یہیں رہ گئے"۔

حافظ صاحبؒ نے اسلام اور مسلمانوں کی دارالعلوم کے ذریعے جو گراں قدر خدمات انجام دیں اُن کے پیشِ نظر اُن کی وفات کو دارالعلوم اور مسلمانوں کا زبردست نقصان تصور کیا گیا اور ہندوستان کے طول و عرض میں دیوبندی اور غیر دیوبندی جماعتوں میں بے شمار تعزیتی جلسے اور ایصالِ ثواب کے اجتماعات کئے گئے۔

حافظ صاحبؒ نے ۵۴ سال دارالعلوم کی خدمات انجام دیں، ابتدائی ۱۰ سال تعلیم و تدریس میں گزرے اور ۳۵ سال اہتمام کے فرائض انجام دیئے۔

مولانا حبیب الرحمٰنؒ آپ حضرت مولانا فضل الرحمٰنؒ کے خلفِ رشید تھے، شروع سے آخر تک دارالعلوم میں علوم کی تکمیل کی، آپ ایک متبحّر عالم اور عربی زبان کے زبردست ادیب تھے، اُن کا تدبّر اور انتظام دارالعلوم کی تاریخ میں ضرب المثل سمجھا جاتا ہے، دارالعلوم کی ترقی میں اُن کی خدمات اور خداداد صلاحیتوں کو بڑا دخل حاصل ہے۔

۱۳۲۵ھ ۱۹۰۷ء میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب کی مصروفیتوں کے باعث نیز دارالعلوم کو ترقی دینے کے سلسلے میں ایک ایسے لائق اور منتظم شخص کی ضرورت پیش آئی جو انتظامی امور اور ترقی کی تجاویز میں حافظ صاحب کا ہاتھ بٹا سکے، اس کے لئے آپ سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا، چنانچہ انکار کے باوجود آپ کو مجبور کر کے نیابتِ اہتمام کا منصب سپرد کر دیا گیا، کہا جاتا ہے کہ دارالعلوم کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اس کو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ جیسا کام کرنے والا بیدار مغز منتظم اور مخلص ہاتھ آگیا، اہتمام کے کاموں میں اُن کو اس قدر شغف تھا کہ شب و روز کا بیشتر حصہ اسی میں صرف ہوتا تھا، اُنھوں نے دارالعلوم کے شعبۂ انتظام و انصرام کو اتنا منظم اور مستحکم کر دیا تھا کہ جب حکومتِ آصفیہ کی جانب سے نواب صدر یار جنگ بہادر دارالعلوم کے حسابات کی تنقیح کے لئے دیوبند آئے، تو اُن کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایک ایک اور دو دو آنے تک کے حسابات کے کاغذات اور رسیدیں باضابطہ طور پر فائل میں موجود تھیں، نواب صدر یار جنگ بہادر کا بیان ہے کہ کوئی کاغذ ایسا نہ تھا جو مانگا گیا ہو اور فوراً پیش نہ کر دیا گیا ہو، حافظ صاحب کے عہدِ اہتمام کی ترقی درحقیقت آپ ہی کی رفاقت کا نتیجہ سمجھی جاتی ہے آپ ہمیشہ اُن کے دست راست معتمد علیہ اور نائب رہے۔

۱۳۴۴ھ ۱۹۲۵ء میں جب حافظ صاحبؒ اپنی پیرانہ سالی کے باعث حیدر آباد کے مفتیٔ اعظم کے منصب سے سبکدوش ہوئے تو اُن کی جگہ پر آپ کا تقرر عمل میں آیا لیکن دارالعلوم

میں داخلی اختلافات رُونما ہو جانے کے سبب سے آپ کو بہت جلد اس منصب سے دست کش ہو جانا پڑا، حضرت شاہ صاحبؒ، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور دوسرے چند اساتذہ اور طلباء کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ دارالعلوم سے علیحدہ ہو گئے تھے یہ بڑا نازک موقع تھا مگر آپ کے عزم واستقلال، ہمت وجرأت اور دانش وتدبر نے دارالعلوم کی کشتی کو ڈگمگانے سے بچالیا۔

مولانا حبیب الرحمٰن، جن کی شخصیت ہر حیثیت سے یگانۂ روزگار تسلیم کی جاتی تھی عام خیال ہے کہ اگر آپ کو ملکی سیاست میں بھی اتنا ہی شغف ہوتا جیسا کہ دارالعلوم کے ساتھ تھا تو آپ ہندوستان کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر ثابت ہوتے، حضرت شیخ الہندؒ کی وصیت تھی کہ ارکان جمعیۃ العلماء کو دو آدمیوں کو کبھی نہیں چھوڑنا چاہیئے، ان میں پہلا نام آپ ہی کا تھا، چنانچہ آپ جمعیۃ العلماء کے بہترین مشیر ثابت ہوئے، ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء میں جمعیۃ العلماء کا اجلاس گیا (صوبہ بہار) میں ہوا تھا اُس میں آپ کو صدر منتخب کیا گیا، آپ کا خطبۂ صدارت نہ صرف عام طور پر پسند کیا گیا بلکہ اُس کی سیاسی اہمیت کو ملک کے سیاسی حلقوں میں بھی پسندیدگی سے دیکھا گیا۔

مطالعے کی کثرت نے آپ کو نہایت وسیع المعلومات بنا دیا تھا، حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے:۔

"اگر مجھ پر کسی کے علم کا اثر پڑتا ہے تو وہ مولانا حبیب الرحمٰن ہیں۔"

عربی ادب اور تاریخ سے خاص ذوق تھا اور ان علوم میں اُن کی وسیع النظری مشہور زمانہ تھی، مندرجہ ذیل تصانیف علمی یادگار ہیں:۔

(۱) قصیدہ لامیۃ المعجزات یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں تقریباً تین سو اشعار پر مشتمل ہے، جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سو معجزے نہایت فصیح و بلیغ انداز میں پیش کئے گئے ہیں، مولانا محمد اعزاز علی صاحب امروہیؒ (وفات ۱۳۷۴ھ)

نے عربی اشعار کی سلیس اُردو میں شرح فرمادی ہے۔

(۲) "اشاعتِ اسلام" دنیا میں اسلام کیوں کر پھیلا؟ اس سوال کے جواب میں تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ان تاریخی واقعات کو پیش کیا گیا ہے جو اپنی نفسیاتی کشش کے اعتبار سے اشاعتِ اسلام کا باعث ہوئے۔

(۳) "تعلیماتِ اسلام" اس کتاب میں اسلام کے طرز حکومت کو بیان کیا گیا ہے، اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ مشورہ امیرِ جماعت کے لئے کس قدر ضروری ہے۔ اس ضمن میں آپ نے بتلایا ہے کہ امیر کی ذات پر اگر کُلّی اعتماد ہو تو اکثریت و اقلیت کی رائے شماری کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر امیر کو یہ اعتماد حاصل نہ ہو تو پھر کام چلانے کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اکثریت کا اعتبار کیا جائے۔

(۴) "رحمۃ للعالمین" یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت پر ایک نہایت گراں قدر تصنیف ہے، افسوس ہے کہ یہ ناتمام ہے، مگر جس قدر حصہ لکھا جاچکا ہے وہ سیرت نبویؐ کی تصانیف کی فہرست میں ایک عظیم الشان تصنیف کا اضافہ کرتا ہے، یہ کتاب ابھی تک طبع ہو کر منظر عام پر نہیں آسکی۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ نہایت نحیف الجثہ تھے، خوراک حیرت انگیز طور پر کم تھی، مگر ضعف اور کمزوری کے باوجود بے پناہ ہمت کے مالک تھے، حضرت حافظ صاحبؒ کے انتقال کے ٹھیک چودہ ماہ کے بعد ۴ رجب ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء کی شب میں اس جہانِ فانی سے رحلت فرمائی اور ہمیشہ کے لئے دارالعلوم کو اپنا مدّاح چھوڑ گئے۔ نوراللہ مرقدہٗ!

مولانا قاری محمد طیّب صاحبؒ

حضرت نانوتویؒ کے پوتے ہیں، ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے، تاریخی نام مظفرالدین ہے، ۷ سال کی عمر میں دارالعلوم میں داخل کیا گیا، ممتاز بزرگوں کے عظیم الشان اجتماع میں مکتب نشینی کی تقریب عمل آئی، دو سال کی قلیل ترین مدت میں قرآن مجید قرأت و تجوید کے ساتھ حفظ کیا، پانچ سال

فارسی اور ریاضی کے درجات میں تعلیم حاصل کر کے عربی کا نصاب شروع کیا جس سے ۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۸ء میں فراغت اور سندِ فضیلت حاصل کی، دورانِ تعلیم میں آپ کی آبائی نسبت کے سبب سے اساتذہ نے اعلیٰ پیمانے اور مخصوص طریق پر تعلیم و تربیت میں حصہ لیا۔ حدیث کی خصوصی سند آپ کو وقت کے مشاہیر علماء و اساتذہ سے حاصل ہوئی، علامۃ العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ علم حدیث میں آپ کے خاص استاذ ہیں ۱۳۵۰ھ / ۱۹۳۱ء میں حضرت تھانویؒ سے خلافت حاصل ہوئی۔

علوم کی تکمیل کے بعد آپ نے دارالعلوم میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، ذاتی علم و فضل، ذہانت و ذکاوت اور آبائی نسبت و وجاہت کے باعث بہت جلد طلباء کے حلقے میں آپ کے ساتھ گرویدگی پیدا ہوگئی اوائل ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۴ء میں نائب مہتمم کے منصب پر آپ کا تقرر کیا گیا۔ جس پر اوائل ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۸ء تک آپ اپنے والد ماجد اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کی زیرِ نگرانی ادارۂ اہتمام کے انتظامی معاملات میں حصہ لیتے رہے، وسط ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے انتقال کے بعد آپ کو مہتمم بنایا گیا، سابقہ تجربۂ اہلیتِ کار اور آبائی نسبت کے پیشِ نظر یہ ثابت ہو چکا تھا کہ آپ کی ذات میں اہتمام دارالعلوم کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے، چنانچہ مہتمم ہونے کے بعد آپ کو اپنے علم و فضل اور خاندانی وجاہت واثر کی بنا پر ملک میں بہت جلد مقبولیت اور عظمت حاصل ہوگئی، جس سے دارالعلوم کی عظمت و شہرت کو کافی فوائد حاصل ہوئے، چنانچہ دارالعلوم نے آپ کے زمانۂ اہتمام میں نمایاں ترقی حاصل کی ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء میں جب آپ نے انتظام دارالعلوم کی باگ ڈور ہاتھ میں لی تو اس کے انتظامی شعبے آٹھ تھے جن کی تعداد اب ۳۲ تک پہنچ چکی ہے، اُس وقت دارالعلوم کی سالانہ آمدنی کا بجٹ ۵۰,۲۶۲ روپیہ سالانہ تھا، آپ کے زمانے میں ۲۶ لاکھ تک پہنچ گیا، ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء میں ملازمین دارالعلوم کے عملے میں ۴۵ افراد تھے، اور اب اُن کی تعداد دو سو تک پہنچ چکی ہے۔ اُس وقت اساتذہ کی تعداد ۱۸ تھی اور اب ۵۹ ہے، طلباء کی تعداد ۴۸۰ تھی اور اب دو ہزار

کے قریب ہے۔ اسی طرح عمارتوں میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے، دارالتفسیر، دارالافتاء، دارالقرآن مطبخ جدید، فوقانی دارالحدیث، بالائی مسجد، باب الظاہر، جامعہ طبیہ جدید دو منزلہ دارالاقامہ مہمان خانہ کی عظیم الشان عمارت، کتب خانے کے وسیع وعریض ہال، دارالاقامہ جدید، افریقی منزل، مطبخ کے قریب تین درسگاہوں کا اضافہ حضرت ممدوح ہی کے دورِ اہتمام کی تعمیرات ہیں نیز حضرت نانوتویؒ مسجدِ چھتہ کے جس کمرے میں درس وتدریس اور تلقین فرماتے تھے وہ عمارت امتدادِ زمانہ سے بوسیدہ ہوگئی تھی اس لئے دوبارہ اس کی تعمیر کی گئی۔

غرض کہ دارالعلوم کے ہر شعبے نے آپ کے دورِ اہتمام میں نمایاں ترقی کی ہے، دارالعلوم کی مجالسِ انتظامیہ وشوریٰ نے مختلف اوقات میں آپ کی غیر معمولی خدمات کے اعتراف اور اظہارِ قدر دانی کے سلسلے میں متعدد مرتبہ تجاویز پاس کی ہیں، دارالعلوم کی شمع کو روشن رکھنے کے لئے اس پیرانہ سالی میں بھی جوانوں کی طرح سرگرمِ عمل ہیں۔

علمی سلسلے میں درس وتدریس کے علاوہ فنِ خطابت وتقریر میں آپ کو خداداد ملکہ اور قوتِ گویائی حاصل ہے اور زمانہ طالب علمی ہی سے آپ کی تقریریں پبلک جلسوں میں شوق کے ساتھ سنی جاتی ہیں، اہم سے اہم مسائل پر دو دو تین تین گھنٹے مسلسل تقریر کرنے میں آپ کو کوئی رکاوٹ اور تکلف نہیں ہوتا، حقائق اور اسرارِ شریعت کے بیان اور ایجازِ مضامین میں آپ کو خاص قدرت حاصل ہے، جدید تعلیم یافتہ طبقہ آپ کے علمی اور حکیمانہ اسلوبِ بیان سے خاص طور پر محظوظ ہوتا ہے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دوسری یونیورسٹیوں میں آپ کی تقریریں خاص طور پر مقبول ہیں اور بعض معرکۃ الآراء تقریریں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع بھی ہوچکی ہیں، ملک کا کوئی خطہ ایسا نہیں جس میں آپ کی تقریروں کی گونج نہ پہنچی ہو، ان کی رواں دواں اور دلکش تقریر جب علم کے گہرے سمندر سے گزرتی ہے تو لہروں کا سکوت قابلِ دید ہوتا ہے۔

جمعیۃ العلماء کے سالانہ اجلاسوں میں آپ کے خطباتِ صدارت بڑی قدر کی نگاہوں

سے دیکھے گئے ہیں، آپ کی علمی تقریروں سے ایک خاص حلقۂ اثر پیدا ہوگیا ہے، بیرونِ ہند میں بھی آپ کی خطابت کے اثرات وہاں کے علمی حلقوں میں پہنچ چکے ہیں ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء میں بسلسلۂ سفر حجاز آپ نے ہندوستان کے ایک موقر وفد کے صدر کی حیثیت سے سلطان ابنِ سعود کے دربار میں جو تقریر فرمائی اس نے سلطان کو بہت متأثر کیا، سلطان ابنِ سعود نے شاہی خلعت اور بیش قیمت کتب کے عطیئے سے اعزاز بخشا۔

۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء میں آپ کا سفرِ افغانستان علمی خدمات کی ایک مستقل تاریخ ہے۔ آپ نے دارالعلوم کے نمائندے کی حیثیت سے دارالعلوم اور حکومتِ افغانستان کے درمیان علمی و عرفانی روابط قائم کرنے کے لئے یہ سفر اختیار فرمایا تھا۔ افغانستان کے علمی حلقوں نے شایانِ شان آپ کا خیر مقدم کیا، حکومت نے اپنی میزبانی کے شرف سے نوازا، افغانستان کی علمی و ادبی، سرکاری اور غیر سرکاری انجمنوں اور سوسائٹیوں نے مدعو کیا آپ کی عالمانہ تقریروں سے وہاں کے علمی اور ادبی حلقے بہت متأثر ہوئے، اسی طرح بیرونی ممالک میں برما، جنوبی افریقہ، زنجبار، کینیا، روڈیشیا، ری یونین، مڈغاسکر، حبش (اتھوپیا) مصر، انگلینڈ، فرانس اور جرمنی وغیرہ ممالک کا دورہ فرما چکے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کی دل کش شخصیت کے بے شمار حسین پہلو ہیں، شرافت و انسانیت سراپا انکسار، پاک باطنی، علم و فضل خطابت و تقریر اور وعظ و تلقین سادگی اور عجز و انکسار، دمِ گفتگو حکیمانہ فصاحت و بلاغت، غرض کہ ان کی پُر عظمت شخصیت اعمال و کردار اور جلال و جمال کا ایک حسین امتزاج ہے۔

دارالعلوم کے انتظامی اُمور کے علاوہ جن چیزوں سے آپ کو طبعی دلچسپی ہے وہ تعلیم و تدریس اور دعوت و تبلیغ ہیں ان کمالات کی وجہ سے ملک میں آپ کو امتیازی مقام حاصل ہے، تفریحی ذوق مطالعۂ کتب اور تصنیف و تالیف ہے، آپ کا یہ مشغلہ دارالعلوم کے انتظامی معاملات اور اوقاتِ درس و تدریس کے علاوہ ہمیشہ جاری رہتا ہے، بالخصوص دورانِ

سفر کے فارغ اوقات اسی میں صرف ہوتے ہیں، زمانۂ قیام میں عصر سے مغرب تک مردانے میں مجمع رہتا ہے، جس کا موضوع عموماً علمی مذاکرے ہوتے ہیں، شاعری سے بھی مناسبت ہے متعدد نظمیں شائع ہوچکی ہیں، مجموعۂ کلام عرفانِ عارف کے نام سے چھپ گیا ہے۔

خطابت وتقریر کی طرح تحریر وتصنیف پر بھی قدرت حاصل ہے آپ کی تصانیف کی تعداد کافی ہے، چند کتابوں کے نام درجِ ذیل ہیں:-

التشبہ فی الاسلام، مشاہیرِ اُمّت، کلماتِ طیّبات، الطیب الثمر فی مسئلۃ القضاء والقدر، سائنس اور اسلام، تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام، مسئلہ زبانِ اُردو ہندوستان میں دین وسیاست، اسباب عروج وزوالِ اقوام، اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام، الاجتہاد والتقلید، اُصول دعوتِ اسلام، اسلامی مساوات، تفسیر سورۂ فیل، فطری حکومت وغیرہ

علّامہ شبّیر احمد عثمانی رحؒ [1]

حضرت مولانا فضل الرحمٰن کے فرزندِ رشید تھے، ۱۰ محرم ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۶ء میں بمقام بجنور پیدا ہوئے، ۷ سال کی عمر میں قرآن مجید شروع کیا، دار العلوم میں داخلے کی تاریخ ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۱۹ھ ہے، ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء میں تکمیل کی، حضرت شیخ الہندؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور اُنھیں سے بیعت تھے، فراغت کے بعد دہلی کے مدرسہ فتح پوری میں صدر مدرس مقرر ہوئے، وہاں سے ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں اُنکو دار العلوم میں بلا لیا گیا، یہاں عرصے تک درجۂ علیا کی مختلف کتابیں پڑھائیں، مولانا عثمانیؒ کے درس صحیح مسلم کو بڑی شہرت حاصل تھی، حضرت نانوتویؒ کے علوم پر اُن کی خاص نظر تھی، ایک عرصے تک دار العلوم میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۸ء میں دار العلوم سے

---

[1] حضرت مولانا عثمانیؒ کا دورِ صدارتِ اہتمام ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء سے شروع ہو کر ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء میں ختم ہوگیا اس پورے زمانے میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب بدستور مہتمم رہے اور بحمد اللہ آج بھی ممدوح اس منصب پر فائز ہیں۔

بعض اختلافات کے سبب سے حضرت مولانا محمد انور شاہؒ اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ وغیرہ حضرات کے ساتھ جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) تشریف لے گئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء میں جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث مقرر ہوئے، ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء میں حضرت تھانویؒ اور بعض دوسرے اکابر کے ارشاد پر دارالعلوم میں تشریف لائے، اور ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۴ء تک بحیثیت صدر مہتمم دارالعلوم کی خدمات انجام دیتے رہے، اس دوران میں جامعۂ ڈابھیل سے بھی تعلق قائم رہا۔

اس موقع پر علامہ عثمانیؒ کی وہ تقریر پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا جو آپ نے دارالعلوم کی زمامِ اہتمام سنبھالنے کے وقت فرمائی تھی، آپ نے اپنی تقریر میں ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۸ء میں دارالعلوم سے علیحدگی کے اسباب کی بڑے لطیف انداز میں توجیہ فرمائی، چونکہ اس تقریر سے سابقہ تلخی کی بڑی عمدگی کے ساتھ تلافی ہوجاتی ہے اس لئے اُن کی تقریر کے ضروری حصے یہاں درج کئے جاتے ہیں، حضرت علامہ عثمانی نے بڑے فصیح و بلیغ انداز میں فرمایا تھا کہ :-

"یہ دارالعلوم ہم سب کا مُربّی ہے، ہم سب یہیں پیدا ہوئے، یہیں کھیلے یہیں کودے یہیں پڑھا یہیں لکھا، یہیں پڑھایا اور جو کچھ بھی ہمیں آیا اسی سرچشمۂ علم و معرفت کا طفیل ہے، ہمارا یہ دارالعلوم بلاشبہ علم کا ایک عظیم الشان سمندر اور حقیقت و معرفت کا ایک دریائے ناپیدا کنار ہے، اس کا فیض نہ صرف ہندوستان ہی میں جاری ہے بلکہ "قال اللہ و قال الرسول" کی جہاں بھی آج آواز سُنی جاتی ہے، وہ اسی کا پرتو ہے، جس طرح مئی جون کے مہینے میں آفتاب کی حرارت سے سمندر گرم ہوجاتا ہے، اور اس کے جگر میں گرمی پیدا ہوجاتی ہے، پھر بخارات کو ہوا سمندر سے اُٹھا کر بصورتِ ابر زمین پر پھیلا دیتی ہے، اور یہ چھوٹے بڑے بادل کے ٹکڑے خلیج بنگال یا بحیرۂ عرب سے اُٹھ کر دور دراز علاقوں میں برس پڑتے ہیں جن سے مُردہ زمین زندہ ہوجاتی ہے اور مُردہ کھیتیاں لہلہا اُٹھتی ہیں۔

مگر جب سمندر میں گرمی پیدا ہو کر تموّج اور تلاطم ہوتا ہے تو کچھ جزئی نقصانات بھی ہوجایا کرتے ہیں، چنانچہ ایسے حالات میں جان و مال کا بسا اوقات نقصان ہو جاتا ہے، کبھی بڑے بڑے جہاز خطرے میں آجاتے ہیں اُن میں سے کوئی غرق بھی ہو جاتا ہے اور جب وہ ابخرے بادل کی شکل میں تبدیل ہو کر زمین پر پھیلتے ہیں تو کبھی اُن میں گرج اور کڑک بھی پیدا ہوجاتی ہے جس سے لوگ دہشت زدہ ہو جاتے ہیں، کسی پر بجلی بھی گر پڑتی ہے، لیکن ان سب نقصانات کے باوجود جن کی نظر خدا کی حکمتِ بالغہ پر ہوتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ان نقصانات ہی میں سے کوئی نفع کلّی بھی ضرور ظاہر ہونے والا ہے اور گو یہ نقصانات مخلوق کے لئے تکلیف دہ ہیں اور سمندر کا یہ جوش اور تلاطم گو انسان کو اضطراب میں ڈالنے والا ہے، مگر انہی میں سے کوئی عظیم الشان فائدہ اور مخلوق کے لئے زندگی کا سامان بھی پیدا ہونے والا ہے، غرض اس تمام سلسلے کا انجام یہ ہوتا ہے کہ جب بارش برس لیتی ہے اور ارضِ میت کو جس قدر پانی کی ضرورت ہوتی ہے جب وہ اسے مل جاتا ہے تو پھر یہی بارش کا پانی جس میں سے کچھ حصہ زمین کے کام آجاتا ہے اور کچھ مختلف ندیوں اور نالیوں سے ہوتا ہوا آخر پھر اپنے سرچشمۂ اصلی ہی میں آملتا ہے، جہاں سے اُس کی پیداوار ہوئی تھی، اور وہ جدا ہوا تھا۔

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ کارکنانِ قضاء و قدر کے مصالح تکوینی کے موافق پچھلے دنوں دارالعلوم کے اِس علمی سمندر میں بھی ایک قسم کا ہیجان اور اس کے جگر میں گرمی پیدا ہوگئی تھی، جس کی وجہ سے موجیں اُٹھیں اور ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں، اس تلاطم اور تموّج کے زمانے میں نقصانات بھی ہوئے، لیکن اسی سمندر کی چند موجیں اور قطرے ابرِ رحمت بنکر گجرات کی سرزمین پر جا برسے، بھلا ہم جیسے لوگوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، لیکن علامۃ العصر حضرت مولانا سیّد محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے ابرِ رحمت ہونے میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے، ان حضرات کے قدوم کی برکت سے گجرات کا بدعت کدہ آج بحمداللہ قرآن و سنّت کی روشنی سے منور ہے، وہ متعصب لوگ جو دیوبندی علماء

سے مصافحہ کرنے کو گناہِ عظیم خیال کرتے تھے اور اگر کسی نے بھولے سے مصافحہ کرلیا تو اپنے ہاتھوں کو صابن سے دھونا ضروری سمجھتے تھے۔ اور اگر کسی دیوبندی نے وہاں کسی مسجد میں نماز پڑھ لی تو مسجد دھلوائی جاتی تھی، آج بحمد اللہ اس علاقہ میں قرآن و سنّت کی روشنی پھیلنے کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ ہی حضرات اہلِ حق کی جوتیاں سیدھی کرنا اپنا بڑا فخر جانتے ہیں، اور وہاں کی حالت ہی بحمد اللہ بدلی ہوئی ہے۔

ڈابھیل میں جو سالانہ جلسہ ہمارے مدرسہ کا ہوتا ہے اس کے اشتیاق میں ہزاروں آدمی سال بھر سراپا انتظار رہتے ہیں اور انگلیوں پر دن گنتے ہیں کہ کب ڈابھیل کا جلسہ ہوگا اور کب ہمیں شرکت کی سعادت حاصل ہوگی، غرض وہ علم و فضل کے چند چھوٹے بڑے بادل جو اپنے سرچشمۂ اصلی سے جُدا ہو کر گجرات کی سرزمین پر برسے تھے، آخر مختلف زمانوں سے گزرتے ہوئے کچھ اُن میں سے کام آگئے اور کچھ اپنے سرچشمۂ اصلی میں آملے، میرا دارالعلوم میں اس وقت واپس آنا یا دارالعلوم کا مجھے اپنے اندر جذب کرنا وہی صورت رکھتا ہے جو نسبت قطرے کو دریا کے ساتھ ہوتی ہے، پس اگر ایک قطرہ اپنے سرچشمۂ اصلی میں آملا تو اس میں قطرے کا کیا کمال ہے اور اس کی کیا فوقیت ہے۔ خدائے تعالےٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم نقصاناتِ ماسبق کی تلافی کرسکیں اور اپنی تقصیرات کا کوئی تدارک کرسکیں۔

ہماری مثال دارالعلوم میں واپس آنے کی ایسی سمجھو جیسے حدیث شریف میں ایمان کی مثال دی گئی ہے کہ جیسے سانپ جب اپنی بِل میں جاتا ہے تو سکڑ جاتا ہے، اسی طرح ایمان بھی آخر زمانے میں اسی طرح سکڑ کر اپنے حیّز کی طرف لوٹ جائے گا جس طرح سانپ اپنی بِل کی طرف جاتا ہے، دارالعلوم دیوبند ایک امانتِ الٰہی ہے۔ مسلمانوں کی ایک متاعِ عزیز ہے اس کی تعمیر تقوٰی کی اینٹوں سے ہوئی ہے، اس کا سنگِ بنیاد رکھنے والے امراء و اغنیاء نہ تھے بلکہ اس کی بنیاد ڈالنے والے چند مقدس نفوس فقراء و اہل اللہ تھے، اس لئے اس کی حفاظت انہی کے اصول اور نقشِ قدم پر ہونی چاہیئے۔ اور سب ہی کو

بل کراس کی حفاظت کرنی چاہیئے[1]"

علم وفضل، فہم وفراست، تدبّر اور اصابت رائے کے لحاظ سے علامہ عثمانی کا شمار ہندوستان کے چند مخصوص علمار میں ہوتا تھا، وہ زبان وقلم دونوں کے یکساں شہسوار تھے، اُردو کے بلند پایہ ادیب اور بڑی سحر انگیز خطابت کے مالک تھے، فصاحت و بلاغت، عام فہم دلائل پُراثر تشبیہات وانداز بیان اور نکتہ آفرینی کے لحاظ سے اُن کی تحریر و تقریر دونوں منفرد تھیں، وہ حالاتِ حاضرہ پر بڑی گہری نفسیاتی نظر رکھتے تھے، اس لئے اُن کی تحریر و تقریر عوام وخواص دونوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی عظیم الشان جلسوں میں اُن کی فصیح وبلیغ عالمانہ تقریروں کی یاد آج بھی اہلِ ذوق کے دلوں میں موجود ہے حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی حیات کے آخری دنوں میں جامعہ ملّیہ کی تاسیس کے وقت جو خطبہ دیا تھا اُس کے لکھنے اور جلسے میں پڑھنے کا شرف مولانا عثمانیؒ ہی کو حاصل ہوا تھا۔

علم الکلام، العقل والنقل، اعجاز القرآن حجابِ شرعی اور الشہاب لرجم الخاطب المرتاب وغیرہ اُن کی معرکتہ الآرار تصانیف ہیں، حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن مجید پر مولانا عثمانیؒ کے تفسیری حواشی کو بڑی شہرت حاصل ہے، علم حدیث میں ان کی گراں قدر تصنیف فتح الملہم حنفی نقطۂ نظر سے صحیح مسلم کی پہلی شرح ہے، اُن کا یہ ایک ایسا زندہ جاوید کارنامہ ہے جس نے اُن کے علم وفضل کو تمام عالم اسلام میں روشناس کرا دیا ہے۔

سیاسیات میں مولانا عثمانیؒ اولاً جمعیۃ العلمار ہند کیساتھ شریک تھے اس سے قبل وہ خلافت کمیٹی کے ایک اہم رکن رہ چکے تھے ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء میں جنگِ بلقان کے زمانے میں انھوں نے ترکوں کے لئے چندہ جمع کرنے میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا تھا، مولانا عثمانیؒ سالہاسال تک جمعیۃ العلمار ہند کی مجلس عاملہ کے رکن رہے، جمعیۃ العلمار ہند کے صفِ اوّل

---

[1] تقریر مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند ۱۳۵۳ھ ص ۲-۳

کے رہنماؤں میں ان کا شمار ہوتا تھا، آخر میں اُن کو متحدہ قومیت کے مسئلے پر جمعیۃ العلماء ہند سے اختلاف پیش آیا، اور وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے، اور ۱۳۶۵ھ ۱۹۴۶ء میں جمعیۃ العلماء اسلام کے صدر منتخب کئے گئے۔ ۱۹۴۶ء میں جب ہندوستان کی مجلس دستور ساز کا انتخاب ہوا تو آپ بنگال سے مسلم لیگ کی جانب سے اس کے رکن منتخب ہوئے، ہندوستان کی تقسیم کے بعد آپ کو مشرقی بنگال کے نمائندے کی حیثیت سے دستوریہ پاکستان کا رکن منتخب کیا گیا، دستوریہ پاکستان کے اجلاس میں شرکت کے لئے قبل رمضان ۱۳۶۶ھ ۱۹۴۷ء مولانا عثمانیؒ پاکستان تشریف لے گئے اور آخر تک کراچی ہی میں قیام رہا، پاکستان دستور ساز اسمبلی کے ساتھ شرعی دستور ساز کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے، پاکستان میں انھوں نے بہت سی دینی اور ملی خدمات انجام دیں، پاکستان کے اقتدار اعلیٰ پر اُن کی علمی اور سیاسی خدمات کا خاص اثر تھا، خصوصاً اُن کو عالمانہ اور مفکرانہ حیثیت سے خاص عظمت حاصل تھی، اور اُن کی دینی رہنمائی کے ساتھ ساتھ سیاسی رہنمائی بھی مُسلّم سمجھی جاتی تھی۔

پاکستان میں جامعہ عباسیہ بھاول پور ایک قدیم دینی تعلیم گاہ ہے، اس کا انتظامی اور تعلیمی نظام بہت خراب ہوگیا تھا، ریاست بہاول پور کی وزارتِ تعلیم نے مولانا عثمانیؒ سے درخواست کی کہ وہ بھاول پور تشریف لاکر جامعہ عباسیہ کی اصلاح و ترقی کیلئے اپنے مشورے سے ریاست کو نوازیں، چنانچہ آپ بھاول پور تشریف لے گئے وزارتِ تعلیم سے ابھی گفتگو شروع ہی ہوئی تھی کہ اچانک ۲۱ر صفر ۱۳۶۹ھ ۱۹۴۹ء کو چند گھنٹے کی مختصر علالت کے بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہا جنازہ بھاول پور سے کراچی لے جایا گیا، اور قیام گاہ واقع محمد علی روڈ کے قریب آپ کو سپردِ خاک کیا گیا۔

دارالعلوم میں حضرت علامہ عثمانیؒ کی وفات پر تعزیتی جلسے میں حضرت مولانا مدنیؒ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا حضرت مرحوم کی شخصیت بے مثال تھی، علم و فضل میں اُنکا پایہ بلند تھا اور ہندوستان کے چیدہ علماء میں سے تھے، ہم میں سیاسی اختلافات ضرور تھے وہ اپنی جگہ ہیں، تحریر و تقریر کا خداداد ملکہ مولانا مرحوم کا حصّہ تھا۔ اور بہت سی خوبیوں کے حامل تھے۔

دارالعلوم کے مفتیانِ کرام

اوپر گزر چکا ہے کہ دارالعلوم جس زمانے میں قائم ہوا اس وقت ہندوستان کے قدیم دینی مدارس قریب قریب ختم ہو چکے تھے، ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ رستخیز کے بعد علماء کی اچھی خاصی تعداد دارورسن کی نذر ہو گئی تھی، کچھ علماء کو جنگِ آزادی میں شرکت کے جرم میں حبسِ دوام بعبورِ دریائے شور کی سزا دے کر" کالا پانی" بھیج دیا گیا تھا، کچھ حضرات انگریزوں کی دارو گیر سے بچ کر دوسرے ملکوں میں ہجرت کر گئے تھے۔ باقی ماندہ علماء کی پرانی نسل رفتہ رفتہ اُٹھتی جا رہی تھی، ان حالات میں مسئلہ بتانے والے مشکل سے نظر آتے تھے، دارالعلوم دیوبند قائم ہوا تو لوگوں کو اُمید کی کرن نظر آئی، عامۂ مسلمین کا دارالعلوم کے ساتھ ہمیشہ یہ معمول رہا ہے کہ ملک میں جب بھی کوئی مسئلہ پیدا ہوا اور مسلمانوں نے کوئی مشکل محسوس کی تو نظریں خود بخود دارالعلوم کی طرف اُٹھتی رہی ہیں، چنانچہ مسائل دریافت

کرنے والوں کا رجوع ہونے لگا. اس لئے دارالعلوم میں درس و تدریس کے علاوہ افتار کا کام بھی ابتدا ہی سے ہوتا رہا ہے. سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی جو دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین تھے. وہی اس کام کو بھی انجام دیتے رہے. چناں چہ انھوں نے ۱۲۸۳ھ سے اپنی وفات سے قبل یعنی ۱۳۰۱ھ تک اس خدمت کو انجام دیا، انکی وفات کے بعد مختلف اساتذہ سے افتار کا کام لیا جاتا رہا، اور ۱۳۰۹ھ تک اسی طرح کام چلتا رہا، لیکن جب استفتار کی تعداد بڑھ کر غیر معمولی حد تک پہنچ گئی تو ۱۳۱۰ھ میں باقاعدہ دارالعلوم میں دارالافتار قائم کیا گیا، حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمٰن دیوبندی کو مفتی کے منصب پر مامور کیا گیا، دارالافتار شرعی امور میں رہ نمائی کے علاوہ دارالعلوم دیوبند اور عامۂ مسلمین کے درمیان رابطے کا بھی ایک بڑا اور وقیع ذریعہ ہے. دارالعلوم کے فتاویٰ کو ملک اور بیرونِ ملک میں ہمیشہ وقعت و عظمت کی نظر سے دیکھا گیا ہے. عوام کے علاوہ ملک کی عدالتیں بھی ان کا احترام کرتی ہیں، اور انھیں فیصلہ کن سمجھتی ہیں، ۱۳۳۰ھ سے ۱۳۹۶ھ تک دارالافتار سے جو فتاوے جاری ہوئے ان کی مجموعی تعداد ۳۳۶۹۳۴ ہے۔

مولانا مفتی عزیزالرحمٰن رح

سالِ ولادت ۱۲۷۵ھ ہے تاریخی نام "ظفرالدین" رکھا گیا، والد ماجد کا اسم گرامی مولانا فضل الرحمٰن تھا، ۱۲۸۴ھ کے اواخر میں جب دارالعلوم میں درجۂ قرآن شریف جاری کیا گیا تو حضرت مفتی صاحب کو درجۂ حفظ قرآن میں داخل کر دیا گیا، شعبان ۱۲۸۵ھ میں انھوں نے نصف قرآن مجید کے حفظ کا امتحان دیا[1] اور ۱۲۸۶ھ میں پورا قرآن شریف حفظ کر لیا[2] اُس وقت درجۂ قرآن شریف کے استاد حافظ نامدار خاں صاحب تھے، ۱۲۹۵ھ میں انھوں نے

---

[1] روداد دارالعلوم دیوبند ۱۲۸۵ھ ص ۱۴

[2] روداد دارالعلوم دیوبند ۱۲۸۶ھ ص ۱۳

بخاری شریف و مُسلم شریف اور شرح عقائد کا امتحان دے کر دارالعلوم سے فراغت حاصل کی، اُس وقت دارالعلوم کے اساتذہ یہ تھے حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ، حضرت مولانا سیّد احمد دہلویؒ، حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا عبدالعلی رحہم اللہ تعالےٰ. ۱۲۹۸ھ کے جلسۂ دستار بندی میں آپ کو سند و دستار حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے دستِ مُبارک سے عطا ہوئی۔

فراغتِ تعلیم کے بعد کچھ عرصے دارالعلوم میں معین المدرس رہے اور اسی کے ساتھ فتویٰ نویسی کی خدمات بھی حضرت مولانا محمد یعقوبؒ صدر المدرسین کی نگرانی میں انجام دیتے رہے، پھر اُن کو میرٹھ بھیجدیا گیا، وہاں مدرسہ اسلامیہ اندرکوٹ میں کئی سال تک درس و تدریس میں مصروف رہے، ۱۳۰۹ھ میں اکابرِ دارالعلوم نے نائب مہتمم کے عہدے کیلئے اُن کا انتخاب کیا، پھر ایک سال کے بعد اُن کو مفتی و مدرس مقرر کیا گیا، ۱۳۳۳ھ کی روداد میں لکھا ہے:۔

"مولوی عزیز الرحمٰن صاحب نے فراغت کے بعد بطور معین المدرس دارالعلوم میں درس دیا، اور حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کی نگرانی میں افتاء کا کام بھی کیا، اسی زمانے میں اُنکو داعیۂ طریقت پیدا ہوا، خاندانِ نقشبندیہ میں حضرت مولانا رفیع الدّینؒ کے ہاتھ پر بیعت کی چند سال کی ریاضات و مجاہدات کے بعد اجازتِ سلسلہ حاصل ہوئی، چند سال تک میرٹھ کے مدرسہ اسلامیہ واقع اندرکوٹ میں مدرس رہے، اُس زمانے میں آپ کو دوبارہ داعیۂ حج پیدا ہوا، اس سفر میں آپ کا حج کے ساتھ یہ بھی مقصد تھا کہ شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کی خدمت میں قیام فرمائیں، چنانچہ ڈیڑھ سال آپ کا اس سفر میں صرف ہوا، اور حضرت حاجی صاحبؒ نے بھی آپ کو مجاز فرمایا، شوال ۱۳۰۵ھ میں تشریف لے گئے تھے اور صفر ۱۳۰۷ھ میں واپس تشریف لائے، ۱۳۰۹ھ میں آپ کو میرٹھ سے دیوبند بلالیا گیا اس وقت سے برابر دارالعلوم کی خدمت میں مصروف ہیں، آپ اس وقت مفتی مدرسہ ہیں،

لیکن حدیث، تفسیر اور فقہ کے چند سبق بھی آپ سے متعلق رہتے ہیں[1]۔"

حضرت مفتی صاحبؒ بڑے بڑے اہم اور معرکۃ الآرار استفتار کا جواب قلم برداشتہ اور مراجعتِ کتب کے بغیر بلا تکلّف تحریر فرمادیا کرتے تھے، چالیس سال کے قریب آپ نے دارالعلوم کے دارالافتار کی خدماتِ جلیلہ انجام دیں، اس دَور میں بے شمار ایسے مشکل فتاویٰ بھی لکھے جو نہ صرف فتویٰ بلکہ معرکۃ الآرار مُہمّات میں محاکمہ کی حیثیت رکھتے ہیں مگر صرف چند لفظوں میں اُن کا جواب تحریر فرمادیتے تھے۔ سفر میں دارالافتار کی ڈاک ساتھ رہتی تھی، مراجعتِ کتب کے بغیر محض حذاقت و مہارت اور کمالِ استعداد سے بے تکلّف فتاویٰ تحریر فرماتے رہتے تھے، نصوصِ فقہ اکثر و بیشتر حفظ یاد رہتی تھیں، اُن کے فتاویٰ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ عام فہم بھی ہوتے ہیں، اُنکے فتاویٰ کی زبان سہل اور سلیس ہوتی ہے، یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو اُس دَور کے فتاویٰ میں اور کہیں نہیں پائی جاتی۔

فتویٰ نویسی علوم شرعیہ میں بڑا مشکل کام ہے، اس کام میں حالات کے بدلنے سے جس قدر نزاکتیں پیدا ہوجاتی ہیں، ان کو صرف اہلِ علم ہی سمجھ سکتے ہیں، یوں تو فتاویٰ ہر زمانے میں لکھے گئے ہیں، مگر فتویٰ نویسی کا جو کمال حضرت مفتی صاحب کو حاصل تھا، یہ کمال جماعتِ دیوبند میں صرف تین ہی شخصوں کے حصّے میں آیا ہے، ایک مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور دوسرے حضرت مفتی صاحبؒ اور تیسرے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ۔ ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۲۹ھ تک حضرت مفتی صاحب نے جو فتاویٰ تحریر فرمائے ہیں افسوس ہے کہ اُن کا ریکارڈ موجود نہیں ہے، فتویٰ نویسی میں حضرت مفتی صاحبؒ کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ زمانے کے تقاضوں سے کبھی صرفِ نظر نہیں کرتے تھے، اس پر اُن کی نظر بہت

---

[1] روداد دارالعلوم ۱۳۳۳ھ ص ۱۹

گھری پڑتی تھی، اگر کسی مسئلہ کے دو مختلف مفتیٰ بہ پہلو ہیں تو ایسے موقع پر وہ آسان پہلو کو اختیار کرتے اور اُسی پر فتویٰ دیتے تھے، ایسی صورت ہرگز اختیار نہیں کرتے تھے جو عوام کے لئے مشکلات پیدا کرنے والی ہو، اُن کے فتاویٰ میں جا بجا اس کی مثالیں موجود ہیں۔

۱۳۳۰ھ سے ۱۳۴۶ھ تک کے فتاویٰ کی تعداد ۳۷،۵۶۱ ہے، اس میں بھی درمیان کے کچھ سالوں کا ریکارڈ ضائع ہو گیا ہے، مذکورہ بالا تعداد صرف وہ ہے جس کا ریکارڈ محفوظ ہے حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کے ایک سرسری اندازے کے مطابق حضرت مفتی صاحبؒ کے فتاویٰ کی تعداد ایک لاکھ اٹھارہ ہزار کے لگ بھگ ہے[1]، اُن کا یہ زبردست کارنامہ عظیم الشان دینی خدمت ہے، آپ کے فتاویٰ کی یہ خصوصیت بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ آپ کے فتاویٰ ہند و بیرونِ ہند میں مسلمانوں کے معاملات و عبادات و اعتقادات میں فیصلہ کُن سمجھے جاتے تھے،

۱۳۳۰ھ سے ۱۳۴۶ھ تک کے فتاویٰ کو فتاویٰ دار العلوم دیوبند کے عنوان سے فقہی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کراکر دار العلوم کی جانب سے شائع کیا جا رہا ہے، اب تک ۱۰ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، آخری جلد کتاب الطلاق کے مسائل پر مشتمل ہے۔ فتاویٰ کا یہ سلسلہ غالباً ۱۲ جلدوں میں پورا ہوگا، اس کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔

حضرت مفتی صاحب نہ صرف عالم اور مفتی ہی تھے بلکہ عارف باللہ اور صاحبِ باطن اکابرین سے تھے، بیعت و ارشاد کا سلسلہ بھی مستقلاً قائم تھا، اور ہزار ہا بندگانِ خدا اطرافِ ہندوستان میں آپ کی باطنی تلقین و تربیت سے فیضیاب ہو کر مراد کو پہونچے۔

نقشبندیت کے مشہور معمولات میں سے ختم خواجگان ہے، حضرت مفتی صاحبؒ کی مسجد

---

[1] مقدمہ فتاویٰ دار العلوم دیوبند، مرتبہ مولانا ظفیر الدین، جلد اوّل ص ۵۸

میں (جو دیو بند میں چھوٹی مسجد کے نام سے مشہور ہے) پابندی کے ساتھ روزانہ صبح کی نماز کے بعد ہوتا تھا۔

علم و عمل کے ساتھ تواضع و کسر نفسی، اپنے کو چھپانا اور مٹانا آپ کا خاص رنگ تھا، جو چھوٹی چھوٹی جزئیات تک میں نمایاں ہوتا تھا، روزانہ کا معمول تھا کہ بعد نمازِ عصر محلّے کے آس پاس کے گھروں کے دروازوں پر جاکر پوچھتے کہ بازار سے کسی کو کچھ سودا منگانا ہو تو بتلا دے گھروں سے آواز آتی "مفتی جی مجھے چار پیسے کی مرچیں لا دو، کہیں سے آواز آتی کہ تیل چاہئے کسی کے گھر سے کہا جاتا کہ نمک درکار ہے "۔

حضرت مفتی صاحب سب کے پیسے لے لیتے اور بازار جاکر ایک ایک کا فرمائشی سودا خریدتے، کسی کا نمک، کسی کی مرچ، کسی کا دھنیا اور یہ سب سامان رومال کے الگ الگ کونوں میں باندھ کر خود ہی لاتے، یہ کبھی گوارا نہ کرتے کہ اس بوجھ کو کوئی دوسرا بٹوا ئے، خود ہی یہ سامان اپنے کندھوں پر لادتے، بعض اوقات بوجھ سے دہرے ہو جاتے تھے مگر کسی حالت میں گوارا نہ تھا کہ اُسے دوسرے کے حوالے فرماکر کچھ ہلکے ہو جائیں، پھر خود ہی گھر گھر جاکر یہ اشیاء فرمائش کنندوں کے سپرد فرماتے۔ بے نفسی اور خدمتِ خلق کے اس عمل میں ان کو کبھی تصور بھی نہ ہوتا تھا کہ میں کوئی خدمت کر رہا ہوں، یا کوئی بڑا عمل ہے جو میرے ہاتھوں انجام پا رہا ہے، یا میں کسرِ نفسی کا کوئی عظیم کارنامہ انجام دے رہا ہوں۔

ان عملی مجاہدات کے ساتھ درس کی علمی باریک بینیاں مُستزاد تھیں، افتار کے ساتھ درس کا شغل مستقل رہتا تھا، فقہ وحدیث اور تفسیر کے اونچے اسباق آپ کے یہاں ہوتے تھے، بڑی بڑی اہم تحقیقات جو آپ کے ذہنِ رسا کی پیداوار ہوتی تھیں کبھی بھی اپنی طرف منسوب کر کے دعوے کا انداز اختیار نہیں کرتے بلکہ بطور احتمال کے ارشاد فرماتے اور تقریر کے ضمن میں کہتے تھے کہ "اس مسئلے میں ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے" حالاں کہ وہ اُن کی تحقیق ہوتی تھی، مگر کبھی بھی یوں نہیں فرماتے تھے کہ اس مسئلے میں میری رائے اور

تحقیق یہ ہے، غور کیا جائے تو یہ مقام اس علمی خدمت اور عملی بے نفسی کے مقام سے بھی زیادہ بلند اور نازک تر ہے جس تک پہنچنا ہر ایک کا حوصلہ نہیں، علمی دقائق خود اپنا ذہن پیش کرے، اور اس ذہن کو کبھی بھی آگے نہ لایا جائے، بے نفسی اور فنا کا یہ نہایت ہی اونچا مقام ہے اور یہ اُسی کو میسر آسکتا ہے جس کے رگ و پے میں تواضع اور کسر نفسی سما گئی ہو۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ حضرت مفتی صاحبؒ بھی دارالعلوم سے مستعفی ہو گئے تھے، ۱۳۴۷ھ میں حضرت شاہ صاحبؒ علالت کے باعث جب دیوبند تشریف لائے تو بخاری شریف کے چودہ پارہ باقی تھے، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے ذمہ داروں کے اصرار پر حضرت مفتی صاحبؒ وسط ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ میں ڈابھیل تشریف لے گئے اور بخاری شریف کا درس شروع کرا دیا اور صرف ڈیڑھ ماہ کی قلیل ترین مدت میں بخاری شریف کے باقی ماندہ ۱۴ پارے ختم کرا دیئے۔

جمادی الثانی کے اوائل میں آپ دیوبند تشریف لائے راستے میں طبیعت علیل ہو گئی، دیوبند پہنچنے پر علاج شروع ہوا مگر افاقہ نہ ہو سکا وقتِ موعود آچکا تھا، بالآخر ۱۸ جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۸ء کی شب میں داعی اجل کو لبیک کہا، ۱۰ بجے دن میں حضرت مفتی صاحبؒ کے جنازے کی نماز حضرت مولانا سیّد اصغر حسینؒ نے پڑھائی اور ۱۱ بجے آپ دارالعلوم کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے، طاب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ۔

آپ علم و عمل اخلاق و ملکات، معرفت و بصیرت اور فقاہت و درایت کی بے مثل شخصیتوں میں سے ایک بلند پایہ شخصیت تھے جن سے دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کو زینت بخشی گئی

حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ

دارالعلوم دیوبند کے نہایت ممتاز فضلاء میں سے تھے، ۱۳۲۱ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کو مدرسہ نعمانیہ پورنیہ ضلع بھاگلپور (بہار)

کے لئے منتخب فرمایا، چنانچہ آپ تقریباً سات سال اس علاقے میں درس دیتے رہے، پھر آپ شاہ جہاں پور تشریف لائے اور ایک مسجد میں افضل المدارس کے نام سے مدرسہ قائم کیا، جس میں حسبتہً للہ پڑھاتے رہے، یہاں تقریباً تین سال آپ نے نہایت کامیابی کے ساتھ درس دیا، ۱۳۳۰ھ میں آپ کا تقرر دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس ہوا، اور پہلے سال آپ کو عربی کی ابتدائی کتابیں علم الصیغہ اور نورالایضاح وغیرہ پڑھانے کیلئے دی گئیں اُس وقت کی روداد میں حضرت شیخ الادب کی نسبت لکھا ہے:۔

"مولوی اعزاز علی صاحب طبقۂ وُسطیٰ واُخریٰ کے درمیانی فارغ التحصیل حضرات میں سے ہیں، چند جگہ مدرس رہے، آپ ایک نوجوان، بااستعداد اور صاحبِ صلاح و تقویٰ عالم ہیں، صورتاً وسیرتاً اپنے سلف کی یادگار ہیں، علوم میں استعداد تام رکھتے ہیں، خصوصاً علم ادب میں خاص مہارت ہے، ابھی آپ نے حماسہ کا تحشیہ کیا ہے، اور کنزالدقائق کا تحشیہ کر رہے ہیں، اس سے پہلے دیوانِ متنبی کا تحشیہ کرچکے ہیں، آپ دارالعلوم کے درجۂ وسطیٰ میں درس دیتے ہیں، علم ادب کے اکثر اسباق آپ کے پاس رہتے ہیں، طلبار کو عربی تحریر کی مشق بھی کراتے ہیں، خوش تقریر ہیں، طلبار آپ سے نہایت مانوس ہیں"

۱۳۴۰ھ میں جب حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کا ریاست حیدر آباد کے مفتئ اعظم کے عہدے پر انتخاب عمل میں آیا تو اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ کو اپنی معیت میں لے گئے، وہاں ایک سال قیام رہا، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے ساتھ ہی آپ دیوبند تشریف لائے آپ کو مفتئ اعظم حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمٰن صاحبؒ کے بعد صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کے عہدے پر فائز کیا گیا، اس کے بعد سے آخر عمر تک دارالعلوم دیوبند ہی میں آپ کا قیام رہا۔

فقہ وادب آپ کا خاص فن تھا، جس کی مہارت مشہور زمانہ ہے، آپ جب ابتداءً دارالعلوم دیوبند میں تشریف لائے تو عربی کی ابتدائی کتابیں علم الصیغہ اور نورالایضاح وغیرہ آپ کو دی گئیں، مگر آپ کے درس نے بالآخر وہ مقبولیت حاصل کی کہ "شیخ الادب والفقہ" کے لقب سے مشہور ہوئے، عمر کے آخری دور میں کئی سال ترمذی جلد ثانی اور تفسیر کی بلند پایہ کتابیں بھی پڑھائیں، حضرت مولانا مدنیؒ کی عدم موجودگی میں متعدد مرتبہ بخاری شریف کے پڑھانے کا بھی اُن کو اتفاق پیش آیا، غرض کہ علم فقہ، علم حدیث، علم ادب، علم تفسیر وغیرہ ہر فن کی کتابوں پر اُن کو عبور حاصل تھا، تعلیم کے ساتھ طلباء کی تربیت اور نگرانی کا اُن میں خاص ذوق تھا، جس سے طلباء کو بے انتہا فائدہ پہنچا، آج تک آپ کے شاگرد آپ کو یاد کرتے ہیں، آپ کی پابندئ اوقات ضرب المثل تھی، اور اوقاتِ درس کی پابندی میں آپ خود ہی اپنی نظیر تھے، حتیٰ کہ بعض اساتذۂ دارالعلوم نے درس میں اوقات کی پابندی کا سبق حضرت شیخ الادب ہی سے سیکھا ہے۔

مدرسی کے ابتدائی دور سے آخر عمر تک منٹوں اور سکنڈوں تک کی پابندی فرماتے رہے، بے نفسی اور تواضع میں یدِطولیٰ رکھتے تھے، بڑی سے بڑی کتابوں کے درس کے ساتھ چھوٹی سے چھوٹی کتاب پڑھانے میں کبھی آپ کو عار نہ ہوتا تھا، ترمذی و بخاری کا درس بھی دے رہے ہیں، اور بچوں کو میزان الصرف، علم الصیغہ اور نورالایضاح وغیرہ بھی پڑھا رہے ہیں، آپ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب طالب علم وہ ہوتا تھا، جو یکسوئی کے ساتھ پڑھنے لکھنے میں لگا رہے، اور سب سے زیادہ مبغوض وہ ہوتا تھا جو غیر تعلیمی مشاغل میں لگ کر پڑھنے میں تساہل کرے، خواہ وہ خود اُن کی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت شیخ الادبؒ کو جس طرح عربی نظم ونثر پر قدرت حاصل تھی، اسی طرح وہ اُردو نظم ونثر میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے، اُردو نثر میں اُن کا ایک خاص انداز تھا، اُن کا خط اگرچہ پاکیزہ نہ تھا، مگر لکھنے کا ڈھنگ ایسا تھا کہ دیکھنے میں خوشنما معلوم ہوتا تھا،

اُنھوں نے عربی ادب میں نفحۃ الیمن کے معیار کے مطابق نفحۃ العرب کے نام سے ایک کتاب مرتب فرمائی تھی، جس میں تاریخی حکایات و قصص اور اخلاقی مضامین بیان کئے گئے ہیں، یہ کتاب عربی مدارس میں بہت مقبول ہوئی، چنانچہ دارالعلوم اور دوسرے بہت سے مدارس کے نصاب میں داخل کی گئی۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے فقہ میں نورالایضاح، شرح نقایہ کنزالدقائق اور ادب عربی میں دیوانِ حماسہ اور دیوان متنبی پر مفید حواشی تحریر فرمائے ہیں، جو اساتذہ اور طلباء میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

انتظامی امور میں بھی آپ کی قابلیت مسلّم تھی اور وقتاً فوقتاً ادارہ اہتمام میں آپ کی انتظامی صلاحیتوں سے استفادہ کیا جاتا تھا، غرض آپ ایک بے نظیر اُستاذ اور متبحّر عالم دین اور ایک جامع شخصیت تھے۔ دارالعلوم میں آپ کی علمی خدمات کا دَور چوالیس برس تک مُمتد رہا۔

پہلی مرتبہ ۱۳۴۵ھ سے ۱۳۴۸ھ تک اور دوسری مرتبہ ۱۳۶۴ھ سے ۱۳۶۶ھ تک دو مرتبہ آپ کو افتاء کا منصب تفویض کیا گیا، آپ کے عہد صدارتِ افتاء کے دور ان ۸۵۵۴ فتاوی لکھے گئے، ۱۳۷۰ھ میں اس دار فانی سے رحلت فرمائی رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

مفتی ریاض الدّین رح

حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ میں سے تھے، ۱۳۳۰ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی، افضل گڑھ ضلع بجنور کے رہنے والے تھے، حضرت مفتی عزیزالرحمٰن کے مستعفی ہونے کے بعد ۱۳۴۶ھ کے اواخر میں اُن کو دارالافتاء کی خدمات تفویض کی گئیں، جہاں اوائل ۱۳۵۰ھ تک وہ اس منصب پر فائز رہے، کم و بیش دو سال کی اس مدّت میں تقریباً ۷ ہزار استفتاآت کے جوابات دارالافتاء سے دیئے گئے۔ صفر ۱۳۵۰ھ میں اُنھیں شعبۂ تدریس میں منتقل کر دیا گیا، بڑے نیک اور مرنجان مرنج انسان تھے، ۲۲ر ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ کو وفات پائی۔

قبرستان قاسمی میں آسودۂ خواب ہیں۔

مولانا مفتی محمد شفیعؒ ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے، حضرت گنگوہیؒ نے محمد شفیع نام تجویز فرمایا، اصلاً دیوبند کے رہنے والے تھے، دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی، ۱۳۳۶ھ میں ۲۲ سال کی عمر میں فراغت پائی، بعد ازاں ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم میں ابتدائی درجے کے مدرس مقرر ہوئے اور بہت جلد تدریسی ترقی کی منزلیں طے کر کے طبقۂ علیاء کے اساتذہ میں شامل ہو گئے، فقہ اور ادب سے شروع ہی سے مناسبت رہی، ۱۳۵۰ھ / ۱۹۴۴ء میں منصب افتاء پر فائز ہوئے، ۱۳۶۸ھ / ۱۹۴۹ء میں پاکستان چلے گئے، وہاں دستور ساز اسمبلی کے بورڈ آف تعلیمات اسلام کے رکن کی حیثیت سے اسلامی دستور کی ترتیب میں مدد دی، ۱۹۵۱ء میں کراچی میں دارالعلوم کے نام سے ایک دینی مدرسہ قائم کیا، جو اس وقت کراچی میں علوم اسلامیہ کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

مفتی صاحبؒ کا علم وسیع اور گہرا تھا اور تقریباً تمام متداول دینی علوم میں عمدہ صلاحیت کے مالک تھے، اور بہت سی دینی کتابوں کے مصنف ہیں، تفسیر، حدیث، فقہ اور مناظرے میں نہایت مفید تصانیف کا ذخیرہ آپ کے قلم سے نکلا ہے، اُن کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے، آپ کے سیکڑوں شاگرد و تلامذہ برّصغیر کے علاوہ مختلف ممالک میں دینی خدمات انجام دے رہے ہیں، ابتداً حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوئے، حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد حضرت مولانا تھانویؒ سے رجوع کیا، اور خلافت حاصل کی ساری عمر دینی علوم کی تدریس و تصنیف کے ساتھ افاضۂ باطنی میں بھی مصروف رہے، شعر و شاعری کا ذوق بھی تھا، عربی، فارسی اور اُردو میں قصائد، مرثیوں اور متعدد نظموں کا مجموعہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے پاکستان میں اُن کو مفتیٔ اعظم کی حیثیت حاصل تھی۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے اولاً ۱۳۵۰ھ سے ۱۳۵۴ھ تک اور پھر ۱۳۵۹ھ سے ۱۳۶۱ھ تک دو مرتبہ دارالافتاء کے فرائض انجام دیئے، ان کے زمانے میں ۲۶ ہزار

کے قریب فتاویٰ لکھے گئے۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے تفصیلی حالات باب چہارم میں گزر چکے ہیں۔

مولانا محمد سہولؒ پورینی ضلع بھاگلپور (بہار) وطن تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، بھاگلپور میں مولانا اشرف عالمؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے، وہاں سے کان پور پہنچے اور مدرسہ جامع العلوم میں حضرت تھانویؒ اور مولانا محمد اسحٰق صاحب بردوانی سے تعلیم حاصل کی اور مدرسہ فیضِ عام میں رہ کر مولانا محمد فاروق چریاکوٹی سے تحصیل علم کی، کان پور سے طلب علم کا شوق اُن کو حیدر آباد لے گیا، حیدر آباد کا سفر پیدل دو ماہ میں پورا کیا، حیدر آباد کے دورانِ قیام میں حضرت مفتی لطف اللہ علی گڈھی اور مولانا عبدالوہاب بہاری سے منطق، فلسفہ، ہیئت، ادب اور اصول فقہ کی تحصیل کی، حیدر آباد سے دہلی پہنچکر مولانا نذیر حسین صاحب کے درس میں شریک ہوئے، آخر میں دارالعلوم میں داخلہ لیا اور حضرت شیخ الہندؒ سے حدیث کی تکمیل کی، بعدِ فراغت دارالعلوم میں سات آٹھ سال تک مدرس رہے، پھر مدرسہ عزیزیہ بہار شریف، مدرسہ عالیہ کلکتہ، مدرسہ عالیہ سلہٹ میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث رہے، ۱۹۲۰ء میں پٹنہ کے مدرسہ عالیہ شمس الہدیٰ میں پرنسپل مقرر ہوئے، غرض کہ ۴۶ برس تک یو، پی، بہار، بنگال اور آسام کے بڑے بڑے مدارس میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، ۱۳۵۰ھ سے ۱۳۶۲ھ تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے، ۲۷ رجب ۱۳۶۷ھ ۱۹۴۸ء کو وصال ہوا، مزار پورینی میں ہے۔

مولانا محمد سہول صاحب نے ۱۳۵۵ھ سے ۱۳۵۷ھ تک تقریباً تین سال دارالافتاء میں صدر مفتی کے فرائض انجام دئے، اُن کے زمانے میں ۱۵۱۸۵ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

٭

مولانا کفایت اللہ گنگوہیؒ

اُنھوں نے ۱۳۲۳ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں، اواخر ۱۳۵۶ھ میں دارالعلوم کے دارالافتاء کے لئے اُن کو منتخب کیا گیا، بعدازاں ۱۳۵۹ھ کے اوائل میں شعبۂ تدریس میں منتقل کر دیا گیا، ۱۳۶۳ھ میں مولانا کفایت اللہ صاحب دارالعلوم سے مستعفی ہو کر میرٹھ چلے گئے۔ وہاں درس و تدریس کا مشغلہ رہا۔ اُنکے زمانے میں ۳۰۵۸ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

مولانا محمد فاروق احمد

جماعتِ دیوبند کے مشہور عالم و بزرگ حضرت مولانا صدیق احمد انبہٹویؒ کے فرزند ہیں، جامعۂ عباسیہ بہاولپور میں عرصے تک درس و تدریس اور افتاء کی خدمات انجام دیں۔ ۱۳۶۲ھ کے اواخر میں دارالافتاء کے صدر مفتی مقرر ہوئے، اُنھوں نے کم و بیش ایک سال دارالافتاء کے فرائض انجام دیئے، ۱۳۶۳ھ میں ریاست بہاولپور کی وزارتِ تعلیم کی جانب سے مولانا فاروق احمد صاحب پر زور ڈالا گیا، کہ وہ اپنی سابقہ جگہ پر بہاولپور تشریف لے آئیں، چنانچہ مولانا بہاولپور چلے گئے اور وہاں جامعۂ عباسیہ بہاولپور کے شیخ الحدیث مقرر ہوئے۔ پھر مدرسہ قاسم العلوم فقیر والی ضلع بہاولپور میں صدر مدرس ہو گئے، ۱۳۸۰ھ میں اپنے ضعف و نقاہت کی وجہ سے سبکدوش ہو کر خانہ نشین ہو گئے۔ دارالعلوم میں اُن کے ایک سالہ زمانے میں ۴۲۹۸ فتاویٰ لکھے گئے۔

مولانا مفتی مہدی حسن

شاہ جہاں پور وطن ہے، ۱۳۰۱ھ میں پیدا ہوئے، تعلیم کی تکمیل ۱۳۲۶ھ میں مدرسہ امینیہ دہلی میں کی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے ممتاز تلامذہ میں تھے، دارالعلوم دیوبند کے ۱۳۲۸ھ کے جلسۂ دستاربندی میں اُن کی بھی دستاربندی ہوئی تھی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت مفتی صاحب نے اُنھیں مدرسہ اشرفیہ راندیر ضلع سورت بھیجدیا، وہاں طویل مدت تک افتاء اور تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، اہلِ گجرات پر اُن کے علم و فضل کا

بڑا اثر تھا، فقہ حنفی میں بے نظیر مہارت کے ساتھ حدیث اور اسمار الرجال پر بھی ان کی نظر بڑی گہری تھی، ۱۳۶۷ھ میں انھیں دارالعلوم کے دارالافتار میں صدر مفتی کے منصب پر مامور کیا گیا، ۱۳۸۷ھ میں اپنی طویل علالت اور ضعف وکمزوری کی وجہ سے دارالعلوم سے سبکدوش ہوکر وطن مالوف شاہجہاں پور چلے گئے۔

اُن کے زمانۂ صدارت میں دارالافتار دارالعلوم سے ۴۲۲۴۳۵ افتاویٰ جاری ہوئے، مفتی مہدی حسن صاحب زاہد ومتقی، متواضع اور فیاض طبع تھے، اس کے ساتھ صاف گو اور اظہارِ حق میں بیباک تھے، شاعری سے بھی ذوق رکھتے تھے۔ اور آزاد تخلص تھا، حضرت گنگوہیؒ سے بیعت تھے، مگر اجازت وخلافت حضرت گنگوہیؒ کے خلیفہ مولانا شفیع الدین مکّی سے حاصل ہوئی۔

مفتی مہدی حسن صاحب کئی اہم کتابوں کے مصنّف ومرتب ہیں، جن میں حدیث کی شرح معانی الآثار للطحاوی کی عربی شرح قلائدالازہار کے نام سے ۶ جلدوں میں ہے، اسکی دو جلدیں طبع ہوچکی ہیں فقہ میں امام محمدؒ کی کتاب الحجّہ جو ۴ جلدوں میں ہے، اُن کی تصحیح وتعلیق کے ساتھ دائرۃ المعارف میں اس کی ابتدائی دو جلدیں چھپی ہیں، یہ کتاب بڑی نایاب تھی، اس کا ایک نسخہ استنبول میں موجود تھا، یہ فقہ حنفی کی بنیادی کتابوں میں سے ہے۔ مفتی صاحب نے اس کے مسودے کی تصحیح وتعلیق میں ۲۰ سال صرف کئے ہیں، امام محمد کی کتاب الآثار پر ان کی تعلیقات گراں قدر علمی سرمایہ ہیں، نخبۃ الفکر کی شرح بھی انھوں نے لکھی ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے، یہ سب کتابیں عربی زبان میں ہیں، ان کے علاوہ اُردو میں دو درجن سے زائد رسائل انھوں نے لکھے ہیں جو طبع نہیں ہوسکے۔

مفتی مہدی حسن صاحب نے طویل علالت کے بعد اپنے وطن شاہجہاں پور میں ۲۸ ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ کو وفات پائی۔

✻

مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی

اوائل جمادی الثانی ۱۳۲۵ھ میں گنگوہ میں پیدا ہوئے۔ مظاہر علوم سہارن پور اور دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی، ۱۳۵۱ھ میں مظاہر علوم سہارن پور سے حدیث کی تکمیل کی، اور وہیں تقریباً ۲۰ سال تک افتار اور درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے، پھر مدرسہ جامع العلوم کان پور میں ۱۳۷۱ھ سے ۱۳۸۴ھ تک ۱۴ سال کے قریب مسندِ صدارت و افتار پر فائز رہے، کان پور کے لوگوں پر اُن کے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور بزرگی کا بڑا اثر ہے۔

۱۳۸۵ھ میں انھیں دارالافتار دارالعلوم دیوبند میں مفتی کے منصب کے لئے منتخب کیا گیا جس پر تا ایندم فائز ہیں، فتویٰ نویسی کے علاوہ صحیح بخاری جلد دوم کا درس بھی طلبار کو دیتے ہیں۔

مفتی صاحب کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے، مگر اُن کے لکھے ہوئے بعض اہم فتاویٰ مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں، کان پور کا ماہانہ رسالہ "نظام" برسہا برس سے اُن کی سرپرستی میں شائع ہو رہا ہے۔ فتاویٰ میں طرزِ تحریر اختصار پسندانہ ہے۔

مفتی صاحب کو شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سے خلافت و اجازت حاصل ہے، ان کی قیام گاہ ذاکرین کے ذکر سے معمور رہتی ہے، وہ نہایت منکسر المزاج، متواضع کثیر المطالعہ ذاکر و شاغل، فراخ حوصلہ اور سیر چشم بزرگ ہیں، ان کو دیکھ کر علمائے سلف کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، ان کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ دارالعلوم سے اُنھیں جو مشاہرہ ملتا ہے اُس کو وہ ہر ماہ نہ صرف یہ کہ دارالعلوم میں داخل کر دیتے ہیں، بلکہ اس میں مزید کچھ اور روپے بھی شامل فرما دیتے ہیں، ان کا یہ عمل بلاناغہ جاری ہے۔

مولانا مفتی نظام الدین

۱۳۲۸ھ میں اپنے وطن موضع اوندرا ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن کے مکاتب میں

ہوئی پھر مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور (اعظم گڈھ) میں پڑھا۔ بعدازاں مدرسہ عزیزیہ بہار شریف اور مدرسہ عالیہ مسجد فتح پوری دہلی میں ثانوی درجات تک تحصیل علم کی، آخر میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۵۲ھ میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔

اولاً مدرسہ جامع العلوم جین پور (اعظم گڈھ) اور گورکھپور میں تدریسی خدمت انجام دی، پھر مدرسہ دارالعلوم مؤناتھ بھنجن میں مدرس اور افتاء کے منصب پر فائز ہوئے، ۱۳۸۵ھ میں دارالعلوم دیوبند کی طلب پر دارالعلوم میں افتاء کا منصب تفویض ہوا، جس پر اب تک فائز ہیں، فتویٰ نویسی کا اچھا ملکہ حاصل ہے۔ فتاویٰ میں ان کے جوابات مفصل ہوتے ہیں، ان کے اکثر اہم فتاویٰ رسالہ "دارالعلوم" دیوبند میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ قدس سرہٗ سے بیعت و خلافت کا شرف حاصل ہے طبیعت میں سادگی اور وقار نمایاں ہے۔

بابِ ششم

دارالعلوم کا نظامِ تعلیم

دارالعلوم کا نصابِ تعلیم بیان کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ علومِ عبیر کے نصاب کی اجمالی تاریخ بیان کردی جائے تاکہ اسلام کے قرنِ اول سے لے کر موجودہ زمانے تک علمی رجحانات کا فی الجملہ اندازہ کیا جاسکے۔

عہدِ نبوت میں تعلیم کی ابتداء قرآن مجید سے شروع ہوئی، حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں قرآن مجید کی تعلیم کے ساتھ ساتھ احادیث کی نشر و اشاعت اور درس و تدریس کا بھی خصوصی اہتمام کیا گیا، پھر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور علمی ضرورتیں بڑھتی رہیں علوم میں بھی حسبِ ضرورت اضافہ ہوتا رہا، دوسری صدی ہجری کے وسط تک علوم و فنون، قرآن، حدیث، فقہ اور اشعارِ عرب میں منحصر تھے۔ اس کے بعد چوتھی صدی کے آخر تک جو ایجاد و تدوین کا دور کہلاتا ہے اس میں تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ مختلف علوم و فنون کی ایجاد اور ترجمے عمل میں آئے، اور حسبِ ضرورت بعض فنون کی تعلیم و تدریس بھی ہونے لگی، چنانچہ حدیث، تفسیر، فقہ، اصولِ فقہ صرف و نحو، لغات، اشعارِ عرب اور تاریخ اس زمانے کے علوم درسیہ شمار کئے جاتے ہیں۔ طب، نجوم، ہیئت اور بعض دوسرے یونانی علوم بھی اس میں اضافہ کئے جاسکتے ہیں۔

پانچویں اور ساتویں صدی کے درمیان میں امام غزالی رحؒ کے ذریعے علم کلام کی بنیاد پڑی اور اسکی تائید کے لئے مذکورہ علوم کے علاوہ منطق اور فلسفہ وغیرہ علوم معقولہ بھی اسلامی درس گاہوں کا ضروری جزو بن گئے۔

اگرچہ یہ علوم کم و بیش تمام اسلامی ملکوں میں متداول تھے، تاہم مختلف ممالک میں ملکی، مقامی اور قومی خصوصیات کا اثر پڑنا بھی ناگزیر تھا، مصر و شام وغیرہ ممالک میں چونکہ کثرت سے عرب خاندان آباد تھے اس لئے ان ممالک میں عربی رُجحانات کا غلبہ حاصل ہونے کے باعث نسبتہً تفسیر و حدیث اور اسماء الرجال پر زیادہ اعتنار کیا جاتا تھا۔ اُندلس میں ادب و شعر اور تاریخ کو زیادہ فروغ حاصل تھا، ایران میں منطق و فلسفہ کا مذاق غالب تھا، اور خُراسان و ماوراءالنہر میں فقہ، اصولِ فقہ اور تصوّف کا زیادہ رواج تھا، لیکن اسی کے ساتھ ایک ہی ملک میں مختلف زمانوں میں ماحول کے اثرات اور گردو پیش کے تقاضوں کے باعث بھی اکثر نصاب میں تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے۔

ہر چند ہندوستان میں مُسلمان پہلی صدی ہجری میں پہنچ گئے تھے جس میں پانچویں صدی کے اوائل یعنی سلطان محمود غزنوی کے عہد میں خاصہ اضافہ ہوا، اور سندھ کے علاوہ پنجاب تک کا علاقہ اسلامی قلمرو میں شامل ہوگیا تھا، مگر اُن کے اصلی اثر و رسوخ کا آغاز ساتویں صدی ہجری کے اوائل یعنی سلطان شہاب الدّین غوری (۵۹۶ھ / ۱۱۹۹ء - ۶۰۲ھ / ۱۲۰۵ء) کے عہد سے ہوتا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جس میں خُراسان اور ماوراءالنہر وغیرہ میں تفسیر و حدیث کے ساتھ صرف و نحو بلاغت ادب، فقہ، منطق، کلام اور تصوّف اگرچہ معیارِ فضیلت سمجھے جاتے تھے مگر فقہ اور اصولِ فقہ کو زیادہ اہمیت حاصل تھی، ہندوستان میں آنے والے مُسلمان زیادہ تر انہی ممالک سے آئے تھے، لہٰذا اُن کے ساتھ اُن کے رجحانات کا آنا بھی لازمی تھا، چنانچہ ہندوستان میں اس دور کے نصاب تعلیم میں یہ سب علوم داخل اور جزوِ نصاب تھے۔

مولانا حکیم سیّد عبدالحیٔ لکھنوی رحؒ نے قدیم ہندوستانی نصاب تعلیم کے حسب ذیل

چار دور قرار دیے ہیں :۔

دورِ اوّل

اس کا آغاز ساتویں صدی ہجری سے سمجھنا چاہیے اور انجام دسویں صدی پر اُس وقت ہوا جب کہ دوسرا دَور شروع ہو گیا تھا، کم و بیش دو سو برس تک مندرجہ ذیل فنون کی تحصیل معیارِ فضیلت سمجھی جاتی تھی، صَرف، نحو، اَدب، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، منطق، کلام تصوّف، تفسیر، حدیث۔

علم نحو میں مصباح، کافیہ، لب الالباب، مصنّفہ قاضی ناصر الدّین بیضاوی اور ارشاد، مصنّفہ قاضی شہاب الدّین دولت آبادی۔

فقہ میں ہدایہ، اصولِ فقہ میں منار، اس کے شروح، اور اصولِ بزدوی۔

تفسیر میں مدارک، بیضاوی اور کشاف۔

تصوّف میں عوارف، فصوص الحکم، اور ایک زمانے کے بعد نقد النصوص ولمعات بھی اُن مدارس میں رائج ہو گئی تھیں جو خانقاہوں سے متعلق تھے۔

حدیث میں مشارق الانوار، مصباح السنّنہ (یعنی مشکوٰۃ المصابیح کا متن)

ادب میں مقامات حریری، زبانی یاد کی جاتی تھی، حضرت نظام الدّین اولیاؒ کے ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شمس الدّین خوارزمی سے مقامات پڑھی تھی اور چالیس مقامے زبانی یاد کیے تھے۔

منطق میں شرح شمسیہ۔

کلام میں شرح صحائف، اور بعض مقامات پر تمہید ابو شکور سالمی

اس طبقے کے علمار کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں فقہ اور اصول فقہ معیارِ فضیلت، تھے، حدیث میں صرف مشارق الانوار کا پڑھ لینا کافی سمجھا جاتا تھا، اور حدیث

میں مزید درک و مہارت کے لئے مصابیح آخری کتاب تھی۔

اس زمانے کے نصاب تعلیم میں جو خصوصیات نظر آتی ہیں وہ فاتحین ہند کے مؤثر مذاق کا نتیجہ تھیں۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا تخت جن لوگوں نے بچھایا وہ غزنی اور غور سے آئے تھے۔ یہ وہ مقامات تھے جہاں فقہ اور اصولِ فقہ کا ماہر ہونا علم و فن کا طغرائے امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ ان ممالک میں فقہی روایات کا پایہ بہت بلند تھا۔

دورِ دوم

نویں صدی ہجری کے آخر میں شیخ عبداللہ اور شیخ عزیزاللہ نے سابقہ معیارِ فضیلت کو کسی قدر بلند کرنے کے لئے قاضی عضد کی تصانیف مطالع و مواقف اور سکاکی کی مفتاح العلوم نصاب میں داخل کیں۔ متذکرہ صدر بزرگوں کے حالات میں بدایونی نے لکھا ہے کہ:۔

"ایں ہر دو عزیزان ہنگامِ خرابیٔ ملتان بہندوستان آمدہ، علوم معقول را دراں دیار رواج دادند قبل ازیں بغیر از شرح شمسیہ و شرح صحائف از علمِ منطق و کلام در ہند شائع نہ بود[1]۔"

اس دور میں میر سید شریف کے تلامذہ نے شرح مطالع اور شرح مواقف اور علامہ تفتازانی کے شاگردوں نے مطول و مختصر المعانی اور تلویح و شرح عقائد نسفی کو رواج دیا۔

نیز اس زمانہ میں شرح وقایہ اور شرح جامی داخلِ نصاب کی گئیں۔

اس دور کے آخر میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح نے علمارِ حرمین شریفین سے علم حدیث کی تکمیل کر کے علمِ حدیث کو فروغ دینے کی کوشش کی، اُن کے بعد اُن کے فرزند شیخ نورالحق رح نے بھی درسِ حدیث کی اشاعت کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔

---

[1] منتخب التواریخ بدایونی ص ۸٦

دورِ اوّل کی جن کتابوں کی فہرست دی جا چکی ہے اُن میں اُس دور کی مذکورہ بالا کتابیں یعنی مطالع و مواقف اور ان کی شرحیں، مطول، مختصر، تلویح، شرح عقائد نسفی شرح وقایہ شرح جامی کا اضافہ کر لینے سے دورِ دوم کے نصاب، کی فہرست بآسانی مرتب ہو جاتی ہے۔

اس طبقے کے علماء کرام کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ہمارے زمانے میں صدرا اور شمس بازغہ انتہائی کتابیں سمجھی جاتی ہیں، اُسی طرح اُس زمانے میں مفتاح العلوم سکاکی اور قاضی عضد کی مطالع اور مواقف منتہیانہ کتابیں تھیں، بدایونی نے جابجا علماء کے حالات میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دورِ سوم

دورِ دوم کے نصابِ درس میں جو تغیر ہوا اس سے لوگوں کی اُمنگیں بڑھ گئی تھیں اور وہ معیارِ فضیلت کو پہلے سے زیادہ بلند کرنے کے متمنی تھے، میر فتح اللہ شیرازی سے ہندوستان آئے، اکبر نے ان کو عضد الملک کا خطاب دے کر پذیرائی کی، اُنھوں نے سابق نصابِ درس میں کچھ جدید اضافے کئے جس کو علماء نے فوراً قبول کر لیا، مآثر الکرام میں میر غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:۔

تصانیف علمائے متاخرین ولایت مثل محقق دوانی و میر صدر الدین و میر غیاث الدین منصور، و مرزا جان میر بہندوستان آورد، و در حلقۂ درس انداخت و جمِ غفیر از حاشیۂ محفلِ میر استفادہ کردند و ازاں عہد معقولات را رواجے دیگر پیدا شد[1]۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے جو اس دور کے سب سے آخری مگر سب سے زیادہ نامور عالم تھے الجزء اللطیف میں اپنی درسیات کو اس ترتیب سے لکھا ہے:۔

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۳۸

نحو میں، کافیہ، شرح جامی۔

منطق میں، شرح شمسیہ، شرح مطالع۔

فلسفہ میں، شرح ہدایۃ الحکمۃ۔

کلام میں، شرح عقائد نسفی، مع حاشیہ خیالی، شرح مواقف۔

فقہ میں، شرح وقایہ، ہدایہ (کامل)

اصولِ فقہ میں، حسامی اور کسی قدر توضیح تلویح۔

بلاغت میں، مختصر و مطول۔

ہیئت و حساب میں، بعض مختصر رسائل۔

طب میں، موجز القانون۔

حدیث میں، مشکوٰۃ المصابیح، شمائل ترمذی اور کسی قدر صحیح بخاری۔

تفسیر میں، مدارک اور بیضاوی۔

تصوّف و سلوک میں، عوارف و رسائل نقشبندیہ، شرح رباعیات جامی، مقدمہ شرح لمعات مقدمہ نقد النصوص۔

اس نصاب کی تحصیل کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہاں چودہ ماہ قیام فرما کر شیخ ابو طاہر کردی سے علمِ حدیث کی تکمیل کی اور ہندوستان آکر اس سرگرمی سے اس کی اشاعت کی جس کے اثرات آج تک باقی ہیں، حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے اخلاف نے صحاح ستہ کے درسِ تدریس کو اپنی سعی و کوشش سے جزو نصاب بنا دیا۔

شاہ صاحبؒ نے ایک نیا نصابِ درس بھی مرتب کیا تھا مگر چونکہ اُس زمانے میں علم کا مرکزِ ثقل دہلی سے لکھنؤ منتقل ہو چکا تھا، نیز ہمایوں اور اکبر کے زمانے میں ایران سے جو نیا تعلق ہوا تھا اس نے بتدریج ہندوستان کے علمی مذاق میں ایک جدید تغیر پیدا کر دیا تھا۔

مغل دربار کے ایرانی امراء اور علماء کے ذریعے منطق اور فلسفہ کو جو شروع سے ہی ایران میں معیار فضیلت سمجھے جاتے تھے آہستہ آہستہ دوسرے علوم پر فوقیت حاصل ہوتی جا رہی تھی اس لئے شاہ صاحبؒ کے نصاب کو قبول عام حاصل نہ ہو سکا۔

دورِ چہارم

چوتھا دور بارھویں صدی ہجری سے شروع ہوا، اس کے بانی ملّا نظام الدین سہالوی لکھنوی تھے، یہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے ہم عصر تھے، درسِ نظامی کے نام سے جو نصاب آج تمام مدارس عربیہ میں رائج ہے وہ انہی کی یادگار ہے، ملّا نظام الدین نے دورِ سوم کے نصاب میں اضافہ کر کے مندرجہ ذیل نصاب مرتب کیا:۔

صرف میں، میزان، منشعب، صرف میر، پنج گنج، زبدہ، فصول اکبری، شافیہ

نحو میں، نحو میر، شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی۔

منطق میں۔ صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی سلم العلوم۔

فلسفہ میں، میبذی، صدرا، شمس بازغہ۔

ریاضی اور ہیئت میں، خلاصۃ الحساب، تحریر اقلیدس مقالۂ اولیٰ، تشریح الافلاک رسالہ قوشجیہ، شرح چغمنی باب اوّل۔

بلاغت میں۔ مختصر المعانی، مطول تا ما انا قلت۔

فقہ میں۔ شرح وقایہ اوّلین اور ہدایہ آخرین۔

اصول فقہ میں، نور الانوار، توضیح تلویح، مسلم الثبوت۔

کلام میں، شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی، میر زاہد، شرح مواقف۔

تفسیر میں، جلالین شریف، بیضاوی سورہ بقرہ
حدیث میں، مشکوٰۃ المصابیح

اس نصاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ طالب علم میں امعانِ نظر اور قوتِ مطالعہ پیدا کرنے کا اس میں زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے اور گو اس نصاب کی تحصیل کے معاً بعد کسی مخصوص فن میں کمال حاصل نہیں ہوجاتا، مگر یہ صلاحیت ضرور پیدا ہوجاتی ہے کہ محض اپنے مطالعہ اور محنت سے جس فن میں چاہے کمال پیدا کرلے، حدیث و تفسیر کا معیار اس نصاب میں بھی کچھ زیادہ بلند نہیں ہے، اور ادب کی تو سرے کوئی کتاب ہے ہی نہیں۔

تیرھویں صدی کے وسط میں ہندوستان میں علم کے تین مرکزِ فکر قائم تھے، دہلی، لکھنؤ اور خیرآباد۔ گو نصابِ تعلیم تینوں کا قدرے مشترک تھا، تاہم تینوں کے نقطہ ہائے نظر مختلف تھے، دہلی میں تفسیر و حدیث پر زیادہ توجہ کی جاتی تھی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا خاندان کتاب و سنت کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تدریس میں ہمہ تن مشغول تھا، علوم معقولہ کی حیثیت ثانوی درجے کی تھی، لکھنؤ میں علمائے فرنگی محل پر ماوراء النہر کا ساتویں صدی والا قدیم رنگ چھایا ہوا تھا، فقہ اور اصول فقہ کو اُن کے یہاں سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی، تفسیر میں جلالین و بیضاوی اور حدیث میں صرف مشکوٰۃ المصابیح کافی سمجھی جاتی تھی، خیرآبادی مرکز کا علمی موضوع صرف منطق و فلسفہ تھا، اور یہ علوم اس قدر اہتمام سے پڑھائے جاتے تھے کہ جملہ علوم کی تعلیم ان کے سامنے ماند پڑگئی تھی۔

دارالعلوم کا نصابِ تعلیم

تیرھویں صدی کے نصف آخر میں دہلی اور خیرآباد کی علمی مرکزیت ختم ہوچکی تھی، البتہ لکھنؤ میں علم کی کچھ روشنی باقی تھی، گو ان مقامات کی مرکزیت ختم ہوچکی تھی، تاہم ان تینوں مرکزوں

کی مابہ الامتیاز خصوصیات ہندوستان کے مدارسِ عربیہ میں کم و بیش موجود تھیں۔

دارالعلوم دیوبند نے ان علوم کی عظمت کو نہ صرف یہ کہ باقی رکھا ہے، بلکہ ان کو ترقی دینے میں اس نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے نصابِ تعلیم میں ان تینوں مقامات کی خصوصیات کو جمع کر دیا گیا ہے، اور ان کے امتزاج سے جو نصاب تیار ہوا ہے، کم و بیش ایک صدی سے وہی بالعموم مدارس عربیہ میں زیرِ درس ہے، بعض مقامات پر دوسرے جدید نصاب بھی رائج ہیں، ایسے مدارس میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کی حیثیت زیادہ ممتاز ہے، مگر یہ نصاب زیادہ عام نہیں ہے۔

نصابِ دارالعلوم کی مذکورہ بالا جامعیت کے باوجود جس طرح ہر زمانے میں حالات کے تقاضوں کے مطابق نصابِ تعلیم میں تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے اسی طرح دارالعلوم کے نصاب میں بھی وقتاً فوقتاً حالاتِ زمانہ کے تقاضے کے مطابق حذف و اضافہ کیا جاتا رہا ہے جس میں علومِ دینیہ کے ساتھ عصری علوم اور معاشی ضرورتوں کا بھی فی الجملہ لحاظ رکھا گیا ہے، اور اسے زیادہ مفید بنانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔

موجودہ نصاب چار طبقات پر مشتمل ہے، ابتدائی۔ متوسط۔ اعلیٰ۔ تکمیل

درجۂ تکمیل لازمی نہیں ہے، اگر طلبِ علم کو مزید کسی خاص موضوع یا فن میں مہارت حاصل کرنا مقصود ہو تو وہ درجۂ تکمیل میں داخلہ لے کر مزید اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا نصابِ تعلیم حسبِ تفصیل ذیل علوم و فنون اور کتابوں پر مشتمل ہے۔

درجاتِ عربیہ کا آٹھ سالہ نصابِ تعلیم

سال اوّل

فن	اسمائے کتب
صرف	عربی کا قاعدہ
	میزان الصرف و منشعب تمام
	پنج گنج تمام
نحو	نحو میر تمام حفظ، شرح مائۃ عامل تمام
عربی ادب	روضۃ الادب باستثنا باب المکاتیب
	انشاء، عربی (نثر) عربی کا معلّم اوّل و دوم
منطق	تیسیر المنطق
خوشنویسی	تصحیح خط و املا نویسی
تجوید	مشقِ تجوید، پارہ عم ربع اول و ادعیۂ ماثور

سال دوم

فن	اسمائے کتب
فقہ	نور الایضاح تمام
	قدوری تا کتاب الحج
نحو	ہدایۃ النحو تمام
	النحو الواضح ابتدائی حصہ اوّل
صرف	علم الصیغہ تا خاصیات
	فصول اکبری (از خاصیات)
عربی ادب	نفحۃ الادب تمام، تمرین عربی
منطق	مرقات و تہذیب
تجوید	مشقِ تجوید، پارۂ عم ثلث آخر حفظ
	جمال القرآن تمام
خوشنویسی	تصحیح خط و املا

سال سوم

فن	اسمائے کتب
تفسیر	ترجمۃ القرآن سورہ بقرہ
فقہ	قدوری از کتاب البیوع تا ختم
نحو	ابن عقیل
	” تا صفحہ ۳۰۰
	شرح جامی (فعل وحرف)
عربی ادب	نفحۃ العرب (نثر)
منطق	شرح تہذیب تا ضابطہ
”	قطبی تصدیقات
حدیث	مشکوٰۃ الآثار
فنون عصریہ	الف (۱) تاریخ ہند از عہد سلطان محمود غزنوی تا ۱۹۴۷ء
	(۲) تاریخ اسلام خلفائے راشدین بنی امیہ، بنی عباس، تاریخ سلطنت ترکی
	(۳) بلدیات (مبادی علم مدنیت)
	(ب) (۲) جغرافیہ جزیرۃ العرب ودیگر بلادِ اسلامیہ
	(۲) جغرافیہ عالم (خطہ وار)

سال چہارم

فن	اسمائے کتب
تفسیر	ترجمۃ القرآن از سورۃ آل عمران
”	تا سورۃ مریم
فقہ	کنز الدقائق تا کتاب النکاح
	شرح وقایہ جلد ثانی تا کتاب العتاق
اصول فقہ	اصول الشاشی تمام
معانی	مختصر المعانی تا ختم فن ثانی
	تلخیص المفتاح صرف فن ثالث
منطق	سلم العلوم تا ختم تصورات
فلسفہ	ہدیہ سعیدیہ (نصف اول)
حدیث	الفیۃ الحدیث
فنون عصریہ	(۱) جنرل سائنس (مبادی کیمیا وطبعیات حیوانات ونباتات (نظری) (۲) اصول حفظان صحت (ب) (۱) دستور ہند کے بعض ضروری ابواب (۲) مبادی معاشیات (۳) چند جدید فلسفیوں کے نظریات و سوانح

سالِ پنجم

فن	اسمائے کتب
فقہ	ہدایہ ربع اوّل
	ربع ثانی
عربی ادب	مقاماتِ حریری ۱۰ مقامے
منطق	ملاحسن تا جنس
اصول فقہ	نورالانوار تا قیاس
عقائد	عقیدۃ الطحاوی (تمام)
معانی وبیان	البلاغۃ الواضحہ

سالِ ششم

فن	اسمائے کتب
تفسیر	جلالین شریف تمام
اصول تفسیر	الفوزالکبیر تمام
	(دو گھنٹے روزانہ)
اصول فقہ	حسامی تمام
فلسفہ	میبذی تمام
عربی ادب	دیوان متنبی تا ختم قافیہ دال
	تمرین عربی، انشائے محادثہ
	تجوید یا خوشنویسی

سالِ ہفتم

فن	اسمائے کتب
فقہ	ہدایہ آخرین تمام (دو گھنٹے روزانہ)
عقائد وکلام	شرح عقائد نسفی تمام
تفسیر	بیضاوی سورۂ بقرہ سوا پارہ
حدیث	مشکوٰۃ شریف (تمام)
اصول حدیث	شرح نخبۃ الفکر (تمام)
	(دو گھنٹے روزانہ)
فرائض	سراجی تمام

اختیاری مضامین

فن	اسمائے کتب
اصول تفسیر	تلخیص الاتقان
اصول حدیث	مقدمہ ابن صلاح
کلام	مسامرہ
منطق	حمداللہ
ادب	دیوان حماسہ
	(باب الادب والحماسہ)
	النثرالجدید

سال ہشتم دورۂ حدیث

فن	اسمائے کتب
حدیث	بخاری شریف تمام
	مسلم شریف تمام
	ترمذی شریف تمام
	ابوداؤد شریف تمام
	نسائی شریف
	ابن ماجہ شریف
	طحاوی شریف
	شمائل ترمذی شریف
	موطائین

درجاتِ تکمیل

تکمیل تفسیر

فن	اسمائے کتب
تفسیر	تفسیر مدارک پارہ ۱ تا ۵
	تفسیر مدارک پارہ ۶ تا ۱۰
	تفسیر مظہری پارہ ۱۱ تا ۱۵
	تفسیر مظہری پارہ ۱۶ تا ۲۰
	تفسیر بیضاوی شریف پارہ ۲۱ تا ۲۵
	تفسیر بیضاوی شریف پارہ ۲۶ تا ۳۰
	تلخیص الاتقان

تکمیل دینیات

تفسیر	تفسیر ابن کثیر سورۃ بقرہ وآل عمران
حکمت شرعیہ	حجۃ اللہ البالغہ
مناظرہ	رشیدیہ
فقہ	الاشباہ والنظائر، تا فن اوّل
اصول فقہ	توضیح وتلویح
اصول حدیث	مقدمہ ابن صلاح
حدیث وفقہ	مقدمہ فتح الباری، بدایۃ المجتہد تدریب الراوی

تکمیل ادب

نظم

دیوان حسان بن ثابتؓ

سبعہ معلقہ تا ۳

(نثر)

اسالیب الانشاء

جرائد و رسائل

(تاریخ)

تاریخ الادب العربی

معانی وبیان

البلاغۃ الواضحہ

(انشاء)

مقالاتِ عربی

(مطالعہ)

حیاتی احمد امین ۔ الایام ڈاکٹر طٰہٰ حسین

عبرات منفلوطی۔ عبقریات، محمود عقاد

تکمیل معقولات

قاضی مبارک تا (امہات المطالب)

حمداللہ تا شرطیات

صدرا تا بحث صورتِ جسمیہ

شمس بازغہ تا بحث مکان ص۴

شرح عقائد جلالی تا بحث اصلح ص۲

مسلم الثبوت ۴ باب

مطالعہ

مقدمہ ابن خلدون

رسالہ حمیدیہ

درجہ عربی کے اس ۸ سالہ نصاب کی تکمیل کے بعد طالب علم "فاضل دارالعلوم" کی سند فراغت کا مستحق ہوجاتا ہے۔

ابتدائی درجات

دارالعلوم کے قواعد کے مطابق "درجاتِ عربیہ" تک پہنچنے کیلئے مندرجہ ذیل ابتدائی نصاب کی تکمیل لازمی ہے۔

درجہ قرآن مجید

(۱) سب سے پہلے قرآن مجید کا کم از کم ناظرہ پڑھنا ضروری ہے، قرآن مجید سے قبل بالعموم قاعدہ بغدادی کے نام سے جو قاعدہ مشہور ہے وہ پڑھایا جاتا ہے، قرآن مجید کی تحصیل میں کم و بیش دو سال صرف ہوتے ہیں۔

مدت کا یہ تخمینہ اُن چھوٹے بچوں کے لئے ہے جو پانچ سال کی عمر میں پڑھنے بٹھا دیئے گئے ہوں اور متوسط درجے کا ذہن رکھتے ہوں، ورنہ ذی شعور بچے اس سے کم مدت میں بھی قرآن مجید ختم کر لیتے ہیں۔

حفظ قرآن مجید کی مدت کم و بیش تین سال ہے۔

(۲) قرآن مجید کے بعد اُردو اور فارسی کی تحصیل بھی ضروری ہے لیکن حفظ قرآن مجید کے بعد جو بچے تجوید و قرأت کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں اُن کے لئے شعبۂ تجوید قائم ہے،

درجۂ تجوید

کے نصاب تعلیم میں تجوید و قرأت کی مشق کے ساتھ یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔

جمال القرآن، معرفۃ الوقوف، فوائدِ مکیہ، شاطبیہ، رائیہ، طیبہ

یہ دو سال کا نصاب ہے، درجۂ عربی کے ہر طالب علم کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ دوسرے اسباق کے ساتھ وہ کسی ایک گھنٹے میں اس شعبہ میں داخلہ لے کر کم از کم پارہ عم کو تجوید کے ساتھ پڑھنے کی مشق بہم پہنچائے۔

اُردو دینیات

(۳) قرآن مجید کے بعد اُردو دینیات کا شعبہ ہے، جس میں اُردو

زبان میں دینیات کی تعلیم کے علاوہ حساب وغیرہ دوسرے مضامین پڑھائے جاتے ہیں، اس شعبے کا نصاب چار سالوں پر منقسم ہے۔

درجۂ فارسی (۴) اُردو دینیات کے بعد دوسرا تعلیمی شعبہ فارسی ہے، جس میں فارسی نثر و نظم، حساب، جغرافیہ، ہندی اور عربی صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں نصاب میں شامل ہیں، یہ شعبہ بھی چار درجات پر مشتمل ہے۔

ابتدائی درجات کے علاوہ مشق و تعلیم کے درجات یہ ہیں:۔

علومِ عصریہ (۱) ایک شعبہ علوم عصریہ کا ہے، جس میں انگریزی اور عصری علوم کی تعلیم دی جاتی ہے، اس شعبے کا نصاب ایک سال کا ہے۔

مشقِ افتاء دورۂ حدیث سے فارغ شدہ طلبار کے لئے فتاویٰ نویسی کی مشق کا بھی ایک شعبہ ہے، اس کی مدّت تعلیم بھی ایک سال ہے۔

جامعۂ طبیّہ (۲) دارالعلوم کا ایک تعلیمی شعبہ جامعۂ طبیّہ بھی ہے، جس میں دورۂ حدیث کے فارغ شدہ طلبار داخلہ لے سکتے ہیں، جامعۂ طبیّہ کا نصاب تعلیم چار سالوں پر مشتمل ہے، اس کے نصاب میں طب یونانی کی کتابوں کے ساتھ طبِ جدید کی کتابیں بھی شامل ہیں۔

شعبۂ کتابت (۳) دورۂ حدیث سے فارغ شدہ شعبۂ کتابت میں بھی داخلہ لے سکتے ہیں، اس کی مدّت مشق ایک سال ہے، درجات عربی کے دورانِ تعلیم میں یہ شعبہ طلبار کے خط کی اصلاح کا کام بھی انجام دیتا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

دارالعلوم کے نصاب کو دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس وقت یہ نصاب مدون

کیا گیا اُس زمانے میں علومِ جدیدہ ہندوستان پہنچ چکے تھے تو کیوں اُن کو شاملِ نصاب نہیں کیا گیا؟ حضرت نانوتویؒ کے نزدیک اس کا سبب یہ تھا کہ ملک میں سرکاری مدارس جگہ جگہ قائم ہو چکے تھے، جن میں یہ علوم پڑھائے جاتے تھے اور ہر شخص اُن سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا، البتہ علومِ قدیمہ کس مپرسی کے عالم میں تھے اور اُن کی تعلیم کا کوئی ادنیٰ بندوبست بھی نہ تھا، نیز خود اس نصاب میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا تھا کہ طالب علم میں ایسی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ مطالعہ کے ذریعے سے دوسرے علوم سے استفادہ کر سکے۔ یہ سوال دارالعلوم کے آغاز میں بھی اُبھر کے سامنے آیا تھا، ۱۲۹۰ھ کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر حضرت نانوتویؒ نے تفصیل سے اس سوال پر روشنی ڈالی ہے، فرماتے ہیں:۔

"جمیع علوم عقلیہ و نقلیہ کی تعلیم اور اُن کی استعدادوں کے حاصل کرنے کے لئے یہ مدرسہ اور مدرسہ سہارنپور بلا تامل عمدہ سامان ہے، اور انشاء اللہ تعالیٰ یہاں کے طالب علم بشرطِ تکمیل باقی علوم قدیمہ و جدیدہ بوجہ قوتِ استعداد بسہولت بہت جلد حاصل کر سکتے ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ ان مدارس میں علاوہ تعلیم مذہبی غرضِ اعظم قوتِ استعداد ہے، فقط علوم دینی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فنونِ دانشمندی کی تکمیل بھی حسبِ قاعدہ سابقہ کی گئی ہے، جس کا عمدہ نتیجہ پہلے زمانوں میں یہ ہوا تھا کہ بڑے بڑے عالم بڑی بڑی استعداد اور قوت کے اہل اسلام میں بکثرت ہوئے اسلئے ہم اس بات کو بالیقین سمجھتے ہیں کہ یہاں کے طالب علم اگرچہ بعض علوم فنون جدیدہ سے کامیاب ہوئے نہ ہوں پر اُن کے حق میں یہ اُن کی استعداد مثل استاد کامل تعلیم کے لئے کافی ہو، اور مدارس میں اگرچہ بعض علوم جدیدہ کی تعلیم کی کثرت کے باعث طالب علموں کو ایک مشق تازہ اُن علوم کی ایسی ہو جو یہاں کے طالب علوم کو نہ ہو، پر بوجہ قوتِ استعداد اہلِ انصاف کے نزدیک

بالمعنیٰ اُن علوم میں بھی ان مدارس کے طالب علموں سے زیادہ ہی یہاں کے طالب علم سمجھے جائیں گے۔

بایں ہمہ اگر بالفرض بوجہ مشق نہ ہونے بعض علوم جدیدہ کے کچھ نقصان بھی متصور ہو تو بوجہ مفقود ہونے قوتِ استعداد علمی اور نہ ہونے علم دینی کے ان مدارس کے طالب علم بدرجہا یہاں کے طالب علموں سے ناقص ہونے چاہئیں۔

اب ہم اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوجائے کہ درباب تحصیل یہ طریقہ خاص کیوں تجویز کیا گیا اور علوم جدیدہ کو کیوں نہ شامل کیا؟ منجملہ دیگر اسباب بڑا سبب اس بات کا تو یہ ہے کہ تربیت عام ہو یا خاص ہو اُس پہلو کا لحاظ چاہئیے جس طرف سے ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو، سوا اہلِ عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری ترقی پر ہے، ہاں علوم قدیمہ کا ایسا تنزل ہوا کہ کبھی نہوا ہوگا، ایسے وقت میں رعایا کو مدارس علوم جدیدہ کا بنانا تحصیل لاحاصل نظر آیا اور صرف بجانب علوم نقلی اور نیز ان علوم کی طرف جن سے استعداد علوم مروجہ و استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے ضروری سمجھا گیا۔

دوسرے یہ کہ زمانہ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعث نقصان استعداد رہتی ہے، ہاں بعد تحصیل فنون دانشمندی جس کو خاص تحصیل استعداد ہی کیلئے تجویز کیا ہے اگر اور فنون قدیمہ وجدیدہ کو حاصل کیا جائے گا تو البتہ مقدار زمانہ تحصیل برابر رہے گا اس تقدیم و تاخیر سے مطلب بخوبی حاصل ہوگا اور استعداد ہر علم کی بخوبی حاصل ہوگی، اس لئے علومِ نقلیہ اور اُن کے ساتھ علومِ دانشمندی کو داخل تحصیل کیا، اس کے بعد طلبا مدرسہ ہذا مدارسِ سرکاری میں جا کر علومِ جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ موئد ہوگی۔[1]

---

[1] روداد ۱۲۹۰ھ ص ۱۵ و ۱۶

ایک دوسرے موقع پر اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ دارالعلوم میں علوم جدیدہ شامل نصاب نہیں ہیں فرماتے ہیں :۔

"یہاں علوم دنیویہ کی تعلیم کا چنداں اہتمام نہیں تو اس کا جواب اوّل تو یہ ہے کہ مرض کا علاج چاہیئے جو مرض نہ ہو اس کی دَوا کھانی فضول ہے، دیوار کے رخنہ کو بند کرنا چاہیئے، بھڈّہ کا بھرنا لازم ہے، جو اینٹ ابھی گری نہیں اس کی فکر بجز نادانی اور کیا ہے مدارس سرکاری اور کس لئے ہیں ان میں علومِ دنیوی نہیں پڑھائے جاتے تو اور کیا ہوتا ہے"[1]

طریقِ درس

دارالعلوم کے طریقِ درس کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :۔

ابتدائی ــــــــــ متوسط ــــــــــ اعلیٰ

ابتدائی درجات میں اساتذہ کے پیشِ نظر یہ بات رہتی ہے کہ طلبار میں کتاب کے مضامین سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے، اس لئے کتاب فہمی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

متوسط درجات میں کتاب فہمی کے ساتھ زیرِ درس کتاب کے علاوہ اس فن کے ایسے مباحث بھی زیرِ بحث لائے جاتے ہیں جو طلبار کے ذہن میں وسعت پیدا کرنے اور اُنکے ذہنی معیار کو بلند کرنے کے لئے ضروری ہوں۔

اعلیٰ درجات میں زیرِ درس فن کی تعلیم و تفہیم پر مکمل زور دیا جاتا ہے، مگر اسی کے ساتھ کتاب فہمی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔

دارالعلوم کا طریقِ تعلیم یہ ہے کہ پہلے طالب علم کتاب کی عبارت پڑھتا ہے، اُستاد کا

---

[1] روداد ۱۲۹۲ھ ص ۱۳

فرض یہ ہے کہ پڑھی ہوئی عبارت پر فنی حیثیت سے اس جامعیت کے ساتھ تقریر کرے جس میں متعلقہ عبارت کے ہر پہلو اور مسئلہ پر روشنی پڑ جائے، اُستاد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کی بحث میں موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات آجائیں، اور وہ اپنی تقریر کو عبارت پر منطبق کر کے طالب علم کو مطمئن کر دے، طلبہ درس میں بالکل آزاد ہوتے ہیں اور انکو اس بات کا مستحق سمجھا جاتا ہے کہ جب تک سبق کو پوری طرح سمجھ نہ لیں اور جتنے اعتراض مسائل زیرِ درس کے متعلق اُن کے ذہن میں آئیں، اُن کا اطمینان بخش جواب اُستاد سے سن نہ لیں اُستاد کو آگے بڑھنے نہ دیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف تو طالب علم پوری محنت کے ساتھ درس میں شریک ہوتے ہیں اور دوسری طرف اُستاد بھی پوری محنت اور توجہ کے ساتھ پڑھانے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے۔

عموماً زیرِ درس کتابوں کے اسباق میں اساتذہ کی توجہ اس امر پر مرکوز رہتی ہے کہ طلبہ میں کتاب فہمی کی استعداد پیدا ہو جائے اور انھیں مصنف کے منشار کو سمجھنے کا طریقہ معلوم ہو جائے۔

علم الحدیث میں مشکوٰۃ المصابیح کے علاوہ حسب ذیل کتب نصاب میں داخل ہیں:۔
صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مؤطا امام مالکؒ، مؤطا امام محمدؒ، شرح معانی الآثار طحاوی، شمائل ترمذی

مذکورہ بالا کتب میں اوّل الذکر چار کتابوں کو بالاستیعاب ختم کرایا جاتا ہے اور ان کے مضامین پر پوری بحثیں ہوتی ہیں، بقیہ کتابوں کا استیعاب ضروری نہیں ہے، اساتذہ ان کتابوں کے چند اسباق میں اس قسم کی تقریر کر دیتے ہیں جس سے اس کتاب کا منشار معلوم ہو جاتا ہے، اوّل الذکر اور مؤخر الذکر کتابوں میں چونکہ احادیث کا بیشتر حصہ مشترک ہوتا ہے اس لئے اُن کے سبق میں ہر ہر حدیث پر جُداگانہ بحث کی ضرورت نہیں ہوتی۔

حدیث کے درس میں رُواتِ حدیث پر جرح و تعدیل سے متعلق بقدرِ ضرورت مختصر

بحث ہوتی ہے۔ اس کے بجائے فنِ حدیث پر توجہ زیادہ دی جاتی ہے تاکہ استنباطِ مسائل اور طریقِ استخراج کی قوت زیادہ سے زیادہ طلبہ میں پیدا ہوجائے اور وہ ائمہ فقہ کے طریقِ استنباط کو پوری طرح سمجھ سکیں۔ البتہ اگر کسی سند یا راوی کی نسبت ائمہ مذاہب کو خصوصی توجہ کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے تو اس کو زیرِ بحث لایا جانا دورانِ سبق میں ناگزیر ہوتا ہے۔

مگر ائمہ اربعہ کے دلائل، اُن کے اصولِ استخراجِ مسائل اور احناف کی جانب سے ائمہ ثلاثہ کے دلائل کے جوابات اِس سنجیدہ اور علمی طریق سے طلبہ کے ذہن نشین کرائے جاتے ہیں کہ ائمہ اربعہ میں سے کسی امام کی وقعت وعظمت کم نہیں ہونے پاتی، بلکہ نہایت وسعت نظر کے ساتھ ائمہ ثلاثہ کے دلائل وبراہین طلبہ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، چونکہ اکثر کتب حدیث وتفسیر جو دارالعلوم کے نصاب میں شامل ہیں وہ شوافع اور مالکیہ کی مدون کی ہوئی ہیں، اس لئے اُن ائمہ کے دلائل تو لازمی طور پر طلبہ کے سامنے آجاتے ہیں، اس وجہ سے اساتذہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ احناف کے مسلک کو دلائل وشواہد کی روشنی میں اس طرح پر راجح قرار دیں تاکہ ائمہ ثلاثہ کی مجتہدانہ عظمت اپنی جگہ پر برقرار رہے اور اس میں کوئی فرق رونما ہونے پائے۔

بڑی جماعت کے باذوق طلبہ متقدمین کی روش کے مطابق استاد کی تقریر کو قلم بند کرنا ضروری خیال کرتے ہیں، چنانچہ حضرت گنگوہیؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کے درسِ ترمذی کی تقریر نفع الشذی اور الورد الشذی اور حضرت مولانا سیّد محمد انور شاہؒ کے درس صحیح بخاری کی تقریر العرف الشذی اور فیض الباری جو چار ضخیم جلدوں میں ہے اسی ذوقِ املا کا نتیجہ ہیں، اس طرح کی املائی تقریروں میں سے یہ چند مثالیں ہیں جو زیورِ طبع سے آراستہ ہوچکی ہیں، ورنہ جو دعوتِ طباعت کے انتظار میں ہنوز چشم براہ ہیں اُن کا شمار بھی مشکل ہے، متاعِ علمی کے یہ جواہر ریزے بکثرت فضلائے دارالعلوم کے

پاس موجود ہیں۔

اُستاد کی تقریر و تعلیم اُردو میں ہوتی ہے، جو پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، البتہ جو طلبہ اُردو نہیں سمجھتے ان کو دوسری زبانوں میں سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے تاآنکہ وہ اُردو سمجھنے کے قابل ہوجائیں۔

علوم و فنون کی تعلیم میں مادری زبان کو جو اہمیت حاصل ہے اس کو عصری نظامِ تعلیم میں بڑی مدّت کے بعد سمجھا جاسکا ہے، یہ حقیقت ہے کہ علمی مسائل جس آسانی سے مادری زبان میں سمجھ میں آتے ہیں اور حافظے میں محفوظ رہتے ہیں وہ دوسری زبان میں ممکن نہیں ہے، مگر انگریزی اقتدار کے غلبے نے قوم کے دماغوں کو اس قدر متأثر اور مغلوب کردیا تھا کہ وہ ایک عرصے تک اس حقیقت کا سُراغ نہ پاسکی، ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت کو سب سے پہلے جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن اور جامعۂ ملّیہ دہلی نے محسوس کیا اور اس پر عمل درآمد شروع کردیا، جس میں دونوں جگہ نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور اُنھوں نے دوسری یونیورسٹیوں کے لئے ایک قابلِ تقلید مثال پیش کردی، اور اب تو ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی جانب سے یہ مطالبہ عام طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے کہ ذریعۂ تعلیم مادری زبان قرار دی جائے۔

بہرحال اس سلسلے میں اوّلیت کا سہرا دارالعلوم ہی کے سَر ہے، دارالعلوم میں جس چیز کو سو سال پہلے سمجھ لیا گیا تھا، بیسویں صدی کے ماہرینِ تعلیم بھی بالآخر اُسی نتیجے پر پہونچنے کے لئے مجبور ہوئے[۱]۔

---

[۱] یہ تو اس مسئلہ کا تعلیمی پہلو ہے، لیکن اس کے علاوہ اس کا ایک لسانی پہلو بھی ہے، وہ یہ کہ دارالعلوم میں اُردو زبان کے درسی زبان ہونے سے اُردو کو جو عظیم الشان فائدہ پہونچا ہے گو اُس پر اُردو کی ترقی و اشاعت کے حلقوں کی ابھی تک نظر نہیں گئی ہے۔ تاہم اس کے نتائج و ثمرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ یہ ہے کہ دارالعلوم چونکہ عالمِ اسلامی کے مُسلمانوں کی مرکزی درسگاہ ہے (باقی آئندہ صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور اس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے علاوہ مختلف ممالک کے طلبہ تحصیلِ علم کی غرض سے آتے ہیں، وہ اپنے دورانِ قیام میں خاصی اُردو سیکھ جاتے ہیں، چنانچہ چند سال کی بات ہے کہ ایک صاحب جنھوں نے مختلف ممالک کی سیاحت کی تھی، دارالعلوم میں آئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ :۔

"میں جب بخارا پہنچا جو وسط ایشیا کا مشہور مقام ہے تو وہاں ایک ایسے شخص سے میری ملاقات ہوئی جس نے مجھے ہندوستانی سمجھ کر ہمدردانہ لہجے میں اُردو میں مجھ سے گفتگو کی، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ہندوستان سے اس قدر دور اتنی صاف اُردو اس کو کیوں کر آئی ہوگی؟ میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ "یہ دارالعلوم کا فیضِ تعلیم ہے"۔ اور یہیں ہی نہیں بلکہ یہاں کا علمی حلقہ بالعموم اُردو سمجھتا اور بولتا ہے، اس شخص نے نہایت اخلاق و محبت سے میرے ہندو ہونے کے باوجود مجھے اپنے یہاں مہمان ٹھیرایا اور میرے اعزاز میں ایک شان دار استقبالیہ دیا جس کی یہ خصوصیت میں کبھی نہ بھولوں گا کہ اُس میں جس نے بھی تقریر کی وہ میری خاطر سے اُردو میں ہی کی"۔

غرض کہ اس طرح دارالعلوم نے اُردو کے دائرے کو اپنے طلبار کے ذریعے سے دنیا کے تقریباً تمام ایشیائی ممالک تک وسیع کر دیا ہے!

اسی طرح کا ایک واقعہ پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ اُن کے دورۂ روس کے موقع پر پیش آیا تھا۔ پنڈت نہرو کو تاشقند کے ہوائی اسٹیشن پر وہاں کے باشندوں کی طرف سے جو سپاسنامہ پیش کیا گیا وہ اُردو میں تھا جسے وہاں کے ایک اُزبک نے پڑھ کر سنایا، پنڈت نہرو نے سپاس نامے کا جواب بھی اُردو ہی میں دیا۔ جسے اخبارات کے بیان کے مطابق حاضرین نے سمجھا اور جوابی تقریر کے دوران اُنھوں نے متعدد مرتبہ تالیاں بجائیں۔

(روزنامہ الجمعیۃ ۱۸ر جون ۱۹۵۵ء صفحہ اوّل، تفصیل کے لئے دیکھئے پروفیسر ہمایوں کبیر دارالعلوم دیوبند میں، مرتبہ:۔ سید محبوب رضوی)

اس کے علاوہ دیوبند میں ۶۰ سے زیادہ مکتبے ہیں جو اُردو کی بے شمار دینی کتابیں ہمیشہ شائع کرتے رہتے ہیں۔

دارالعلوم کی تعلیمی خصوصیات

تعلیم جس قدر سادہ اور مختصر سا لفظ ہے اتنا ہی اہم اور روح کی گہرائی تک کو متأثر کرنے والا ہے، تعلیم محض نقوش حروف، خطوط آواز، بولیوں اور چھوٹی بڑی کتابوں کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی ذہنی ودماغی اور علمی تربیت کا نام ہے جس کے ذریعے انسان کی فطری قوت وصلاحیت کو اُبھار کر سنوارنا اور منظم کرنا ہے، اور انسانی جذبات وحسیات کو ایک عمدہ اور اعلیٰ نصب العین کے تحت لاکر مہذب اور شائستہ بنانا ہے، تاکہ نوع انسانی کے لئے مفید ثمرات ونتائج بروئے کار لائے جاسکیں، انسان کو اُس کی اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال سکھانا بہت دشوار ہے، اور جس قدر دشوار ہے اُسی قدر ضروری بھی ہے۔

بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اگر تعلیم صرف نہ جانی ہوئی چیزوں کی واقفیت تک محدود ہے تو کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، لیکن اگر اُسے عمل کا پابند بنا دیا جائے تو پھر اس کی دشواریاں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں، اگرچہ علم کی قدر دنیا کی ہر قوم کرتی ہے، لیکن علم کی نسبت مُسلمانوں کا جو نظریہ ہے، وہ دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہے، غیر مُسلم علم اس لئے حاصل کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے دنیا میں قوت وعظمت اور ترقی وبرتری حاصل کریں علم کو عام طور پر حصولِ دولت کے لئے وسیلہ سمجھا جاتا ہے، مگر مُسلمانوں کی یہ خصوصیت ہے کہ انھوں نے علم کو وسیلے کے بجائے مقصد سمجھا ہے، ذریعۂ معاش نہیں سمجھا، مُسلمانوں نے ہمیشہ علم کو علم کے لئے سیکھا ہے، انھوں نے علم کو کبھی اسلئے حاصل

نہیں کیا کہ اس کے ذریعے معاش حاصل کریں۔ مسلمانوں کے نزدیک حصولِ علم ایک فرض ہے جس کو پورا کر کے مسلمان علاوہ دنیوی مفاد کے اُخروی نجات بھی حاصل کرتا ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَۃٍ یعنی ہر مسلمان مرد و عورت پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔

یہ فرضیت عمل ہی کے لئے ضروری قرار دی گئی ہے، اور ہر شخص پر بقدرِ ضرورت واجب ہے۔ تاریخ کی یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک سربلند نہیں ہو سکی جب تک اس میں علم و عمل کی قوتیں بیدار نہیں ہوئیں۔ تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی بدولت روحانی اور اخلاقی، تمدنی اور تہذیبی ترقی ہو سکتی ہے، جو انسانی تخلیق کا مقصدِ اعلیٰ ہے۔ ایسی ترقی کے پیشِ نظر یہ ضروری ہے کہ ہر طالب علم کو اس کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کی بہتر سے بہتر طریقے پر نشوونما کر سکے۔ بالفاظِ دیگر معاشرے کا فرضِ اولین یہ ہے کہ وہ تمام ایسی سہولتیں مہیا کر دے جس سے ہر طالب علم اپنے بہتر سے بہتر جوہر دکھا سکے۔ درحقیقت علم سے قومیں بنتی ہیں اور جہل سے بگڑتی ہیں۔ بنا بریں ضروری ہے کہ ہر شخص کو تعلیم حاصل کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ اسلام نے علم کو سماج کے مخصوص طبقوں کی اجارہ داری سے نجات دلا کر انسانیت پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

ہر ترقی حاصل کرنیوالی قوم کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اس کی ترقی کا راز اس قوم کے عوام کے تعلیم یافتہ ہونے میں مضمر ہوتا ہے، اور یہ اس وقت تک آسان نہیں جبتک تعلیم کا مفت انتظام نہ ہو، موجودہ طریقۂ تعلیم میں مصارف کی گراں باری نے اکثریت کو تعلیم کے فوائد سے محروم کر دیا ہے، صدہا برس کے تجربے کے بعد بیسویں صدی کے ماہرین تعلیم بالآخر اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ عوام کی تعلیم مفت ہونی چاہیئے، اور جب تک یہ طریقہ اختیار نہ کیا جائے گا، تعلیم کا عام ہونا مشکل ہے۔

ہمارا قدیم نظامِ تعلیم

ہمارے قدیم تعلیمی نظام میں ہمیشہ سے اسی اصول پر عمل درآمد رہا ہے، چنانچہ ان مدارس میں تعلیم کا جو نہج اختیار کیا گیا تھا اس میں تعلیمی مصارف کو طلبار کے بجائے درسگاہوں کے ذمّہ رکھا گیا ہے۔ اس تعلیمی نظام میں تعلیم پر کوئی فیس عائد نہ تھی، اور نہ صرف یہ بلکہ طلبار کے لئے زیرِ درس کتابوں کا انتظام بھی مُفت ہوتا تھا، پھر نہ صرف یہ کہ تعلیم مفت تھی اور قیام گاہ (بورڈنگ ہاؤس) کا کوئی کرایہ نہیں لیا جاتا تھا، بلکہ نادار اور غریب طلبار کو درسگاہوں کی جانب سے کھانا، کپڑا اور دوسری ضروریات کے لئے نقد وظائف بھی دیئے جاتے تھے، مدارس عربیہ کی یہ وہ خصوصیت ہے جس کی مثال دنیا کے کسی تعلیمی نظام میں نہیں پائی جاتی۔

اس کے علاوہ مدارس عربیہ میں حصولِ علم پر کبھی کوئی ایسی پابندی بھی عائد نہیں کی گئی جس کے ذریعے قوم کے کچھ افراد پر تعلیم و تعلّم کے دروازے بند کر دیئے گئے ہوں، بلکہ ان میں ہر وہ شخص جس کو اکتسابِ علم کا کچھ بھی ذوق ہوتا بغیر کسی رکاوٹ کے علم حاصل کر سکتا تھا، عمر اور پیشے کی قید سے ہمارے مدارس ہمیشہ آزاد رہے ہیں، اور ان میں رنگ و نسل، امیر و غریب اور اونچ نیچ کے مابین کوئی امتیازی فرق روا نہیں رکھا گیا، اس بنار پر ہر شخص کے لئے خواہ وہ کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو اور کتنا ہی کم مقدور کیوں نہ ہو، بلا تکلّف اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی راہیں ہمیشہ کھلی رہی ہیں، مُسلمانوں کی علمی تاریخ میں بے شمار ایسے علمار و فضلا ملیں گے جو آبائی طور پر مختلف ادنیٰ و اعلیٰ پیشوں سے تعلق رکھتے تھے، مدارس دینیہ میں تعلیم کو زیادہ سے زیادہ قیود و شرائط سے آزاد رکھے جانے کا اصول پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

ادنیٰ پیشوں سے تعلیم کی پابندی اٹھانا دنیا نے مُسلمانوں ہی سے سیکھا ہے، اور جس چیز کا سہرا آج یورپ کے سَر باندھا جا رہا ہے، درحقیقت یہ مدارسِ عربیہ ہی کا پَرتو ہے البتہ عمر کی قید اٹھا دینے کا فلسفہ ابھی دنیا کو ان مدارس سے سیکھنا باقی ہے، چناں چہ

"تعلیم بالغان" کی شکل میں اس کی داغ بیل پڑ چکی ہے[1]۔ اب وہ زمانہ زیادہ دور نہیں معلوم ہوتا جبکہ دنیا کی یونیورسٹیوں سے یہ لعنت اٹھادی جائے گی۔

مفت تعلیم

ہمارے قدیم نظامِ تعلیم کی یہی روایات دارالعلوم کا طرۂ امتیاز ہیں، یہاں بھی طلبار سے فیس نہیں لی جاتی، غیر مستطیع اور ضرورت مند طلبار کو دارالعلوم کی جانب سے کھانا، کپڑا اور نقد وظائف دیئے جاتے ہیں، زیرِ درس کتابیں اور قیام کے لئے جگہ ہر مستطیع وغیر مستطیع طالبعلم کیلئے مُفت مہیا کی جاتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دارالعلوم کی تعلیم صرف دولت مندوں کے ساتھ مخصوص نہیں رہی ہے، بلکہ غریب سے غریب شخص بھی اس کے ذریعے سے اپنے بچّوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرسکتا ہے، اس کا فیض عام اور بقدر استعداد تام ہے۔

دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں وہ پہلی تعلیم گاہ ہے جو مفت تعلیم (FREE EDUCATION) کی بنیاد پر قائم ہوئی، دارالعلوم ایک صدی سے زیادہ مدّت سے اس مفت نظامِ تعلیم کو کامیابی کے ساتھ چلا رہا ہے

تعلیمی آزادی

برطانوی دورِ حکومت میں دارالعلوم وہ پہلی درس گاہ ہے جس نے "آزاد طریقِ تعلیم" کو پیش کیا۔ اور سیاسی غلامی کی فضا میں ملّت کی ذہنی آزادی کو برقرار رکھنے کی جدوجہد کی، اگرچہ یہ کام بہت مشکل تھا مگر دارالعلوم نے اس پر عمل کرکے اس مشکل کو آسان بنادیا، دارالعلوم نے حکومت برطانیہ کی پیش کش کے باوجود کبھی اس کی امداد قبول نہیں کی، اس لئے وہ بہت سی ایسی پابندیوں سے آزاد

---

[1] تعلیم بالغان کے سلسلے میں امریکہ کے مقام ڈینور کو بڑی شہرت حاصل ہے، کہا جاتا ہے کہ یورپ اور امریکہ میں تعلیم بالغان کا آغاز ڈینور کے اسکول سے ہوا ہے۔ یہ اسکول ۱۹۱۶ء میں قائم ہوا تھا۔

رہا ہے جو سرکاری "زرِ امداد" کے ساتھ ساتھ آنی لازمی ہیں، بعض لوگوں کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ جب حکومت دارالعلوم کو گراں قدر مالی امداد دینے پر آمادہ تھی تو اس کو قبولِ امداد میں احتراز و انکار مناسب نہ تھا. قوم خواہ کتنی ہی فیاضی دکھائے مگر پھر بھی وہ حکومت کی بیش قرار امداد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ان لوگوں کی نظر غالباً اس امر پر نہیں گئی کہ مدارسِ عربیہ کو حکومت کے اثر سے اس لئے آزاد رکھنا ضروری ہے کہ حکومت خواہ مسلمانوں ہی کی کیوں نہ ہو جب تک وہ خالص اسلامی طرز کی حکومت نہ ہو اس کی سیاست بے لاگ اور بے غل و غش نہیں ہو سکتی، اور مدارس عربیہ کے لئے ایسی تعلیم درکار ہے، جو ہر قسم کے غیر اسلامی اثر اور خارجی عمل دخل سے بالکل آزاد ہو، دارالعلوم دیوبند نے کبھی حکومتِ وقت سے امداد حاصل نہیں کی، اس کا تمام تر سرمایہ اعتماد علی اللہ ہے، دارالعلوم صرف مسلم عوام کے بھروسے پر دین کی خدمت میں منہمک رہا ہے، اور لیل و نہار کی تیز و تند گردشوں کے باوجود اپنی قدیم شان اور روایات کے ساتھ قائم ہے۔

آج ہماری قومی بدقسمتی سے تعلیم کا مقصد یہ ہو کر رہ گیا ہے کہ اس کے ذریعے سے کوئی اچھی اور پُرمنفعت ملازمت حاصل کر کے معقول روزی کمائی جائے، گویا تعلیم کا مفہوم ہی سرے سے بدل ڈالا گیا ہے، اور "علم برائے علم" کے بجائے اب صرف حصولِ معاش کے دوسرے بہت سے ذرائع کی طرح یہ بھی ایک ذریعہ بن کر رہ گیا ہے، حالانکہ شرفِ علم کا قدرتی تقاضا ہے کہ اس کا نصب العین بلند ہو، بے شبہ دنیاوی علوم و فنون اس لئے حاصل کئے جا سکتے ہیں کہ ان کے ذریعے سے دنیاوی ترقی حاصل کی جا سکے، لیکن اگر اس نصب العین کو صرف اپنے ذاتی مفاد تک محدود کر دیا جائے اور اپنی ہی منفعت سامنے رکھی جائے، تو یہ خود غرضی ہے، علم جیسی گراں قدر دولت کو صرف اپنی اغراض پر خرچ کرنا علم کی عظمت کو نہ پہچاننا ہے، دنیاوی علوم و فنون حاصل کرنے کا مقصد یہ بھی ہونا چاہیئے کہ اس کے ذریعے سے پوری قوم کے سرمائے کو ترقی دی جا سکے، اور یہ نہ صرف اپنے

عروج و ترقی کا بلکہ ملک و ملّت کی ترقی کا ذریعہ بن سکے ۔

مدارس عربیہ کے طلبار کے سامنے حصولِ علم کا مقصد اور نصب العین اللہ تعالےٰ کی رضا جوئی اور اس کی مخلوق کی بہترین خدمت ہے، شاگرد اُستاد کو اُستاد ہی سمجھتے ہیں، اُستادی اور شاگردی کی قدیم حدود و مراتب کا پوری طرح لحاظ رکھتے ہیں ، شاگرد اپنے اُستاد کا ویسا ہی ادب کرتے ہیں جیسے اپنے والدین کا، اساتذہ کی خدمت کو ہر طالب علم باعث ازدیادِ علم و برکت تصوّر کرتا ہے !

اسلامی تاریخ کا یہ زرّیں واقعہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ بغداد میں جب مدرسہ نظامیہ قائم ہوا، اور اس کے اساتذہ اور طلبار کے لئے گراں قدر مشاہرے اور وظائف مقرر ہوئے ، اور حکومت کی جانب سے ہر قسم کا سامانِ آسائش مہیا گیا گیا تو علمار بخارا نے "زوالِ علم" کی مجلسِ ماتم منعقد کی اور اس پر اظہارِ افسوس کیا کہ اب علم، علم کے لئے نہیں! جاہ و ثروت کے لئے حاصل کیا جائے گا، ظاہر ہے کہ جس شخص کے سامنے علم کا یہ اعلیٰ مقصد نہ ہوگا، وہ عصری علوم کے بجائے دارالعلوم کا رُخ ہی کیوں کرے گا، جس کی سند کی قیمت حکومت کی نظر میں تقویم پارینہ سے زائد نہیں ہے ۔

ایک مرتبہ صوبہ متحدہ کے گورنر سرجیمز مسٹن نے دارالعلوم کے معائنہ کے دوران دیوبند سے دور دراز کے ایک طالب سے سوال کیا تھا :۔

" اتنی دور سے تمہارے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے ؟

طالب علم نے بے ساختہ جواب دیا کہ :۔

"میں یہاں اس لئے پڑھنے آیا ہوں ، تاکہ واپس جا کر اپنے وطن کے لوگوں کی دینی خدمت انجام دے سکوں "

دارالعلوم کے نصابِ تعلیم سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ "السنۂ شرقیہ" کے سرکاری امتحانات "مولوی فاضل" وغیرہ کے معیار سے کہیں زیادہ بلند پایہ ہے، اس لئے اگر

دارالعلوم چاہتا تو حکومت سے بآسانی اپنی سند کو "مولوی فاضل" کے مساوی تسلیم کرا سکتا تھا، مگر اس نے اپنی سند کو سرکاری محکموں کی ملازمت کے لئے "پروانہ راہ داری" بنانے کے بجائے اس امر کو زیادہ مناسب سمجھا کہ وہ طلبار میں ایسی علمی قابلیت و فضیلت پیدا کرنے کی سعی کرے کہ لوگ اس کے طالب علم اور اُس کی سند کو دیکھتے ہی یہ باور کرلیں کہ یہ کوئی کام کی چیز ہے، اور یہ شخص دین کے جس کام کو اپنے ذمّہ لے گا اس کو قابلیت اور خوش اسلوبی سے انجام دے سکے گا۔

دارالعلوم کے نصابِ تعلیم میں اس بات کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ اس کے ذریعے سے طالب علم اسلام کی روحانی اور اخلاقی قدروں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم و فنون میں بھی پورے طور پر دست رس اور مہارت حاصل کر سکے تاکہ یہاں سے نکلنے کے بعد ملّت کی مخلصانہ قیادت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کا اہل ہو جائے اور اسلامی دعوت و تبلیغ کی جدوجہد میں اہم کردار ادا کر سکے، دارالعلوم میں طلبار کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اُن کی تعلیم کا مقصد ڈگریاں حاصل کرنا یا سرکاری ملازمتوں اور عہدوں کے لئے تیاری کرنا ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ ایک خالص دینی تعلیم ہے، ہندوستان کے سیاسی اور جغرافی حالات کا تقاضہ ہے کہ مُسلمانوں میں ایک ایسی جماعت موجود رہنی چاہیئے جو اعلار کلمۃ اللہ اور احیار سنّت کے لئے ہمیشہ سرگرم عمل رہے، خدا کا شکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند اپنے اس تعلیمی مقصد میں کامیاب ہے، اس درس گاہ سے ہزاروں کی تعداد میں ایسے علمار و مبلّغین و مصنفین و قائدین نکلے ہیں جنھوں نے دارالعلوم کے اس مقصد سے کبھی گریز نہیں کیا ہے۔

حدیثِ نبوی، کتاب اللہ کی شرح و تفسیر اور اسلامی قانون کا دوسرا اہم ماخذ ہے، دارالعلوم دیوبند نے بیشتر دینی و دنیوی علوم کی خدمت انجام دی ہے، مگر اس میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت حدیث کے درس کو حاصل رہی ہے، دارالعلوم

کا درسِ حدیث روایت و درایت اور تفقہ کے تمام اصول کا جامع رہا ہے، یہاں کوشش کی جاتی ہے کہ حدیث کی شرح اور اس کے متعلقہ مباحث پر ایسی تفصیل طلبار کے سامنے آجائے جس سے احادیثِ نبوی کی جمع و تطبیق، ترجیح و تاویل میں طلبار کو اپنی آئندہ زندگی میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس اعتبار سے درسِ حدیث میں دارالعلوم دیوبند اپنی ایک انفرادی شان رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم کا دارالحدیث تمام دینی مدارس میں احترام و عظمت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند اپنے تعلیمی نظام کی وسعت، اتباعِ سنّت میں پختگی اور علوم و فنون میں کامل رسوخ کی بنار پر برِصغیر میں واحد تعلیم گاہ کی حیثیت رکھتا ہے، خصوصاً حدیث نبوی کی تعلیم میں ایک منفرد اسلوب کا حامل ہے، دارالعلوم دیوبند کی اس خصوصیت نے اسے دوسری تمام تعلیم گاہوں سے ممتاز بنا دیا ہے، اس کے دارالحدیث میں ہر سال تین چار سو طلبارِ حدیث کا اجتماع رہتا ہے، جو دنیا کے مختلف حصّوں سے محض حدیث کی تعلیم کے لئے یہاں آتے ہیں، ان طالبانِ حدیث میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو دوسرے مدارس سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں اور صرف اس لئے یہاں آتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کی مخصوص اعلیٰ تعلیم سے بہرہ مند ہوسکیں۔

دارالعلوم دیوبند، ہندوستان، پاکستان، برما، بنگلہ دیش اور افغانستان وغیرہ ملکوں کے دینی مدارس کی سربراہی کرتا ہے، اور بہت سے مدارس طریقۂ تعلیم اور اندرونی نظم و نسق میں دارالعلوم دیوبند کی تقلید کرتے ہیں۔

دارالعلوم کو حکومت کی اعانت اور سرکاری مداخلت سے بالکل علیحدہ اور آزاد رکھا گیا ہے، برطانوی حکومت کی جانب سے تعلیم و تربیت کا جو نظام اُس زمانے میں جاری کیا گیا تھا وہ نہ صرف یہ کہ اسلامی نصب العین اور عقیدے سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا بلکہ مُسلمانوں کے لئے سخت مضر تھا۔ اگر اس کو قبول کر لیا جاتا تو ہماری موجودہ نسل محض یہی

نہیں کہ اسلام سے بے بہرہ ہوتی بلکہ عجب نہیں کہ وہ اسلام سے منحرف اور باغی ہوچکی ہوتی دارالعلوم کے اکابر نے بروقت اس خطرے کا احساس کیا، اور سیاسی غلامی کے باوجود ذہنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے قدیم نظامِ تعلیم کی از سرِ نو بنیاد ڈالی تاکہ اس نصاب کی تعلیم سے فارغ ہونے والے طلبار ایک مردِ مومن کی حیثیت سے زندگی کے عملی میدان میں قدم رکھ سکیں۔

اوقاتِ تعلیم

جیساکہ عموماً مدارسِ عربیہ کا معمول ہے دارالعلوم میں بھی درس کے اوقات دو حصوں پر تقسیم ہیں، پہلا حصہ چار گھنٹے کا ہے اور دوسرا دو گھنٹے کا، موسمِ گرما میں صبح ۶ بجے سے ۱۰ بجے تک اور بعد ظہر ۳ ½ بجے سے ۵ ½ بجے تک اور موسمِ سرما میں صبح کو ۸ بجے سے ۱۲ بجے تک اور بعد ظہر ۲ بجے سے ۴ بجے تک درس کے اوقات ہیں۔ دارالعلوم میں تعلیمی گھنٹہ پورے ۶۰ منٹ کا ہوتا ہے، موسم کے تغیر کے ساتھ تدریجاً اوقات بدلتے رہتے ہیں، یعنی چھ سے سوا چھ، اور دو سے سوا دو۔ اسی طرح آٹھ سے پونے آٹھ اور ساڑھے تین سے سوا تین۔

عام طور سے شوال میں داخلے کے بعد اوائل ذی قعدہ سے اسباق شروع ہوجاتے ہیں، اور آخر رجب تک جاری رہتے ہیں۔ شعبان میں سالانہ امتحان ہوتا ہے جو تقریباً تین ہفتے تک جاری رہتا ہے، شعبان کے آخری ہفتے سے عام تعطیل ہوجاتی ہے، جو شوال کے پہلے ہفتے تک رہتی ہے، دوسرے ہفتے سے داخلہ شروع ہوجاتا ہے، جمعہ: ہفتہ وار تعطیل کا دن ہے۔

✣

قواعدِ داخلہ

دارالعلوم دیو بند کا دروازہ ہر اُس طالب علم کے لئے کھلا ہوا ہے جو دینی علوم حاصل کرنا چاہتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ وہ دارالعلوم کے مقاصد اور اس کے تعلیمی نصب العین سے اتفاق کرتا ہو اور دارالعلوم کے اصول و قوانین کی پابندی کا مکمل عزم لے کر داخلے کا خواستگار ہو اور اس کی زندگی اسلامی قدروں سے ہم آہنگ ہو، ان شرائط کے ساتھ اُس کا داخلہ اُس درجے میں ہو سکتا ہے جس کی وہ استعداد اور صلاحیت رکھتا ہے۔

بالعموم داخلہ شوال کے دوسرے ہفتے سے شروع ہو کر تیسرے ہفتے کے آخر تک ہوتا ہے لیکن جدید طلبار کا داخلہ اس سے کسی قدر پیشتر بند ہو جاتا ہے۔

داخلے کے وقت جدید اُمیدوار استعداد کے مطابق جس جماعت کے قابل سمجھا جاتا ہے، اس میں داخلہ کیا جاتا ہے۔ کسی دوسری درس گاہ کی سند کی بنار پر داخلہ نہیں ہو سکتا، البتہ جو طلبار درجاتِ فارسی سے ترقی پاکر درجۂ عربی میں داخل ہوتے ہیں وہ داخلے کے امتحان سے مستثنیٰ ہیں۔

درجۂ قرآن مجید اور درجۂ فارسی میں داخلہ درخواست کے ذریعے اور درجۂ عربی میں مطبوعہ فارم کے ذریعے ہوتا ہے، فارم داخلہ کی دو قسمیں ہیں قدیم اور جدید، قدیم سے وہ طلبار مراد ہیں جنھوں نے سال گزشتہ میں دارالعلوم ہی میں پڑھا ہو، اور نو وارد طلبار کو "جدید" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

فارم داخلہ کے ذریعے طالب علم اس امر کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ مستعدی اور یکسوئی کے ساتھ تحصیلِ علم میں مشغول رہے گا۔ اور دارالعلوم کے مروجہ قوانین کی پوری پابندی کرے گا۔ اور اپنی وضع قطع، نشست و برخاست اور نوشت و خواند وغیرہ امور میں طالبعلمانہ

وضع ومعاشرت کا پابند رہے گا۔

داخلے کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہے، البتہ اُن بیرونی کم سن بچوں کو جو دارالاقامہ میں تنہا نہ رہ سکیں داخل نہیں کیا جاتا۔ کسی پیشے کی بنا پر کوئی ایسی پابندی بھی نہیں ہے، جس کے سبب سے قوم کے کچھ افراد پر تعلیم و تعلّم کے دروازے بند ہو جائیں۔ بلکہ ہر وہ شخص جس کو اکتسابِ علم کا کچھ بھی ذوق ہو وہ بغیر کسی رُکاوٹ کے علم حاصل کر سکتا ہے۔ عمر اور پیشے کی قید سے مدارس عربیہ ہمیشہ آزاد رہے ہیں، اور ان میں رنگ و نسل، امیر و غریب اور اونچ نیچ کا کوئی امتیازی فرق روا نہیں رہا ہے۔ اس بنا پر ہر شخص کے لئے خواہ وہ کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو اور کتنا ہی کم مقدور کیوں نہ ہو بلا تکلّف اعلیٰ سے اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کی راہیں ہمیشہ کھلی رہی ہیں۔ مسلمانوں کی علمی تاریخ میں بے شمار ایسے علماء و فضلاء ملیں گے جو آبائی طور پر مختلف ادنیٰ و اعلیٰ پیشوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ایسے لوگ جنھیں اُن کے پیشوں کی وجہ سے دنیا میں نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، مدارس عربیہ کی بدولت اُنھوں نے علم حاصل کر کے علمی اور سیاسی میدانوں میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ہیں اُن سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ آج جس چیز کو یورپ کی دین سمجھا جاتا ہے اس کی اوّلیت کا شرف درحقیقت ہمارے مدارسِ عربیہ کو حاصل ہے۔

☆

درجاتِ تعلیم

درجاتِ تعلیم کی تفصیل نصاب کے ساتھ پیش کی جا چکی ہے، اس لئے یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔

امتحانات

یہ کہنا تو آسان نہیں ہے کہ مدارسِ عربیہ میں امتحانات کا طریقہ عموماً مروج تھا، تاہم بعض مدارس کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ اُن میں طلبار کا سالانہ امتحان لیا جاتا تھا، چنانچہ بیجاپور کی تاریخ بُستان السلاطین میں وہاں کے مدارس کے حالات میں لکھا ہے کہ :-

"امتحان بتاریخ سلخ ذی الحجہ می شد"[1] یعنی ذی الحجہ کے ختم پر طلبار کا امتحان ہوتا تھا۔

ایک دوسری جگہ اسی کتاب میں امتحان سالانہ ہونے کی بھی تصریح ہے۔

"ہر سال امتحان می شد"[2]

مگر قیامِ دارالعلوم کے قریبی زمانہ میں یہ رواج متروک ہو چکا تھا، اور مدارس عربیہ میں سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحان کا طریقہ جو طالب علم کی استعداد اور محنت و جانفشانی کے اندازہ کرنے کا ایک عمدہ ذریعہ ہے، مروج نہیں تھا، طالب علم جب اُستاد سے ایک کتاب پڑھ چکتا تو اس سے مافوق دوسری کتاب بغیر امتحان لئے شروع کرادی جاتی تھی، ظاہر ہے کہ اس میں طالب علم کی استعداد کے جانچنے اور پرکھنے کا کوئی موقع نہ تھا اور بسا اوقات ناقابل طالب علم بھی ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا تھا، دارالعلوم نے اس نقص کو محسوس کرتے ہوئے اس طریقے کو ختم کر کے سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحان کو لازمی قرار دیا۔

دارالعلوم میں امتحان کے سلسلے میں جو قواعد مروج ہیں وہ بھی کافی سخت ہیں، یہاں پرائیویٹ امتحان کا قاعدہ نہیں ہے۔

ہندوستان کے مدارس میں غالباً بیجاپور ہی کی یہ خصوصیت تھی کہ وہاں سالانہ

---

[1] و [2] بحوالہ مُسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد اوّل ص ۳۴۱

امتحان ہوتا تھا ورنہ دوسرے مدارس کے متعلق تاریخ میں سالانہ امتحان کا کوئی ذکر نہیں ملتا، اور یہ تو بالکل یقینی ہے کہ دارالعلوم کے قیام کے متصل زمانے میں ہندوستان میں سالانہ امتحان کا قطعاً رواج نہ تھا۔

قوانینِ امتحانات

امتحان جو طلبار کی تعلیمی استعداد اور اساتذہ کی محنت وجاں فشانی کے اندازے کا معیار ہے اور جس پر ترقی درجات کا انحصار ہے بہت ضروری چیز ہے۔ لیکن دارالعلوم کو جس طرح حکومت کے اثر سے بالکل علیٰحدہ رکھا گیا ہے اسی طرح امتحان میں کسی قسم کی بیرونی مداخلت کو بھی پسند نہیں کیا گیا، نصابِ تعلیم خود اس کا اپنا مجوزہ ہے، اور امتحانات بھی وہ خود ہی اپنی نگرانی میں لیتا ہے۔

امتحانات دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک امتحان داخلہ، یہ ان طلبار کا ہوتا ہے جو کسی دوسرے مدرسے سے آکر دارالعلوم میں داخل ہونا چاہیں، یہ امتحان عموماً شوال میں ہوتا ہے، اس امتحان میں خاص سختی برتی جاتی ہے، اور بسا اوقات نصف سے زائد طلبار ایسے ہوتے ہیں جن کو امتحان داخلہ میں ناکام ہونے کے باعث واپس ہوجانا پڑتا ہے، دوسرا امتحان خواندگی ہوتا ہے، یہ سال میں تین مرتبہ لیا جاتا ہے، سہ ماہی ماہ صفرالمظفر میں، ششماہی ماہ جمادی الاولیٰ میں اور سالانہ رجب کے آخری ہفتہ سے شروع ہوکر شعبان کے عشرۂ دوم میں ختم ہوتا ہے۔

امتحانات میں انتہائی احتیاط اور سخت ترین نگرانی کی جاتی ہے، پہلے اور دوسرے سال کے تمام اور تیسرے سال کی چند کتابوں تک امتحان زبانی سوال وجواب کے ذریعے لیا جاتا ہے، اوپر کی جماعتوں کا امتحان تحریری ہوتا ہے، سوالات کے پرچے نہایت احتیاط

اور رازداری کے ساتھ چھپوائے جاتے ہیں۔

امتحان میں جوابات کے لئے چار گھنٹے وقت دیا جاتا ہے، نشستیں متعین ہوتی ہیں، اور اس میں خاص اہتمام رکھا جاتا ہے کہ طالب علم ایک دوسرے بات نہ کرنے پائیں، خلاف ورزی کی صورت میں امتحان سے محروم کردیا جاتا ہے۔

امتحان کے مفروضہ نمبر ۵۰ مقرر ہیں، درجات امتحان کی تفصیل یہ ہے، ۳۰ سے ۳۶ تک درجۂ ادنیٰ، ۳۷ سے ۴۳ تک درجۂ متوسط، ۴۴ سے ۵۰ تک درجۂ اعلیٰ۔

اس موقع پر یہ معلوم رہنا چاہیئے کہ دارالعلوم سے پہلے ہندوستان میں جتنے تعلیمی مرکز تھے ان کی حیثیت بالعموم شخصی درس گاہوں کی تھی اور یہ امر سب میں بطور قدرِ مشترک کے تھا کہ نہ ان میں جماعت بندی تھی، نہ حاضری کے رجسٹر ہوتے تھے، نہ طلباء کو مجبور کیا جاتا تھا کہ فلاں کتاب اور فن کے ساتھ فلاں کتاب اور فن کا لینا ضروری ہے، مطلق آزادی تھی جس کا جو جی چاہتا تھا پڑھتا تھا، اور جب تک چاہتا پڑھتا، تعلیم کی کوئی مدّت معین نہ تھی، اور امتحان کا بھی کوئی خاص دستور نہ تھا، جماعت بندی مدّتِ تعلیم، حاضری اور امتحان کے التزام اور تناسب مضامین وغیرہ امور کے اجراء کی اولیّت دارالعلوم ہی کو حاصل ہے، اور یہیں سے مدارس عربیہ میں یہ امور بتدریج رواج پذیر ہوئے ہیں۔

تعلیمی وظائف

مدارسِ عربیہ میں تعلیم پانے والے طلباء اکثر و بیشتر غریب اور نادار ہوتے ہیں، اُنکے سرپرستوں میں اتنی استطاعت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے نونہالوں کی تعلیم و تربیت میں روپیہ خرچ کر کے ان کو تعلیم و تہذیب سے آراستہ کرسکیں۔

ہر ترقی کرنے والی قوم کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اُس کی ترقی کا راز اس قوم

کے عوام کے تعلیم یافتہ ہونے میں مضمر ہوتا ہے، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک تعلیم کا مفت انتظام نہ ہو، چنانچہ صدہا برس کے تجربے کے بعد بیسویں صدی کے بڑے بڑے ماہرینِ تعلیم بالآخر اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ عوام کی تعلیم مفت ہونی چاہیئے، اور جب تک یہ طریقہ اختیار نہ کیا جائے گا، تعلیم کا عام ہونا مشکل ہے، جدید تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ صرف اُن لوگوں کے لئے خاص ہوکر رہ گئی ہے جو اپنے اخراجات کے خود متحمل ہوسکیں گویا عصری تعلیم کے حصول میں غریبوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

لیکن ہمارے قدیم تعلیمی نظام میں تعلیمی مصارف کو طلبار کے بجائے درسگاہوں کے ذمّے رکھا گیا ہے، اس تعلیمی نظام میں تعلیم پر کوئی فیس نہیں لی جاتی، اور نہ صرف یہ بلکہ طلبار کے لئے زیرِ درس کتابوں کا انتظام بھی مفت کیا جاتا ہے، بلکہ نادار اور غریب طلبار کو درسگاہوں کی جانب سے کھانا کپڑا اور دوسری ضروریات کے لئے نقد وظائف بھی دیئے جاتے ہیں، دارالعلوم میں شروع ہی سے اس امر کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ غریب اور نادار طلبار کے قیام و طعام، لباس، مصارف علاج اور دوسری لازمی ضروریات کے تکفل کا بار طلبار کے بجائے دارالعلوم کی جانب سے برداشت کیا جائے، اِلایہ کہ جو طلبار خود اپنے تکفل پر قدرت رکھتے ہوں۔

مگر اجرائے وظائف میں یہ لحاظ رکھنا ناگزیر ہے کہ طلبار میں تعلیمی اُمور سے بے رغبتی اور مفت خوری کی عادت پیدا نہ ہونے پائے، اور وہ ہمہ تن تعلیمی مشاغل میں منہمک رہیں، اس لئے تمام وظائف ایک سال کے لئے جاری کئے جاتے ہیں، سال آئندہ میں ان کی ازسرِ نو تجدید کرانی ہوتی ہے، طالب علم اگر کسی وقت بھی امتحان میں ناکامیاب ہوتا ہے تو وظیفہ بند کر دیا جاتا ہے، اور جب تک وہ اجرائے امداد کے قانون کے مطابق اوسط درجے کی کامیابی امتحان میں حاصل نہ کرلے وظیفہ جاری نہیں ہوتا، البتہ دارالاقامہ میں قیام کے لئے جگہ اور کتب خانہ سے سال متعلقہ کی زیرِ درس کتابیں بلا تخصیص مستحق و غیر مستحق

ہر طالب علم کو مستعار طریقے پر مُفت دی جاتی ہیں۔

وظیفہ حاصل کرنے کے لئے حسبِ ذیل شرائط مقرر کی ہیں:۔

الف طالب علم کم از کم النحو الواضح اور شرح تہذیب وغیرہ کتب (جو دوسرے سال میں پڑھائی جاتی ہیں) پڑھ چکا ہو۔

ب مذکورہ کتب کے امتحان میں پچاس نمبروں میں کم از کم ۳۰ نمبر حاصل کئے ہوں، جو کامیابی کا درجۂ اوسط ہے۔

ج غربت کی وجہ سے امداد کا طلب گار ہو۔

وظیفے کی دو قسمیں ہیں، کھانا ——— اور ——— نقد

کھانے کے انتظام کے لئے مطبخ ہے، جس سے ہر طالب علم کو ایک وقت میں دو تنوری روٹیاں دی جاتی ہیں جو ۲۵۰ گرام (خشک) آٹے کی ہوتی ہیں، دوپہر کو دال اور شام کو کھانے میں گوشت دیا جاتا ہے۔[1]

کھانے کے علاوہ مختلف مقدار میں نقد وظائف بھی دیئے جاتے ہیں جو پچاس روپے ماہانہ تک ہوتے ہیں

یہ دونوں قسم کے وظائف دارالعلوم کی اصطلاح میں "امداد" کہلاتے ہیں، جن طلباء کی "امداد" جاری ہو جاتی ہے ان کو سال بھر میں چار جوڑے کپڑے دو جوڑی جوتے اور سردی کے موسم میں لحاف ——— بھی دیا جاتا ہے۔

حجروں میں روشنی اور کپڑوں کی دھلائی کے لئے ماہانہ وظیفہ مقرر ہے؛ بیمار طلباء کے علاج کے لئے معالج مقرر ہیں۔ طلباء کو دوا مُفت مہیا کی جاتی ہے، اور کھانا پرہیزی ملتا ہے۔

ان امور کے علاوہ احاطۂ دارالعلوم کی تمام گزرگاہوں میں روشنی، اقامت گاہوں میں

---

[1] اگر طالب علم چاہے تو طعام کے بجائے اس کی نقد قیمت بھی لے سکتا ہے۔

پانی کے نل اور موسمِ سرما میں مسجدِ دارالعلوم میں گرم پانی کا انتظام التزام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

دارالعلوم میں داخل تمام طلباء کو کتب خانے سے زیرِ درس کتابیں کسی معاوضے کے بغیر ایک سال کے لئے مستعار دی جاتی ہیں، طالب علم کو مالی امداد ملتی ہو یا نہ ملتی ہو دونوں صورتوں میں اس سے دارالاقامہ کے کمرے کا کوئی کرایہ نہیں لیا جاتا۔

تقسیم انعام

طلباء میں تعلیمی مشاغل کی نسبت ترغیب و تحریص اور باہم دگر مسابقت کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے سالانہ امتحان میں کامیابی پر طلباء کو مستحقِ انعام سمجھا جاتا ہے، جو طالب علم اعلیٰ نمبروں سے پاس ہوتا ہے اُسے خصوصی انعام دیا جاتا ہے، انعام میں طالب علم کی استعداد کے مطابق درسی وغیر درسی کتابیں دی جاتی ہیں۔

دارالعلوم میں بعض دوسرے امور کی طرح شروع ہی سے تقسیم انعام کا بھی رواج ہے۔ تقسیم انعام کے عنوان سے ہر سال جو جلسہ منعقد کیا جاتا ہے اس میں مقامی لوگوں کے علاوہ بیرونی مقامات کے لوگوں کو بھی دعوتِ شرکت دی جاتی رہی ہے۔ اس اجتماع کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمان عموماً اور چندہ دہندگان خصوصاً اس بات کا اندازہ کرسکیں کہ انھوں نے اپنی جس نوخیز نسل کو دارالعلوم کے سپرد کیا تھا اس کے تعلیمی نتائج کیا برآمد ہوئے، نیز یہ کہ قوم نے جو روپیہ دارالعلوم کو دیا ہے، اُس کے مصرف کا منظر وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

تصدیق نامہ اور سند و دستار

جو طلبا ر نصابِ دار العلوم کی تکمیل کر کے سالانہ امتحانوں میں کامیابی حاصل کر چکتے ہیں ان کو فراغتِ تعلیم کے بعد سند دی جاتی ہے، سند میں ہر پڑھی ہوئی کتاب کے نام کے اندراج کا التزام رکھا جاتا ہے، مگر جس کتاب کے امتحان میں تیس نمبر سے کم ہوں وہ داخل سند نہیں کی جاتی۔

درجہ فارسی، درجہ تجوید اور شعبۂ طب کی علیحدہ علیحدہ سندات ہیں، جو طلبار تکمیل سے قبل درمیان میں دار العلوم چھوڑ دیتے ہیں ان کو امتحان میں کامیاب کتب کا تصدیق نامہ بھی دے دیا جاتا ہے، درجہ چہارم پاس کر لینے پر "عالم" کی سند اور درجۂ ہشتم کی تعلیم ختم کرنے کے بعد "فاضل" کی سند دی جاتی ہے۔

سند میں ان کتابوں کے ناموں کے علاوہ جن کا امتحان دیا جا چکا ہے، طالب علم کی علمی ذہنی استعداد اور حسنِ قابلیت کا ذکر ہوتا ہے اور اس بات کی شہادت دی جاتی کہ اس نے دار العلوم میں تعلیم پائی ہے، علوم و فنون میں مہارت رکھتا ہے، درس و تدریس اور افتار کا اس کو حق حاصل ہے، اس کے علاوہ اس کے اخلاق، چال چلن کے متعلق بھی اظہارِ رائے کیا جاتا ہے، سند مطبوعہ ہوتی ہے، جو مہتمم اور اساتذہ کے دستخط اور دار العلوم کی مہر سے مزین ہوتی ہے۔

جو طلبا علوم و فنون میں امتیازی استعداد کے مالک ہوتے ہیں اُن کو سند دینے کے علاوہ قدیم درسگاہوں کے معمول کے مطابق مجمع عام میں اساتذہ کے ہاتھوں سے اُن کے سروں پر دستار باندھی جاتی ہے جو مدارسِ عربیہ کی اصطلاح میں "دستارِ فضیلت" سے موسوم ہے۔

انگریزی تعلیم سے مسلمانوں کا اجتناب

ہندوستان کے علماء اور بالخصوص علمائے دارالعلوم کے خلاف یہ الزام شہرت پاگیا ہے کہ انھوں نے انگریزی تعلیم کے خلاف فتویٰ دے کر مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے باز رکھا، جس کی وجہ سے مسلمان دنیوی ترقی کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ گئے، یہ الزام صحیح نہیں ہے، علمائے کرام صرف ایسے نصابِ تعلیم کے مخالف تھے جو مسلمانوں کو الحاد اور بے دینی کی طرف لے جانے والا ہو، خود علی گڑھ میں یہ خطرہ محسوس کیا جا رہا تھا، چنانچہ اس کے سدِ باب کے لئے وہاں دینیات کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا گیا، اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے داماد مولانا عبداللہ انصاری کو طلب کیا گیا تو دیوبند کی جانب سے فوراً اس پیش کش کو قبول کر لیا گیا، مولانا عبداللہ انصاری تاحیات اس منصب پر فائز رہے، بعدازاں ان کے فرزند مولانا احمد میاں انصاری اس منصب پر مامور کئے گئے، یہ بھی دارالعلوم کے فاضل تھے، ظاہر ہے کہ مخالفت کی صورت میں یہ بات ممکن نہ تھی۔

حضرت مولانا نانوتویؒ نے ان طلباء کی نسبت جو مدارس عربیہ سے فارغ ہو کر سرکاری اسکولوں میں داخل ہونا چاہیں ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء کے جلسۂ انعام کی تقریر میں ایسے طلباء کی ان الفاظ میں حوصلہ افزائی فرمائی ہے:-

"اگر طلبا مدرسہ ہٰذا مدارسِ سرکاری میں جا کر علومِ جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ مؤید ہوگی"[1]

بعض لوگوں کے اِس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ دارالعلوم کے نصاب تعلیم میں

---

[1] روداد دارالعلوم ۱۲۹۰ھ ص ۱۶

علومِ جدیدہ کو کیوں شامل نہیں رکھا گیا ؟

فرماتے ہیں :-

"اگر یہ خیال سدِ راہ ہے کہ یہاں علومِ دنیوی کی تعلیم کا چنداں اہتمام نہیں تو اس کا جواب اوّل تو یہ ہے کہ مرض کا علاج چاہیئے، جو مرض نہ ہو اس کی دوا کھانی فضول ہے، دیوار کے رخنے کو بند کرنا چاہیئے بھٹے کا بھرنا لازم ہے، جو اینٹ ابھی گری نہیں اس کا فکر بجز نادانی کے کیا ہے، مدارسِ سرکاری اور کس لئے ہیں ؟ ان میں علوم دنیوی نہیں پڑھائے جاتے تو اور کیا ہوتا ہے ؟ یہ مدارس اگر قدرِ ضرورت سے کم ہوتے تو مضائقہ نہ تھا، مگر سب جانتے ہیں کہ سرکار کی توجہ سے شہر تو شہر گاؤں میں بھی مدارس جاری ہو گئے ہیں، ان کے ہوتے اور مدارس علوم دنیوی کا اہتمام کرنا اور علوم دینی سے غفلت کار عقل دور اندیش نہیں"[1]

درحقیقت ہمارے اسلاف نے دوسری قوموں کے علوم و فنون کو اپنانے میں اس وقت بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی جب وہ نصف دنیا پر اپنی عظمت و اقتدار کا پرچم لہرا رہے تھے، مسلمانوں نے ماضی میں نہ صرف ارسطو و افلاطون اور دوسرے یونانی حکماء کے فلسفے کو اپنا لیا تھا، بلکہ بقراط اور جالینوس کے طبی ذخیروں کے مالک بھی بن گئے تھے، اقلیدس اور بطلیموس کی تحقیقات ان کی زندگی کا دلچسپ مشغلہ بن گئی تھی، ہندوستان کی ریاضی بھی عربی سانچے میں ڈھل گئی تھی، اسی طرح عربی زبان میں ایک نئے ادب، تاریخ، فلسفہ و حکمت، طب، ریاضی، ہیئت، نجوم، کیمیا اور طبعیات وغیرہ فنون کی بنیادیں پڑیں، جو آج تہذیب و تمدن کا مایہ ناز سرمایہ ہے، ان علوم کو مسلمانوں نے اس طرح اپنایا کہ وہ آج اجنبی محسوس ہونے کے بجائے اسلامی علوم معلوم ہوتے ہیں، علوم و فنون کے حاصل کرنے

[1] روداد ۱۲۹۲ھ ص ۱۳

میں مسلمان ہمیشہ فراخ حوصلہ رہے ہیں، تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ مسلمانوں نے یونان اور ہندوستان کے علوم وفنون کو نہ صرف سیکھا ہے بلکہ انھیں ترقی بھی دی ہے

علماء کی نسبت یہ ایک شدید غلط فہمی ہے۔ انگریزی تعلیم کو کبھی ناجائز اور حرام نہیں کہا گیا۔ بلکہ وہ تہذیب اور کلچر جو انگریزی تعلیم کے ساتھ لازمی قرار دیا گیا تھا اور اُسی کو ترقی کا واحد ذریعہ سمجھا جاتا تھا، علماء کو صرف اس سے اختلاف تھا، مناسب ہوگا کہ یہاں اس الزام پر تاریخی حقائق کی روشنی میں غور کرکے دیکھا جائے کہ اس کی اصلیت کیا ہے؟ ٹھیک اسی زمانے میں جبکہ سرسید احمد خاں مرحوم کی تعلیمی تحریک کا آغاز تھا، فقہ حنفی کے قدیم تعلیمی مرکز فرنگی محل لکھنؤ کے یگانۂ روزگار عالم مولانا عبدالحیٔ لکھنوی نے انگریزی تعلیم کے متعلق فتویٰ دیا تھا کہ:-

"لغت انگریزی کا پڑھنا یا انگریزی لکھنا سیکھنا اگر بہ لحاظ تشبہ کے ہو تو ممنوع ہے۔ اور اگر اس لئے ہو کہ ہم انگریزی میں لکھے ہوئے خطوط پڑھ سکیں اور اُن کی کتابوں کے مضامین سے آگاہ ہوسکیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے حضرت زید بن ثابتؓ کو یہود کا خط (عبرانی) سیکھنے کے لئے حکم فرمایا اور اُنھوں نے تھوڑے ہی دنوں میں سیکھ لیا۔"[1]

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے فتاویٰ میں انگریزی پڑھنے پڑھانے کے استفتار کے جواب میں تحریر ہے کہ:-

"انگریزی زبان سیکھنا درست ہے بشرطیکہ کوئی معصیت کا

---

[1] مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحیٔؒ باب العلم والعلماء جلد سوم ص ۲۰

مرتکب نہ ہو اور نقصان دین میں اس سے نہ آئے۔[1]

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور میں حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا فتویٰ بھی یہی تھا کہ "انگریزی پڑھنا جائز ہے۔ غرض کہ علمائے کرام نے کسی زمانے میں بھی نفس تعلیم انگریزی سے کبھی اختلاف نہیں کیا، بلکہ حصولِ معاش اور علم و آگاہی کے لئے صراحتاً اُس کے جواز کا فتویٰ دیا، جیسا کہ خود عہدِ نبوّت میں حضرت زید بن ثابتؓ کی مثال سے صاف واضح ہے، البتہ جس صورت میں مختلف اسباب سے متعلم کے اعتقاد و ایمان پر اس کا اثر پڑتا ہو اور غیر اسلامی تہذیب، غیر اسلامی اخلاق اور خلاف اسلام معتقدات کے اختیار کر لینے کا ذریعہ بنتا ہو، صرف اس کو ناجائز بتلایا گیا تھا۔

واقعہ دراصل یہ ہے کہ انگریزی زبان سے مسلمانوں کے اجتناب کے متعدد اسباب تھے، سب سے پہلا سبب تو یہ تھا کہ ایک طرف تو مسلمانوں کے دلوں میں حملہ آور انگریزوں کے خلاف جنھوں نے انھیں حکومت و سلطنت سے محروم کردیا تھا شدید غیظ تھا، وہ اُن کی ہر چیز کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انگریزوں کے علوم اور تہذیب و تمدن کی نسبت مسلمانوں میں معاندانہ جذبات کا موجود ہونا بالکل قدرتی بات تھی، انھوں نے مغل سلطنت کا چراغ اپنی آنکھوں کے سامنے گل ہوتے ہوئے دیکھا تھا، شاہی خاندان کے خاک و خون میں تڑپنے کا منظر وہ آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ انھوں نے معمولی معمولی شبہات پر ہزاروں مسلمانوں کو تہ تیغ ہوتے ہوئے دیکھا تھا ہزاروں مسلمان گھرانے نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے تھے۔ اور ہزاروں شریف خاندان بے کسی اور مفلسی کے عالم میں مارے مارے پھر رہے تھے، اُنھوں نے وہ سب کچھ لٹتے ہوئے دیکھا تھا جس کو وہ اخلاق اور تہذیبِ انسانیت کا حاصل سمجھتے تھے، اور جس کے بغیر ان کی زندگی بے لطف

---

[1] فتاویٰ رشیدیہ جلد اول ص ۴۶

ہو گئی تھی، ان کی عظمت اور عزت جاتی رہی تھی، ان کو ہرگز ہرگز گوارہ نہ تھا کہ وہ اپنے نونہالوں کو انگریزی تعلیم دلائیں، اور انگریزوں سے سروکار رکھیں، اس زمانے میں غدر کے سنگین نتائج اور اس کے ردِ عمل کو نفسیاتی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، اسلام اور عیسائیت میں جو کشمکش یورپ اور مشرق وسطیٰ میں صدیوں سے چلی آ رہی تھی اب وہ اُن کے خیال میں ہندوستان تک پہنچ گئی تھی، اس لئے مسلمانوں کے دل و دماغ میں یہ بات راسخ ہو گئی تھی کہ عیسائیت اور عیسائی حکومت کو گوارہ کرنا اسلام اور مسلمانوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا، اس لئے انھوں نے اس نئی تہذیب و تمدن سے مکمل بائیکاٹ کا فیصلہ کیا اور ہر اُس چیز کو جو انگریزوں سے وابستہ تھی اسلام اور مسلمانوں کے لئے خطرے کا نشان سمجھنے لگے، ظاہر ہے کہ اُن کا ایسا سمجھنا حالات کا قدرتی ردِ عمل تھا، جس کے لئے ان کو معذور سمجھنا چاہیئے!

دوسری طرف انگریز بھی اپنا اصل سیاسی حریف مسلمانوں ہی کو سمجھتے تھے، ہر چند ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ہندو مسلمان دونوں قوموں کے افراد شامل تھے اور دونوں قوموں نے ملکر بقدرِ استعداد اس جنگ میں حصہ لیا تھا، مگر انگریز کی نظر میں اسکا اصل مدِ مقابل مسلمان ہی تھا، اسلئے انگریزوں نے تابو یافتہ ہونیکے بعد اسی کو اصل باغی سمجھ کر زیادہ سے زیادہ اپنے ظلم و استبداد کا نشانہ بنایا، ملک کی ہر بلندی اور آسودہ حالی سے مسلمانوں کو محروم رکھنے کی پالیسی اختیار کی گئی، انگریزوں کا خیال تھا کہ تعلیمی لحاظ سے مسلمانوں کو پست اور ناکارہ بنا دیا جائے تاکہ حکومت اور سربلندی کا خواب ان کے دماغوں سے نکل جائے، یہ زخم ایسا گہرا لگایا گیا تھا جو چند روز میں مندمل ہونے والا نہ تھا۔

اسی کے ساتھ ہندوستان میں پادریوں کو تبلیغِ عیسائیت کی نہ صرف اجازت تھی بلکہ حکام کی پشت پناہی بھی اُن کو حاصل تھی، اسکولوں اور کالجوں کے مدرسین عموماً پادری ہوتے تھے، انجیل کا درس لازمی تھا، اس چیز سے نہ صرف علماء کو اختلاف تھا بلکہ

کوئی عامی سے عامی مسلمان بھی ایسی حالت میں اپنی اولاد کو اسکولوں میں بھیجنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔

مولانا فضل حق خیر آبادی جن کو فتویٰ جہاد ۱۸۵۷ء کے جرم میں "کالے پانی" کی سزا دی گئی تھی لکھتے ہیں کہ:-

"انگریزوں نے تمام باشندگانِ ہند کو نصرانی بنانے کی اسکیم بنائی، اُن کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو کوئی مددگار اور معاون نصیب نہ ہو سکے گا، اس لئے انقیاد و اطاعت کے سوا سرتابی کی جرأت نہ ہو سکے گی، انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں کا باشندوں سے اختلاف تسلط و قبضے کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہوگا، اس لئے پوری جاں فشانی اور تن دہی کے ساتھ مذہب و ملّت کے مٹانے کے لئے طرح طرح کے مکر و حیلے سے کام لینا شروع کیا، انھوں نے بچوں اور نافہموں کی تعلیم اور اپنی زبان و دین کی تلقین کے لئے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کئے اور پچھلے علوم و معارف کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔"[1]

پہلے حکومت ایک محدود ادارہ ہوتی تھی جس کا تعلق زیادہ تر ملک کے نظم و نسق فوج، پولیس اور محاصل و مالیات سے ہوتا تھا، زندگی کے بہت سے شعبے اس کے دائرۂ عمل اور حلقۂ اثر سے خارج تھے، اہلِ ملک اپنے نظامِ تعلیم، تہذیب و تمدن اور اخلاق و معاشرت میں آزاد ہوتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انقلابِ سلطنت سے ضروری نہ تھا کہ تعلیم و تہذیب میں بھی انقلاب آئے، لیکن برطانوی نظامِ حکومت کا ڈھانچہ

---

[1] الثورۃ الہندیہ ص ۳۵۶ و ۳۵۷ - مطبوعہ مدینہ پریس بجنور

اس سے مختلف تھا، اس کا دائرہ عمل ملک و قوم کی پوری زندگی پر محیط اور اس کے حدود اختیارات زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھے، انگریزی تہذیب و کلچر انگریزی تعلیم کے ساتھ لازم و ملزوم بن گئے تھے اور انھیں کو ذریعۂ ترقی و تہذیب سمجھا جاتا تھا علمار صرف اس چیز کے خلاف تھے۔

جدید تعلیم سے مسلمانوں کے اجتناب میں کچھ تو انگریزی سیاست کے قصد و ارادے کو دخل رہا ہے، تاکہ مسلمان حکمرانی کے قابل نہ رہ سکیں، دوسرے خود مسلمانوں نے بھی اپنی اولاد کو بے دینی کے اندیشے سے اسکولوں میں داخل کرنے میں پس و پیش سے کام لیا ہے۔

یہ تھے وہ اسباب جو مسلمانوں کے لئے انگریزی اسکولوں اور کالجوں کی طرف جانے میں مانع ہوئے، چنانچہ جب پادریوں کی سرگرمیوں کو ان کی مسلسل ناکامیوں نے سرد کر دیا اور انجیل کی تعلیم اسکولوں کے نصاب سے خارج کر دی گئی، اِدھر اِسی کے ساتھ ساتھ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، رفتہ رفتہ قدرتی طور پر مسلمانوں کے دلوں سے انگریزوں اور انگریزی تعلیم کے خلاف نفرت کم ہوتی گئی، اور مسلمان انگریزی تعلیم پر متوجہ ہونے لگے۔

یہ ہے اس الزام کی حقیقت جس نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے دور رکھا، درحقیقت انگریزی تعلیم سے نفرت مسلمانوں کی قومی غیرت اور نفسیاتی ردِ عمل کا نتیجہ تھی، اور علمار بھی اُن ہی میں شامل تھے، مگر اس کے باوجود علمار نے وقت کے تقاضے کو پہچانا اور پوری بصیرت اور دُوراندیشی کے ساتھ انگریزی تعلیم کے جواز کا فتویٰ دینے سے کبھی گریز نہیں کیا۔

☆

بابِ ہفتم

نظم و نسق

مجلسِ شوریٰ دارالعلوم کا نظم و نسق شروع ہی سے وَاَمْرُهُمْ شُورٰی بَیْنَهُمْ کے شورائی اصول پر قائم ہے اس کے لئے ایک باختیار مجلسِ اعلیٰ ہے، جس کی تشکیل قیامِ دارالعلوم کے ساتھ ہی عمل میں آگئی تھی۔ یہ جماعت مجلسِ شوریٰ کے نام سے موسوم ہے، مجلسِ شوریٰ کی یہ ذمہ داری ہے کہ دارالعلوم کے تمام کاموں کی نگرانی و رہنمائی کرے۔

یہاں یہ بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ دارالعلوم کا آغاز جس معمولی حالت اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا تھا اُس کو دیکھتے ہوئے دارالعلوم کے نظم و نسق کا مشاورت کے اصول پر مبنی ہونا تعجب خیز معلوم ہوتا ہے، ہندوستان میں اس وقت جمہوری نظام سے لوگ عام طور پر آشنا اور مانوس نہ تھے، دارالعلوم نے اسلامی طرز پر مجلسِ شوریٰ

کی بنیاد رکھی اور اس نظام کو کامیابی کے ساتھ چلا کر قوم کے سامنے ایک عمدہ مثال قائم کردی، اس طرزِ فکر کا یہ نتیجہ نکلا کہ انتظامات میں بڑی وسعت کے ساتھ جمہوری انداز قائم ہوگیا۔ اربابِ مشورہ کے لئے جن صفات سے متصف ہونا ضروری ہے اسکی نسبت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نوراللہ مرقدہٗ نے اپنے تحریر فرمودہ دستورالعمل کی تیسری دفعہ میں یہ ہدایت فرمائی ہے:۔

"مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو، اپنی بات کی پچ نہ کی جائے، خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہلِ مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنا میں تزلزل آجائے گا۔

القصہ تہِ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس وپیش میں اسلوبیٔ مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو، اور اس لئے ضروری ہے کہ اہلِ مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں، اور سامعین بہ نیتِ نیک اُس کو سنیں یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل وجان قبول کریں گے اور نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہلِ مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے، خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد وصادر جو علم وعقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو، اور نیز اسی وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہلِ مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے اور بقدرِ ضرورت اہلِ مشورہ کی مقدار معتدبہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا، ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہلِ مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔"

جمہوری نظام کے یہ وہ عمدہ اصول ہیں جن سے بہتر کوئی دوسرا طریق کار نہیں ہوسکتا، اس تجویز سے تعمیری نکتہ چینی کی راہ کھل گئی جو کسی ادارے کی ترقی کے لئے بڑی ضروری ہے۔

دارالعلوم کی مجلس شوریٰ ایک طرف تو چندہ دینے والوں کی نمائندگی کرتی ہے، اُسے چندہ دہندگان کے شرعی وکیل کی حیثیت حاصل ہے اور دوسری جانب دارالعلوم کے آمد و صرف اور اہم انتظامی امور کے متعلق کثرتِ رائے سے اپنے فیصلے صادر کرتی ہے، دارالعلوم دیوبند کا ایک دستورِ اساسی ہے، دارالعلوم کی تمام کارروائیاں اور تمام ضروری فیصلے اس دستور کی روشنی میں طے پاتے ہیں

مجلس شوریٰ انتظامی آئین و ضوابط وضع کرتی ہے، دارالعلوم کے جملہ اوقاف اور جائدادیں اس کی تولیت و نگرانی میں ہیں اور یہی مجلس دارالعلوم کے مسلک کی حفاظت اور ملازمین کے عزل و نصب کی ذمہ دار ہے، مجلس شوریٰ کا اجلاس سال بھر میں کم از کم دو مرتبہ لازمی ہے۔

مجلسِ شوریٰ کے ابتدائی ارکان

یہ مجلس ابتداءً یعنی قیام کے وقت حسبِ ذیل سات اراکین پر مشتمل تھی

(۱) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ (۲) حضرت حاجی عابد حسین رحمۃ اللہ علیہ (۳) حضرت مولانا مہتاب علی صاحبؒ (۴) حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ (۵) حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ (۶) حاجی سیّد فضل حق صاحب (۷) شیخ نہال احمد صاحبؒ۔

مذکورۂ صدر تعداد میں اضافہ ہوتا رہا ہے، اس وقت مجلسِ شوریٰ کے اراکین کی تعداد ۱۸ ہے، مجلسِ شوریٰ کے ارکان کا انتخاب ملک کے ممتاز اور باا ثر علماء میں سے کیا جاتا ہے، دستور کی رو سے مجلسِ شوریٰ میں کم از کم گیارہ اراکین کا عالم ہونا

ضروری ہے، بقیہ دس رکن ایسے غیر عالم حضرات ہو سکتے ہیں جو انتظامی اور تعلیمی امور میں بصیرت ومہارت رکھتے ہوں، مہتمم اور صدر مدرس اپنے منصب کے لحاظ سے شوریٰ کے رکن رہتے ہیں، انعقادِ اجلاس کے لئے اراکین کی کم از کم ایک تہائی تعداد کا شریکِ اجلاس ہونا ضروری ہے۔

موجودہ مجلس شوریٰ کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔

۱ حضرت مولانا الحاج قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند
۲ " سید فخرالحسن صاحب صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند
۳ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی ندوۃ المصنفین دہلی
۴ حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی خانقاہ رحمانی مونگیر، بہار
۵ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب دفتر الفرقان، لکھنؤ
۶ حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد، قاضی منزل، میرٹھ
۷ حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی
۸ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں صاحب ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
۹ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب، مالیگاؤں ضلع ناسک
۱۰ حضرت مولانا ڈاکٹر مصطفیٰ حسن صاحب علوی، مولوی گنج، لکھنؤ
۱۱ حضرت مولانا سید فضل اللہ صاحب، اقبال منزل، ڈگی روڈ علی گڑھ
۱۲ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب، بجنور
۱۳ حضرت مولانا حکیم محمد زماں صاحب، کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ
۱۴ حضرت مولانا حامد الانصاری غازی صاحب، بمبئی
۱۵ حضرت مولانا مفتی ابوسعود صاحب عربک کالج سبیل الرشاد، بنگلور
۱۶ حضرت مولانا حکیم افہام اللہ صاحب انونہ ہاؤس سول لائین علی گڑھ

۱۷ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب مدرسہ ضیاء العلوم مانی کلاں، جون پور

۱۸ حضرت مولانا محمد سعید صاحب بزرگ سملک ڈابھیل ضلع سورت

مجلسِ عاملہ

مجلسِ شوریٰ کے ماتحت ۱۳۴۵ھ ۱۹۲۷ء سے ایک مجلس "مجلس عاملہ" کے نام سے قائم ہے، اس کے اراکین کی تعداد 9 ہے، ہر تیسرے مہینے اس کا اجلاس ہوتا ہے، اس مجلس کا کام مجلس شوریٰ کے کاموں میں اعانت و امداد بہم پہنچانا اور مجلسِ شوریٰ کے تفویض کردہ اختیارات کے مطابق دارالعلوم کے انتظامی اُمور کو عملی جامہ پہنانا ہے۔

دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ اور مجلس عاملہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اگرچہ فیصلے کے لئے کثرتِ رائے کا ضابطہ رکھا گیا ہے۔ مگر ان کے فیصلے کثرت رائے کے بجائے بالعموم اتفاق رائے سے طے ہوتے ہیں، کسی مسئلہ میں اتفاقِ رائے نہ ہو سکنے کے واقعات اتنے کم ہیں کہ ان کو نہ ہونے کے برابر سمجھا جانا چاہیئے۔

☆

باب ہشتم

شعبہ جات

دارالعلوم کا وسیع تعلیمی اور دفتری نظم ۲۳ شعبوں پر منقسم ہے، ہر ایک شعبہ جو ایک مستقل ادارے کی حیثیت رکھتا ہے اسکا ذمہ دار ناظم شعبہ ہوتا ہے، جو اپنے حدود و اختیارات کے دائرے میں رہ کر اہتمام دارالعلوم کی نگرانی میں اپنے مفوضہ فرائض انجام دیتا ہے۔ یہ شعبے بلحاظ نوعیت تین حصوں میں تقسیم ہیں، تعلیمی شعبہ جات، مالی شعبہ جات اور انتظامی شعبہ جات۔

(الف) تعلیمات، دارالافتاء، معارف القرآن، جامعہ طبیہ، تبلیغ، صنعت و حرفت، کتابت ورزش، نشریات، علمی اور تعلیمی شعبے ہیں۔

(ب) محاسبی، تنظیم و ترقی، اوقاف، مالیات کے شعبے ہیں۔

محاسبی کا تعلق آمد و صرف سے ہے، تنظیم و ترقی اور اوقاف آمدنی کے شعبے ہیں

(ج) انتظامیات سے تعلق رکھنے والے شعبے یہ ہیں:۔

اہتمام، محافظ خانہ، کتب خانہ، دارالمطالعہ، مطبخ، تعمیرات، اجلاس صدسالہ

برقیات، صفائی، روشنی آب رسانی، امور خارجہ، دارالاقامہ، پریس

شعبۂ تعلیمات

ایک تعلیمی ادارے کی حیثیت سے دارالعلوم کا بنیادی نقطۂ نظر اور اس کا اساسی مقصد تعلیم و تدریس ہے، اس لئے دارالعلوم کی تاسیس کے ساتھ اس شعبہ کا آغاز بھی سمجھنا چاہئے، جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، شعبہ تعلیمات کی ابتدا صرف ایک استاد اور ایک شاگرد سے ہوئی تھی، مگر دارالعلوم کا ہر قدم پچھلے قدم کے مقابلہ میں ترقی پذیر رہا ہے، اور اب یہ شعبہ اپنے متعدد ذیلی شعبوں پر منقسم ہے، جکی تفصیل یہ ہے۔

(۱) شعبہ عربی:۔ عربی کے ۸ سالہ نصابِ تعلیم کے لئے ہے۔

(۲) شعبہ فارسی:۔ یہ شعبہ فارسی ادب، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ اور ہندی وغیرہ کی تعلیم دیتا ہے۔

(۳) شعبہ تجوید وقرأت:۔ اس شعبہ میں قرأت و تجوید کی مکمل تعلیم کے علاوہ عربی جماعتوں کے تمام طلبہ کو لازمی طور پر پارۂ عم کی مشق تجوید کے ساتھ کرائی جاتی ہے۔

(۴) شعبہ قرآن شریف:۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، یہ شعبہ چھوٹے بچوں کو ناظرہ اور حفظ قرآن شریف کی تعلیم دیتا ہے۔

(۵) شعبہ اردو دینیات:۔ اس شعبہ کے نصاب میں اردو زبان میں دینیات کی تعلیم کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، حساب اور ہندی وغیرہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔

(۶) جامعۂ طبیہ:۔ طب کی تعلیم کے لئے ہے۔

(۹) تعلیم افتاء :۔ فتویٰ لکھنے کی صلاحیت پیدا کرانا اس شعبہ کا کام ہے۔

(۱۰) شعبۂ خوشنویسی :۔ یہ شعبہ خط کی صفائی کے ساتھ کتابت کی مشق بھی کراتا ہے۔

(۱۱) شعبہ صنعت وحرفت :۔ یہ شعبہ طلبہ کو ہلکی پھلکی صنعتیں سکھلانے کے لئے ہے۔

ان شعبہ جات میں ۶۰ اساتذہ مامور ہیں، طلبہ کی تعداد ہر سال کم وبیش ڈیڑھ پونے دو ہزار کے لگ بھگ رہتی ہے۔

طلبہ میں تقریر و تحریر کا ملکہ، خطابت، طرز ادا کی مشق اور معلوماتِ علمی کی ترقی اسلامی تبلیغ اور پیغام حق وصداقت کی اشاعت کا اہم ذریعہ ہیں، اس لئے دارالعلوم میں درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم کی طرح تحریر و تقریر کو بھی اہم ترین تمرینی جزو قرار دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں زمانے کے ماحول و مقتضیات کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ طلبہ میں مجالس و محافل کے نظم و نسق کا خاص سلیقہ ہو تاکہ وہ اپنے فرائض دعوت وارشاد کو خوش اُسلوبی کے ساتھ موجودہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے اہل ثابت ہو سکیں، اس سلسلے میں طلباء کی متعدد انجمنیں قائم ہیں، ان انجمنوں کے عموماً چار شعبے ہوتے ہیں۔

(۱) شعبہ تقریر عربی و اُردو اور دیگر السنہ

(۲) شعبہ تحریر عربی و اُردو اور دیگر السنہ

(۳) شعبہ مذاکرہ

(۴) شعبہ مطالعہ

لیکن یہ نظام اس حد تک محدود رکھا گیا ہے کہ اصل مقصد تعلیم میں کوئی فرق نہ پڑنے پائے، ہر پنجشنبہ کو شب میں طلبہ کے جلسے ہوتے ہیں، جن میں دینی و اصلاحی مسائل کے علاوہ ملّی، تاریخی، سیاسی اور عمرانی مباحث میں علمی و تحقیقی انداز میں طلبہ حصہ لیتے ہیں، اور تقریر و تحریر کی مشق کرتے ہیں، ماہانہ قلمی رسائل نکالتے ہیں، یہ رسائل اُردو، فارسی عربی، گجراتی، انگریزی، بنگلہ اور تمل وغیرہ زبانوں کے ہوتے ہیں، جن کو شیشے کے فریم

میں لگاکر دیواروں پر آویزاں کر دیا جاتا ہے، ان کے تمام مضامین ومقالات طلبار کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں اور آرائش کے لحاظ سے خاصے حسین اور دیدہ زیب ہوتے ہیں

شعبہ تعلیمات میں اساتذہ کے علاوہ تعلیمات سے متعلق دفتری کاموں کی انجام دہی کے لئے ۹ کارکن کام کرتے ہیں، شعبہ تعلیمات کی سربراہی مجلس تعلیمی کرتی ہے۔

دارالافتار

دارالعلوم جس وقت قائم ہوا اس زمانے میں پرانے علمار کی درس گاہیں ویران اور مسندیں خالی ہوچکی تھیں، علمار خال خال رہ گئے تھے، اور نوبت یہاں تک پہونچ گئی تھی کہ مسئلہ بتلانے والا بھی مشکل سے ملتا تھا، اس لئے جوں ہی دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا لوگوں کی توجہ فوراً اس کی جانب مبذول ہوگئی، اور ملک کے اطراف وجوانب سے طلب فتاویٰ کا ایک طویل سلسلہ قائم ہوگیا جیساکہ عموماً ہر ابتدائی کام میں ہوا کرتا ہے، مستقل شعبہ کے قیام کے بجائے اولاً یہ کام اساتذہ کے سپرد رہا، چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدارتِ تدریس کے ساتھ فتویٰ نویسی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، مگر جب طلبِ فتاویٰ کی تعداد غیر معمولی طور پر بڑھ گئی تو ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء میں دارالافتار کے عنوان سے مستقل شعبہ قائم کیا گیا، اور حضرت مولانا عزیزالرحمٰن صاحب عثمانیؒ کا انتخاب اس اہم خدمت کے لئے عمل میں آیا، حضرتِ ممدوح اپنے زمانے کے یگانۂ روزگار عالم اور زبردست فقیہ ہونے کے علاوہ زُہد وتقویٰ میں بھی امتیازی حیثیت رکھتے تھے، اور ایک مقدس بزرگ سمجھے جاتے تھے اس وقت سے اب تک ایسے حضرات اس خدمت پر مامور ہوتے رہے ہیں جن کو فقہ میں زیادہ سے زیادہ بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

دارالافتار سے جو فتاویٰ طلب کئے جاتے ہیں اُن میں روزمرّہ کے معمولی مسائل کے علاوہ اہم، پیچیدہ اور غور طلب مسائل، پنچایتوں کے فیصلے، عدالتوں کی اپیلیں اور مختلف الاحکام فتاویٰ کثرت سے ہوتے ہیں، دارالافتار کا فرض ہے کہ وہ دریافت

کرنے والوں کو پوری تحقیق اور صحت کے ساتھ مسائل شرعیہ بتلائے، عوام کے علاوہ علماء بھی اکثر مسائل میں اس کی جانب رجوع کرتے ہیں. اس اہمیت و نزاکت کے باوجود دارالافتاء کا کام عام اور خاص مسلمانوں میں ہمیشہ اطمینان اور وقعت کی نظر سے دیکھا گیا ہے، ۱۳۲۹ھ سے ۱۳۹۶ھ تک جو فتاویٰ دارالافتاء سے جاری ہوئے انکی تعداد ۲۶۹۴۲۳۶ ہے۔

ان فتاویٰ کی اب تک ۱۰ جلدیں "فتاویٰ دارالعلوم" کے نام سے شائع ہوچکی ہیں، اور متعدد جلدیں ابھی زیرِ ترتیب ہیں، فتاویٰ پر کوئی فیس نہیں لی جاتی، دارالافتاء کی عمارت جو تین وسیع کمروں پر مشتمل ہے، مسجد کی مشرقی جانب بالائی منزل پر واقع ہے یہ عمارت ۱۳۶۸ھ ۱۹۴۹ء کی تعمیر ہے۔

مجلس معارف القرآن

ایک شعبہ مجلس معارف القرآن کے نام سے ہے، اس شعبہ کا کام علوم قرآنی پر محققانہ کتابیں شائع کرنا ہے۔

جامعۂ طبیہ

عربی زبان کی ایک مشہور ضرب المثل ہے العلم علمان، علم الادیان و علم الابدان، یعنی علم دو ہی ہیں، ایک مذاہب کا علم جس کا تعلق روح اور تزکیۂ اخلاق سے ہے، دوسرا انسانی جسم کا علم جو صحت و مرض سے تعلق رکھتا ہے ظاہر ہے کہ یہ دونوں علم اپنی اپنی جگہ پر اہمیت رکھتے ہیں، پھر یوں بھی علم طب ایک باعزت ذریعہ معاش اور نفع رساں انسانی خدمت ہے، دارالعلوم میں دینی علوم و فنون کی طرح طب کی تعلیم کا بھی مستقل انتظام ہے۔

اس شعبے سے دو کام متعلق ہیں، طلبہ کو طبّی کتابوں کی تعلیم اور مریض طلبہ کا معالجہ، تعلیم کے لئے جامعۂ طبیہ کے نام سے مستقل طور پر طب کی تعلیم کا انتظام ہے جس میں چھ لائق طبیب طب کی تعلیم دیتے ہیں، اس کا چار سال کا نصاب ہے، طبّی امداد کے لئے جامعۂ طبیہ کا

شفاخانہ ہے، جو طلبہ وغیر طلبار سب کی مُفت طبی خدمات انجام دیتا ہے۔

شعبۂ تبلیغ ۱۳۴۲ھ ۱۹۲۴ء میں جب شُدھی اور سنگھٹن کی منظم تحریکیں ملک میں جاری ہوئیں تو مُسلمانوں کو ارتداد سے بچانے کے لئے شعبہ تبلیغ قائم کیا گیا چنانچہ اس شعبے کی ان تھک جدوجہد سے لاکھوں مُسلمانوں کے ارتداد سے محفوظ ہوجانے کے علاوہ مُسلمانوں میں دینی روح بیدار کرنے اور اسلامی اسٹپرٹ پیدا کرنے میں اس وقت بڑی مدد ملی، مبلّغین نے مُسلمانوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا آج ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں دارالعلوم کے مبلّغین نے پہنچ کر لوگوں کو کلمۂ حق نہ سُنایا ہو، لاہور کے مشہور مؤقر روزنامہ "سیاست" کا بیان اوپر گذر چکا ہے جس نے لکھا تھا کہ "جہاں تک تحفّظِ دین، تردیدِ مخالفین اور اصلاح مسلمین کا تعلق ہے دارالعلوم دیوبند کے مدرسین اور مبلّغین کا حصّہ سارے ہندوستان سے بڑھ چڑھ کر ہے"[1]

غرض کہ جس طرح دینی علوم کی تعلیم کی تاریخ میں دارالعلوم کی ہندوستان میں مثال نہیں ہے، اسی طرح تبلیغی خدمات کی وسعت وکثرت میں بھی اس کی مثال اس صدی کی تاریخ میں نظر نہیں آتی، چنانچہ ملک میں جہاں کہیں جلسے ہوتے ہیں اُن میں عموماً دارالعلوم کے مبلّغین کو خصوصیت سے بلایا جاتا ہے، شعبہ تبلیغ ملک کے مختلف علاقوں میں وہاں کے باشندوں کی دعوت پر مبلّغین کو بھیجنے کا انتظام کرتا ہے مبلغین حضرات جلسوں اور اجتماعات میں مختلف دینی موضوعات پر تقریر کرتے اور وعظ کہتے ہیں۔

شعبۂ کتابت کتابت یعنی خوش نویسی درحقیقت صنعت وحرفت کی ایک صنف ہے، دارالعلوم میں یہ دو درجوں میں تقسیم ہے، اسلئے ایک علیحدہ شعبہ سمجھا جاتا ہے، پہلا درجہ اُن طلبار کے لئے ہے جو بدخطی اور تحریری نقائص کو حُسنِ خط سے تبدیل کرنا چاہیں، دوسرے درجے میں فنِ خوش نویسی کی باقاعدہ

---

[1] روزنامہ "سیاست" لاہور ۲ جون ۱۹۲۳ء

تعلیم دی جاتی ہے۔

ہمارے قدیم تعلیمی نظام میں خط کی درستگی کو خاص اہمیت حاصل تھی " الخط نصف العلم " ایک مشہور مقولہ ہے جس میں " خط " کو نصف علم سے تعبیر کیا گیا ہے پڑھنے کے ساتھ ساتھ خط کی عمدگی کی مشق بھی نہایت ضروری سمجھی جاتی تھی، عام لکھے پڑھے لوگوں سے لیکر سلاطین تک اس میں کمال حاصل کرتے تھے، چنانچہ خود ہندوستان میں سلطان ناصرالدین محمود اور اورنگ زیب عالمگیرؒ نہایت باکمال خطاط تھے، مگراب کچھ عرصے سے جس طرح اور بہت سے قدیم تصورات معدوم ہوتے جارہے ہیں، خط کی عمدگی اور پاکیزگی کی جانب سے بھی روز بروز بے اعتنائی بڑھتی جارہی ہے، خصوصاً مدارسِ عربیہ میں تو تقریباً مفقود ہی ہوگئی ہے۔

دارالعلوم میں اس ضرورت کی اہمیت کے پیش نظر نستعلیق اور نسخ دونوں خطوں کی اصلاح اور تعلیم دی جاتی ہے، طلبہ کو مشق خط کا سالانہ امتحان دینا ہوتا ہے۔

صنعت وحرفت

درس گاہوں کے لئے طلبار کے معاشی اور اقتصادی مستقبل کا حل کرنا اس دور میں ازبس ضروری ہوگیا ہے اس سلسلے میں دارالعلوم نے کئی صنعتوں کو حصول معاش کے لئے جاری کیا ہے، طب کے علاوہ کتابت اور جلدسازی وغیرہ ہلکی پھلکی صنعتوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔

زمانے کے مقتضیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دارالعلوم میں صنعت وحرفت کے اجرار کی ضرورت عرصے سے محسوس کی جارہی تھی تاکہ فضلائے دارالعلوم صنعت و حرفت کو ذریعہ معاش بناکر استغنائے ظاہری کے ساتھ دین کی خدمت آزادی اور بے فکری سے انجام دے سکیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھا گیا ہے کہ جن صنعتوں کی تعلیم دی جائے وہ ایسی ہوں جو فی نفسہٖ طلبار وعلمار کے شایانِ شان ہوں اور

اُن کے سیکھنے میں جسمانی اعضاء کی حرکت کے ساتھ دماغی اور ذہنی فکر و تربیت بھی شامل ہو، نیز ان صنعتوں سے روزمرّہ کی انسانی ضرورتوں کی فی الجملہ تکمیل بھی ہوتی ہو، اور اسی کے ساتھ ان میں زیادہ سے زیادہ افادیت کا پہلو موجود ہو۔

صحیح دینی تعلیم کے ساتھ دارالعلوم میں ایسا ماحول پیدا کیا گیا ہے جس میں مضبوط اسلامی سیرت طلباء میں پیدا کی جاسکے اور چونکہ اس زمانے میں "روٹی کا مسئلہ" بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ طلباء کو تعلیم کے ساتھ ایسی صنعتیں بھی سکھائی جائیں جن سے ان پر کسبِ رزق کی راہیں کھل سکیں، تاکہ وہ وقت کے سیلاب میں نہ تو خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں اور نہ دین کو کسبِ رزق کا ذریعہ بنانے والوں کی طرح لوگوں کی نظر میں بے قیمت ہو جائیں، بلکہ اپنے اخلاقی وزن کو قائم رکھتے ہوئے دین کی خدمت کرسکیں اور قوم کے کام آسکیں۔

چنانچہ ۱۳۶۵ھ / ۱۹۴۶ء سے جلد سازی کے کام سے صنعت و حرفت کی تعلیم کا آغاز کردیا گیا ہے، اس شعبے میں جلد سازی اور خیاطی اور ہولڈال اور سوٹ کیس وغیرہ بنانے کی ہلکی پھلکی صنعتیں سکھلائی جاتی ہیں۔

اُمید ہے کہ مستقبل میں یہ شعبہ اپنی افادیت کے باعث طلبہ کے معاشی مستقبل کا باعزّت ذریعہ بن سکے گا۔

یہ دارالعلوم کے تعلیمی شعبے ہیں۔

شعبہ نشریات

اس شعبے سے دارالعلوم کا ماہانہ اُردو ترجمان "دارالعلوم" دیوبند اور پندرہ روزہ اخبار "الداعی" عربی میں شائع ہوتا ہے، مجلہ "دارالعلوم" اور "الداعی" کے علمی اور دینی مضامین ملک اور بیرون ملک میں مقبول ہیں، ان پرچوں کے ذریعے سے دارالعلوم کا موقف پیش کیا جاتا ہے، اور اہلِ قلم علماء کے مضامین و مقالات شائع ہوتے ہیں، اس کے علاوہ ادارہ نشرواشاعت

کے ذریعے سے دارالعلوم کی جانب سے شائع ہونے والی کتابوں کی اشاعت کی جاتی ہے۔

شعبۂ ورزش اس شعبے میں مختلف قسم کی ورزش سکھلانے کا انتظام ہے۔

شعبۂ محاسبی یہ شعبہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت اہم ہے، قیام دارالعلوم کے دوسرے ہی سال اس کی تشکیل عمل میں آگئی تھی، مالی دادوستد کے لحاظ سے اس شعبے سے دارالعلوم کا ہر شعبہ وابستہ ہے، ہر قسم کے آمد و صرف کی شعبہ وار اور مدّ وار تفصیلات رکھنا اس کے فرائض میں ہے، ادنیٰ سے ادنیٰ رقم اور معمولی سے معمولی چیز بغیر رسید کے داخل نہیں کی جاتی، اسی طرح کوئی صرف بھی بغیر واوچر کے نہیں کیا جاتا، دارالعلوم کا خزانہ اسی شعبے کے واسطے سے مہتمم صاحب کی تحویل میں رہتا ہے، حسابات کے اندراجات مروجہ حسابی طریق کے مطابق نہایت واضح اور صاف رکھے جاتے ہیں اور جانچ پڑتال کے لئے اس کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا رہتا ہے، اس کے باوجود مزید احتیاط کے طور پر رجسٹرڈ آڈیٹروں سے سالانہ حسابات چک کرائے جاتے ہیں، طلبہ کے وظائف کی تقسیم کا کام بھی اسی شعبے سے متعلق ہے، دوسرے شعبوں کے ذریعے سے جو مصارف ہوتے ہیں اُن کی جانچ پڑتال بھی محاسبی کے فرائض میں داخل ہے۔

شعبہ محاسبی کے حسابات کی عمدگی کو عام طور پر پسند کیا جاتا ہے، ایک مرتبہ کانپور کے مشہور تاجر حافظ محمد حلیم صاحب نے اپنے معائنہ میں لکھا تھا کہ:۔

> "مدرسہ کا حساب نہایت اطمینان بخش ہے، اندراج جمع خرچ باقاعدہ ہوتا ہے، اور بڑی خوبی یہ ہے کہ مُعطی کا عطیہ اس کے حسب منشاء مصارف میں خرچ کیا جاتا ہے۔"

شعبۂ تنظیم و ترقی

اس شعبے کا کام دارالعلوم کے لئے مالیہ فراہم کرنا ہے عطیات وصول کرنے کے لئے متعدد سفیر مامور ہیں، جنہیں ملک کے مختلف حصّوں کو تقسیم کر دیا گیا ہے، یہ سفراء ملک کے گوشے گوشے میں دورے کرتے ہیں، اور کم و بیش ہر جگہ سے انھیں مالی اور اخلاقی امداد ملتی ہے، یہ شعبہ ۱۳۵۵ھ سے قائم ہے، طلبار کے لئے غلے کی فراہمی کا کام بھی یہی شعبہ انجام دیتا ہے۔

شعبۂ اوقاف

اوقاف کا سلسلہ دارالعلوم کی عمارتوں کی تعمیر کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا، وقتاً فوقتاً اہلِ خیر اپنی اپنی چھوٹی جائدادیں دارالعلوم کے لئے وقف کرتے رہے، البتہ کوئی ایسی جائداد جس کے ذریعے سے دارالعلوم کے معتدبہ مصارف پورے ہو سکیں اوقاف دارالعلوم میں نہیں ہے، یہ اوقاف ہندوستان کے مختلف مقامات میں واقع ہیں۔

ادارۂ اہتمام

ادارۂ اہتمام دارالعلوم کا آئینی طور پر مرکزی نقطہ ہے، تمام شعبوں کا نظم و نسق، اُن کی نگرانی اور حسابات کی جانچ پڑتال اسی ادارے سے متعلق ہے، مجلس شوریٰ اور عاملہ کی تجاویز اور فیصلے ادارۂ اہتمام ہی کے ذریعے سے نافذ کئے جاتے ہیں، شعبوں کی داخلی نگرانی کے علاوہ دارالعلوم کے ملک سے خارجی تعلقات بھی اسی ادارے کے واسطے سے قائم ہیں، اس لئے ادارۂ اہتمام ایک خاص اہمیت کا حامل ہے، اہتمام کے اہم منصب کے لئے ہمیشہ یہ اصول مدِنظر رہا ہے کہ اس کے لئے ایسی شخصیتوں کا انتخاب کیا جاتا ہے جو علم و فضل دیانت و تقویٰ اور انتظامی امور میں خاص صلاحیتوں کی مالک ہونے کے علاوہ ملک میں خاص اثر اور وجاہت بھی رکھتی ہوں۔

ادارۂ اہتمام کی عمارت صدر دروازہ کے اوپر واقع ہے، یہ عمارت ۱۳۱۵ھ میں تعمیر ہوئی ہے۔

محافظ خانہ

دفتری حیثیت سے محافظ خانہ کو روداد دار العلوم میں "انتظام کی روح" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس شعبے میں دار العلوم کا تمام تاریخی سرمایہ محفوظ ہے، محافظ خانہ ادارۂ اہتمام سے ملحق ایک دو منزلہ کمرے میں واقع ہے، دار العلوم کے تمام شعبہ جات کے کاغذات اور دستاویزات اسی شعبے میں محفوظ رکھے جاتے ہیں، ہر شعبے کے کاغذات کے لئے ایک رنگ مخصوص کر دیا گیا ہے، مختلف رنگوں کی وجہ سے ہر شعبے کے کاغذات بآسانی پہچانے جا سکتے ہیں۔

کتب خانہ

اکابرِ دار العلوم کے سامنے تعلیم کا جو بلند معیار تھا اور طلباء کے مطالعہ و تحقیق اور تصنیف و تالیف کی جو اہم ذمہ داریاں تھیں اُن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری تھا کہ ایک اعلیٰ درجے کا کتب خانہ موجود ہو، کیوں کہ ایسے کتب خانے کے بغیر تدریس و تحقیق کا اعلیٰ معیار برقرار نہیں رکھا جا سکتا، اس غرض سے کتب خانے کے لئے دار العلوم کے قیام کے ساتھ ہی کوششیں شروع کر دی گئی تھیں۔

دار العلوم دیوبند ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۶ء میں قائم ہوا، ہندوستان میں یہ سب سے پہلا قومی اور تعلیمی ادارہ ہے جس نے حکومت پر انحصار کرنے کے بجائے اپنے مصارف کی بنیاد عوام کے چندے اور عطیات پر رکھی، طلباء کی سب سے بڑی ضرورت کتابوں کا بہم پہونچانا ہے، جس کے بغیر علم کی تکمیل ناممکن ہے، چنانچہ شروع ہی میں اربابِ دار العلوم نے عام چندے کے ساتھ ہی فراہمی کتب کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا، یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں پریس چلا ہی چلا تھا، کتابیں کم یاب اور اُن کی قیمتیں گراں تھیں، اس لئے ابتداءً یہ صورت اختیار کی گئی کہ مقامی اور گرد و پیش کے علم دوست حضرات سے طلباء کے پڑھنے کے لئے کتابیں کچھ عرصے کے لئے مستعار لے لی گئیں، ان میں درسی کتب بھی تھیں اور غیر درسی بھی، اساتذہ اور طلباء کی ترقی علم اور معلوماتِ عامّہ کے لئے عام غیر درسی کتب کی فراہمی بھی اسی قدر ضروری

ہے جتنی کہ درسی کتب کی، چنانچہ اربابِ دارالعلوم نے ملک سے اپیل کی، ملک نے دارالعلوم کی اس آواز پر لبّیک کہا، اور کتب کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا، جن لوگوں کے پاس کتابوں کا قلمی یا مطبوعہ ذخیرہ موجود تھا اُنھوں نے کتابیں دیں اور جن کے پاس کتابیں نہیں تھیں اور وہ کتب خانہ کی مدد کرنا چاہتے تھے اُنھوں نے خریداری اور فراہمیِ کتب کے لئے نقد روپے سے امداد کی، اور الحمدللہ یہ سلسلہ ایک سو جودہ سال سے اسی طرح جاری ہے، کتب خانے میں ایک عظیم تعداد ان کتب کی بھی ہے جو ترکی کے سلطان رشاد خاں، نظام دکن، سلطان ابن سعود، جمال عبدالناصر صدر عرب جمہوریہ اور حکومتِ افغانستان نے کتب خانے کو عطا کی ہیں، کتب خانہ میں زیادہ تعداد ایسی ہی کتابوں کی ہے جو دارالعلوم کو عطیے میں ملی ہیں۔

غرض اسی طرح سے کتب خانۂ دارالعلوم میں کتابوں کا ایک عظیم الشان ذخیرہ جمع ہوگیا ہے، جس میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے، ہندوستان کے بہت سے علمی خانوادوں کے علمی ذخائر کتب خانہ دارالعلوم میں منتقل ہوچکے ہیں، کتابوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد ہے، ان میں پچاس ہزار سے زیادہ کتابیں غیر درسی ہیں اور بقیہ کتابیں درسیات پر مشتمل ہیں، یہ تعداد اُن کتابوں کے علاوہ ہے جو ہر سال جلسۂ تقسیم انعام کے موقع پر ہزارہا کی تعداد میں بمدِ انعام طلباء، ہمدردانِ دارالعلوم کی جانب سے موصول ہوتی رہتی ہیں، غرض کہ کمیّت و کیفیت کے لحاظ سے ہندوستان کے کم ہی کتب خانے دارالعلوم کے کتب خانے کی برابری کرسکتے ہیں، کتابوں کی ندرت و کثرت کے باعث یہ کتب خانہ ہندوستان کے کتب خانوں میں اپنا امتیازی مقام رکھتا ہے، اس سے ہندو بیرونِ ہند کے اہل علم اور مصنّفین ہمیشہ فائدہ اُٹھاتے رہتے ہیں۔

دارالعلوم کے کتب خانے میں مطبوعہ کتابوں کے علاوہ بہت سی قلمی کتابیں بھی ہیں، ان میں کم یاب بھی ہیں اور نادرالوجود بھی ہیں، بعض کتابیں فنِ خطّاطی کے لحاظ سے

قابلِ تعریف ہیں تو بعض اپنی قدامتِ تحریر کے اعتبار سے لائقِ توجہ ہیں، بعض کتابیں خود مصنفین کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہیں، اور بعض نقاشی اور مصوّری میں اپنا جواب نہیں رکھتیں بعض شاہی کتب خانوں کی زینت رہ چکی ہیں اس لئے تاریخی اہمیت رکھتی ہیں، اور بعض وہ ہیں جو مصنّف کے اصل نسخے سے منقول ہیں یا مشہور علماء کے ہاتھوں میں رہ چکی ہیں، چند کتابیں ایسی بھی ہیں جن کے متعلق وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کا کوئی دوسرا نسخہ آج دنیا کے کسی کتب خانے میں موجود نہیں ہے، چنانچہ دنیا کی مختلف لائبریریوں نے کتب خانہ دارالعلوم کی متعدد مخطوطات کی مائیکرو فلمیں لی ہوئی ہیں، غرض کہ یہ کتب خانہ ہندوستان کے ممتاز کتب خانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

کتب خانہ دارالعلوم دو شعبوں پر منقسم ہے، ایک شعبہ درسی کتابوں کا ہے اور دوسرے میں غیر درسی کتابیں رکھی گئی ہیں، دونوں شعبوں کے انتظامات علیحدہ علیحدہ ہیں، درسی کتابیں اور اُن کی شروح وحواشی کی داد وستد کا سالانہ اوسط پندرہ ہزار کے لگ بھگ رہتا ہے۔

کتابوں کی ترتیب وتقسیم میں زبان اور فن کا لحاظ رکھا گیا ہے، یعنی ایک فن وموضوع سے تعلق رکھنے والی تمام کتابیں اس فن کے تحت رکھی جاتی ہیں اس طرح کتابوں کی تقسیم زبان وار بھی ہے اور فن وار بھی، عربی کا حال سب سے بڑا ہے، اس کے بعد اُردو کی کتابیں ہیں، اور ان سے کچھ کم فارسی کی ہیں، ان تینوں زبانوں کی کتابیں زیادہ ہیں، یہ کتابیں ترتیب وتقسیم کے لحاظ سے ۹۹ عنوانات پر تقسیم ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:-

۱ قرآن مجید	۴ تفسیر
۲ تجوید	۵ شروح وحواشی تفسیر
۳ اصولِ تفسیر	۶ احکام القرآن

۷ غریب القرآن
۸ اعراب القرآن
۹ الناسخ والمنسوخ
۱۰ اسباب النزول
۱۱ متعلقات القرآن
۱۲ استخراج الآیات
۱۳ مضامین القرآن
۱۴ تراجم قرآن اُردو
۱۵ تراجم قرآن فارسی
۱۶ اصولِ حدیث
۱۷ حدیث صحاحِ ستہ مع شروح وحواشی
۱۸ مسانید وسنن
۱۹ دیگر مجموعہ احادیث
۲۰ موضوعات احدیث
۲۱ غریب الحدیث
۲۲ اِستخراج الحدیث
۲۳ اسمار الرجال
۲۴ اصول فقہ حنفی
۲۵ اصول فقہ مالکی
۲۶ اصول فقہ شافعی
۲۷ اصول فقہ حنبلی
۲۸ اصول فقہ اہلِ حدیث
۲۹ فقہ حنفی
۳۰ فتاویٰ حنفی
۳۱ فقہ مالکی
۳۲ فقہ شافعی
۳۳ فقہ حنبلی
۳۴ فقہ علمائے ظاہر
۳۵ فقہ اہلِ حدیث
۳۶ فرائض
۳۷ علم عقائد وکلام
۳۸ حکمتِ شرعیہ
۳۹ علم تصوّف (نثر میں)
۴۰ علم تصوّف (نظم میں)
۴۱ علم تصوّف (مکتوبات)
۴۲ علم تصوّف (ملفوظات)
۴۳ اورادو وظائف اور عملیات
۴۴ مواعظ واخلاق
۴۵ عربی ادب (نثر)
۴۶ عربی ادب (نظم)
۴۷ علم معانی
۴۸ علم النحو

۴۹ علم الصفر
۵۰ تاریخ عام
۵۱ تاریخ تہذیب وتمدّن
۵۲ تاریخ العلوم والمذاہب
۵۳ سیرۃ النبی
۵۴ تراجم صحابہ
۵۵ تراجم فقہاء ومحدثین ودیگر علماء
۵۶ تذکرہ علماء دیوبند
۵۷ تراجم اولیاء کرام
۵۸ تذکرۃ الشعراء
۵۹ دائرۃ المعارف
۶۰ سفرنامے
۶۱ کوائف دارالعلوم دیوبند
۶۲ انساب
۶۳ فہرس الکتب
۶۴ مجامیع
۶۵ متفرقات
۶۶ علم طبقات الارض
۶۷ علم الکیمیاء
۶۸ علم الزراعت
۶۹ علم الاصوات والحیوانات
۷۰ کتبِ نصاب، کویت ومصر
۷۱ سیاسیات
۷۲ فلسفہ
۷۳ منطق
۷۴ ہیئت
۷۵ معاشیات واقتصادیات
۷۶ اخبار ورسائل
۷۷ عمرانیات ومعلومات عامّہ
۷۸ جغرافیہ
۷۹ طِب
۸۰ تعبیرالردیار
۸۱ کتب اہلِ کتاب
۸۲ کتب دھرم شاستر
۸۳ اصولِ مناظرہ
۸۴ کتب مختلف مذاہب
۸۵ ردِّ عیسائیت
۸۶ کتب عیسائیت
۸۷ ردِّ قادیانیت
۸۸ کتب مذہب قادیانی
۸۹ ردِّ بدعت
۹۰ کتب مبتدعین

۹۱ ردِّ روافض

۹۲ کتبِ اہلِ تشیع

۹۳ ردِّ نیچریت

۹۴ ردِّ خاکساریت

۹۵ کتب خاکساریت

۹۶ ردِّ مہدویہ

۹۷ کتب فرقۂ مہدویہ

۹۸ کتب فرقۂ بہائیہ

۹۹ ردِّ فرقۂ بہائیہ

تمام غیر درسی کتابوں کی مفصل فہرستیں موجود ہیں جن میں کتاب کا نام، نمبر، علم زبان، مصنّف کا نام، مطبع، سنِ طباعت، اگر کتاب قلمی ہے تو کاتب کا نام اور سنِ کتابت لکھا ہوا ہے، فہرست کے آخری خانے میں کتاب کے صفحات درج کئے ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ کتاب نکالنے کے لئے جدید طریقہ پر کارڈ سسٹم سے کام لیا جاتا ہے جو لائبریریوں کے مروجہ طریقے کے مطابق حروفِ تہجّی کے لحاظ سے رکھے گئے ہیں۔

کتب خانہ دارالعلوم میں عربی وفارسی اور اُردو کے علاوہ انگریزی، رومن، یونانی ترکی، انڈونیشی، سنسکرت، ہندی، ٹیمل، بنگلہ، گجراتی، گورمکھی، مرہٹی، کنڑی، پشتو پنجابی وغیرہ زبانوں کی کتابیں بھی کم وبیش مختلف موضوعات پر موجود ہیں۔

مطبوعات کے علاوہ جیساکہ اوپر بتایا جاچکا ہے، مخطوطات کا بھی خاصا ذخیرہ موجود ہے مخطوطات کی تعارفی فہرست شائع کی جارہی ہے، اس کی دو جلدیں طبع ہوچکی ہیں، پہلی جلد صرف تفسیر، حدیث، فقہ اور عقائد وکلام وغیرہ علوم کی مخطوطات پر مشتمل ہے، دوسری جلد میں تصوّف، تاریخ، معانی، ادب عربی، لغت، فلسفہ، منطق، ہیئت، صَرف، نحو، مناظرہ ریاضی، طب، متفرقات، ادب فارسی، ادب اُردو کی مخطوطات کا تعارف ہے۔

تحقیقی کام (ریسرچ) کرنے والے اہلِ علم کتب خانہ دارالعلوم کے نایاب ونادر علمی ذخیرے سے استفادہ کرنے کے لئے اکثر وبیشتر آتے رہتے ہیں۔

گزشتہ چند سالوں میں ہندوستان کے علاوہ انگلستان، جرمنی، امریکہ اور جاپان

کے متعدد ریسرچ اسکالر کتب خانہ دارالعلوم سے اپنے تحقیقی کام میں استفادہ کرتے رہے ہیں دارالعلوم کی جانب سے ایسے لوگوں کو حتی الامکان سہولت بہم پہونچائی جاتی ہے۔

کتب خانہ کی عمارت دارالعلوم کے گوشۂ جنوب مشرق میں واقع ہے، یہ عظیم الشان عمارت چھوٹے بڑے آٹھ کمروں اور تین وسیع ہالوں پر مشتمل ہے، کتب خانہ کی موجودہ عمارت کا آغاز ۱۳۲۵ھ؁ ۱۹۰۸ء؁ میں ہوا، شروع میں صرف ایک ہال اور ایک کمرہ تعمیر ہوا تھا، بعدازاں وقتاً فوقتاً اس میں اضافہ ہوتا رہا، اب یہ عمارت کافی بڑے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔

کتب خانے میں کتابوں کے علاوہ اخبارات ورسائل کے مطالعے کا بھی معقول انتظام کیا گیا ہے، کتابوں کے علاوہ قدیم اخبارات ورسائل کے فائل بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں، جن کو کتابوں کی طرح مجلد کرکے رکھا گیا ہے۔

۱۳۹۶ھ؁ میں کتب خانہ دارالعلوم مطالعہ کرنے والوں کی تعداد ۲۵۳۶۰ تھی۔

شعبۂ مطبخ

مطبخ کے قیام سے پہلے بیرونی طلبہ کے کھانے کا انتظام یہ تھا کہ کچھ طلبار کا کھانا تو اہلِ شہر کے ذمّے تھا، اہلِ خیر حضرات ایک ایک دو دو طالب علم کو کھانا دیتے تھے اور کچھ طلبار کو نقد وظیفہ دیا جاتا تھا جس سے وہ اپنے کھانے کا خود انتظام کرتے تھے، یہ دوسری صورت طلبہ کے لئے بے حد تکلیف دہ اور ان کی علمی زندگی کے انہاک میں نقصان رساں تھی اس دقّت کو رفع کرنے کے لئے نقد وظیفے کے بجائے ۱۳۲۸ھ؁ ۱۹۱۰ء؁ میں مطبخ قائم کیا گیا، پہلے سال میں صرف ۲۵ - ۳۰ طلبار کا کھانا پکتا تھا، رفتہ رفتہ یہ تعداد اب ایک ہزار تک پہنچ گئی ہے، صرف ایک طباخ سے اسکی ابتدا ہوئی تھی لیکن اب ۲۸ افراد کا عملہ اس میں لگا ہوا ہے۔

کھانا تقسیم کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ ہر طالب علم کے پاس ایلومنم کا مدوّر ٹکٹ ہوتا ہے، یہ ٹکٹ صبح وشام کے لئے علیٰحدہ علیٰحدہ ہوتے ہیں، ٹکٹوں پر صبح وشام کے الفاظ کی صراحت

کے علاوہ اختلاف رنگ کے ذریعے بھی ان کو ممیز کر دیا گیا ہے، ٹکٹوں پر نمبر کندہ ہوتے ہیں اور ہر نمبر کے صبح و شام کے لئے دو ٹکٹ ہوتے ہیں، کھانا پانے والے طلبار کے رجسٹر میں جس نمبر پر طالب کا نام درج ہوتا ہے وہی نمبر اس طالب علم کے ٹکٹ کا ہوتا ہے، اس طرح طلبار نہایت سہولت کے ساتھ کھانا حاصل کر لیتے ہیں۔

ہر طالب علم کو ایک وقت میں دو تنوری روٹیاں دی جاتی ہیں، جن کے خشک آٹے کا وزن ۲۵۰ گرام ہوتا ہے، شام کے کھانے میں گوشت پکتا ہے اور دوپہر کو دال دی جاتی ہے، ہفتہ میں ایک مرتبہ بریانی دی جاتی ہے۔ مطبخ میں قیمتاً کھانا لینے کا بھی انتظام ہے، جس میں مذکورہ بالا کھانے کے علاوہ دو اور قسم کا کھانا بفرقِ مراتب پکتا ہے، بیمار طلبار کے لئے پرہیزی کھانا بھی پکایا جاتا ہے، مطبخ کی عمارت احاطۂ دارالعلوم کے جنوبی گوشے میں واقع ہے، یہ عمارت کئی حصّوں پر منقسم ہے۔

شعبۂ تعمیرات دارالعلوم میں تعمیر عمارت کی نوعیت ہمیشہ یہ رہی ہے کہ وقتاً فوقتاً اہلِ خیر حضرات اس کی تعمیری ضروریات کی جانب توجہ فرماتے رہے اور بقدرِ آمدنی عمارتیں تیار ہوتی رہیں، یہ صورت نہیں ہوئی کہ افتتاح سے قبل عمارت کی تکمیل کر لی جائے، جیسا کہ عموماً دستور ہے کہ مجوزہ نقشے کے مطابق پہلے عمارت تیار کرائی جاتی ہے، اس کے بعد تعلیم شروع ہوتی ہے، اس کے برعکس جوں جوں ضرورت پیش آتی رہی اور اللہ کے مخلص بندے اس کی تیاری پر آمادہ ہوتے رہے، بتدریج عمارتیں تعمیر ہوتی رہیں، بالعموم ہر سال تعمیرات کا سلسلہ جاری رہتا ہے، ۱۳۸۲ھ تک دارالعلوم کی تعمیرات پر جو رقم صرف ہوئی اس کی مجموعی مقدار ۱۱ لاکھ ۱۹۸ روپے ہے۔

شعبۂ دارالاقامہ دارالاقامہ آٹھ وسیع احاطوں اور ۲۱۰ کمروں پر مشتمل ہے جن میں کم و بیش ایک ہزار طلبار کا قیام رہتا ہے، طلبار کیلئے کمروں کی تجویز و تعیین، ان کی اخلاقی نگرانی اور فصلِ خصومات دارالاقامہ سے تعلق رکھتے ہیں

جواساتذہ کے ذریعے انجام دیئے جاتے ہیں، قانون کا احترام اکابر کی اطاعت، باہمی محبت واخلاص اور رواداری طلبائے دارالعلوم کے اخلاقی نظام کے مخصوص اوصاف ہیں۔ طلبار کے نظم کی استواری اور پختگی کو دیکھ کر ایک مرتبہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، وائس چانسلر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے فرمایا تھا کہ "دارالعلوم میں جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ طلبار کا ڈسپلن ہے، کاش یہ ڈسپلن علی گڈھ کو بھی نصیب ہو" تاہم مختلف الطبائع افراد کے ایسے غیر معمولی مجمع میں خلاف طبع امور کا پیش آنا ایک طبعی بات ہے جس سے دنیا کا کوئی اجتماع مستثنیٰ نہیں ہوسکتا، اور پھر تعلیمی اداروں میں تو یوں بھی نوجوانوں کا اجتماع ہوتا ہے، جن کی زندگی اَلشَّبَابُ شُعْبَۃٌ مِنَ الْجنون کی منزل میں ہوتی ہے، جس سے بعض اوقات معمولی معمولی باتوں پر شکایت اور شکر رنجی پیدا ہوکر جنون آمیز حرکات کا صدور ہوجانا ناگزیر ہے، ایسا موقع پیش آجانے پر دارالاقامہ کا فرض ہے کہ فوری کارروائی کرے اور فریقین کے بیانات اور شہادتوں کی روشنی میں شرعی فیصلہ صادر کرے۔

شعبۂ اجلاس صدسالہ

اس شعبہ کا مقصد فضلائے دارالعلوم سے رابطہ قائم رکھنا ہے، فضلائے دارالعلوم کی دینی، علمی، معاشرتی سیاسی اور دوسری خدمات جو وہ مختلف دائروں میں انجام دے رہے ہیں اس شعبے کے ذریعے سے اُن کا ریکارڈ تیار کیا جارہا ہے، اس شعبہ کی جانب سے دارالعلوم کے ایسے نقشے ا۔ رگراف تیار کئے گئے ہیں جن سے ایک نظر میں دارالعلوم کی کارکردگی معلوم کی جاسکتی ہے، اس شعبے کے ذریعے سے دارالعلوم دیوبند کے صدسالہ اجتماع کی عظیم پیمانے پر تیاری کی جارہی ہے، مولانا حامدالانصاری غازی اس شعبے کے سربراہ ہیں۔

شعبۂ صفائی

صحتِ عامّہ بڑی حد تک صفائی پر موقوف ہے، اس لئے دارالعلوم میں صفائی کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے، صفائی کے لئے کم وبیش دس بارہ

خاکروب اور دو سقے مستقل طور پر ملازم رہتے ہیں۔

شعبۂ برقیات (روشنی اور پانی) دارالعلوم میں بجلی کی روشنی کا انتظام ہے درس گاہوں، دفاتر اور مسجد میں برقی پنکھے آویزاں ہیں، گزرگاہوں پر برقی قمقمے لگے ہوئے ہیں، شب میں طلباء کے مطالعے اور اسباق کی تکرار کے لئے چند درس گاہیں مخصوص ہیں، جن میں مقررہ اوقات میں روشنی کا انتظام رہتا ہے۔

پانی کے لئے متعدد کنویں ہیں، نیز دارالاقامہ کے احاطوں میں جا بجا بورنگ کے نل اور پائپ لگے ہوئے ہیں، مسجد کے حوض کو بھرنے کے لئے برقی موٹر لگایا ہوا ہے۔ آب رسانی کے لئے ایک ٹیوب ویل بھی ہے۔

شعبۂ اُمورِ خارجہ اس شعبہ میں بیرونی طلبہ کے پاسپورٹ اور ویزا وغیرہ کے سلسلے میں ضروری تحفظات اور عام طلباء کے لئے ریلوے کنشیسن فراہم کرانے کا انتظام کیا جاتا ہے۔

شعبہ جات میں تدریجی اضافہ دارالعلوم کا آغاز اولاً شعبۂ تعلیمات اور ادارۂ اہتمام سے ہوا تھا۔ اہتمام کا فریضہ دارالعلوم کے لئے مالیہ فراہم کرنا اور انتظامی اُمور تھے، رفتہ رفتہ حسبِ ضرورت شعبہ جات کا اضافہ عمل میں آتا رہا، آمد و خرچ کے حسابات کے لئے شعبہ محاسبی اور کتابوں کے معتدبہ تعداد میں جمع ہو جانے پر کتب خانہ کا شعبہ بڑھایا گیا، استفتاآت کی کثرت کے بعد دارالافتاء کھولا گیا، حفاظت کے لئے دربانوں کا شعبہ مقرر کیا گیا۔ طلباء کے معالجے اور مستقبل میں طلباء کی معاشی سہولت کے لئے شعبۂ طب کا قیام عمل میں آیا، عام مسلمانوں تک دینی معلومات اور مسائل پہنچانے کے لئے شعبۂ تبلیغ قائم کیا گیا، دارالعلوم کے مسلک کی اشاعت کے لئے ماہنامے جاری کئے گئے، طلباء کی غذائی سہولت کے لئے مطبخ

قائم کیا گیا، جدید عمارتوں کی تعمیر اور سابقہ عمارتوں کی مرمت کے لئے تعمیرات کا شعبہ کھولا گیا، اسی طرح تدریجاً اوقافِ دارالعلوم کی حفاظت کیلئے شعبۂ اوقاف، خط کی درستگی اور طلباء کی معاشی ضرورت کے پیشِ نظر شعبۂ کتابت، صفائی کے لئے شعبہ صفائی، کاغذات کی حفاظت و ترتیب کے لئے محافظ خانہ، ملک سے مالیہ فراہم کرنے کے لئے شعبہ تنظیم و ترقی، دارالاقامہ میں مقیم طلباء کے انتظامات کے لئے شعبہ دارالاقامہ، شعبہ روشنی و آب رسانی، طلباء میں صنعتی میلان پیدا کرنے کے لئے دارالصنائع، غیر ملکی طلباء کے انضباط کے لئے شعبہ امورِ خارجہ، فضلائے دارالعلوم کی تنظیم کے لئے شعبہ تنظیم ابنائے قدیم علمی زندگی کے لئے مجلس معارف القرآن قائم ہے جس سے اسلامی اور تاریخی موضوعات پر اب تک متعدد کتابیں شائع کی جا چکی ہیں، یہ شعبہ جات وقتاً فوقتاً عالمِ وجود میں آتے رہے ہیں۔

⁂

باب نہم

دارالعُلوم کی عمارتیں

دارالعلوم کی عمارتیں دیوبند کے شمال مغرب میں ایک طویل چہار دیواری سے گھری ہوئی ہیں، کچھ عمارتیں جو ابھی حال میں تعمیر ہوئی ہیں احاطۂ دارالعلوم میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے احاطے سے باہر بھی بنائی گئی ہیں ان سب عمارتوں کا مجموعی رقبہ ۹۲ ہزار مُربع میٹر ہے، دارالعلوم کی عمارتوں کی تعمیر کی تفصیل باب دوم میں حالاتِ سنویہ کے ضمن میں بیان کی جاچکی ہے، مگر چونکہ ان کا ذکر متفرق طور پر ہوا ہے اس لئے نامناسب نہ ہوگا کہ یہاں اجمالی طور پر ان سب عمارتوں کا یکجا ذکر کر دیا جائے، تاکہ قارئین کرام دارالعلوم کی عمارتوں کی وسعت و عظمت اور ہیئت کا کسی قدر اندازہ کر سکیں۔ اگرچہ عمارتیں کسی درسگاہ کا ضروری جزو نہیں، پہلے زمانے میں اُستاد مسجدوں اور درختوں کے سائے میں بیٹھ کر درس دیتے تھے، لیکن کسی درس گاہ سے دلچسپی رکھنے والے فطری طور پر یہ جاننے کے ضرور متمنی ہوتے ہیں کہ اس تعلیم گاہ کا نقشہ کیا ہے اور اس کا جغرافیہ کس طرح واقع ہوا ہے

نودرہ، دارالحدیث، دارالتفسیر، کتب خانہ، اہتمام، دارالافتاء، دارِ جدید کا وسیع

سلسلہ ،باب الظاہر، مہمان خانہ، جامعۂ طبیہ اور مطبخ ، یہ دارالعلوم کی خاص عمارتیں ہیں۔

دارالحدیث ، دارالعلوم کی عمارتوں کا نقطۂ آغاز ہونے کے علاوہ دارالعلوم کی جملہ عمارتوں میں اپنی بلندی، وسعت اور شان وشکوہ کے لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے، ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۶ء میں اولاً "نودرے" کے نام سے اس کا آغاز ہوا۔ نودرے کی دومنزلہ عمارت شرق رویہ ہے۔ اس کے نیچے والی منزل میں ۳۶ × ۲۵ مربع فٹ کے تین ہال ہیں، جن کے سامنے نودروں کا ایک طویل دالان ہے۔ اوپر والی منزل میں ایک وسیع ہال ہے، جس کا رقبہ ۶۸ × ۳۵ مربع فٹ ہے، یہاں دورۂ حدیث کے اسباق ہوتے ہیں اس لئے یہ فوقانی دارالحدیث کے نام سے موسوم ہے، اس کی بالائی منزل کی تعمیر ۱۳۵۲ھ ۱۹۳۳ء میں ہوئی ہے۔

نودرے کی پشت پر بجانبِ مغرب دارالحدیث کی عظیم الشان اور پرشکوہ عمارت ہے، برِصغیر کی سرزمین پر دارالحدیث کے نام کی یہ پہلی عمارت ہے، دارالحدیث کے ہال کا طول ۶۸ فٹ ہے اور عرض ۳۵ فٹ ہے، اس کے گردوپیش ۱۳ کمرے ہیں جو درس گاہوں کے طور پر کام میں آتے ہیں، نودرے کا رُخ مشرق کی جانب اور دارالحدیث کا مغربی جانب ہے، اس رُخ پر پتھر کے ستونوں کا دالان ہے، دارالحدیث کے سامنے ایک وسیع میدان ہے جس میں چمن بندی کی گئی ہے، اس عمارت کی تکمیل ۱۳۴۹ھ ۱۹۳۰ء میں ہوئی ہے۔

دارالحدیث کے اوپر دارالتفسیر کا ۳۰ × ۳۰ مربع فٹ کا ہال ہے، اس کا گنبد میلوں سے نظر آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا دارالعلوم کے سر پر تاج رکھا ہوا ہے، یہ عمارت ۱۳۵۹ھ ۱۹۳۹ء کی تعمیر ہے۔

نودرے کے سامنے ایک مستطیل صحن ہے، جو احاطۂ مولسری کہلاتا ہے، دارالعلوم کا

مشہور تاریخی کنواں اسی احاطے میں ہے، یہیں شعبۂ تبلیغ کا دفتر ہے، نودرے کے صحن کے اطراف میں چند درس گاہیں اور طلبار کے لئے چند رہائشی کمرے ہیں، صحن کے آخیر میں بجانبِ مشرق دروازہ ہے جو بابِ قاسم کے نام سے موسوم ہے، دروازے کے اوپر دارالاہتمام کی عمارت واقع ہے، انتظامی لحاظ سے دارالاہتمام دارالعلوم کا مرکزی نقطہ ہے، مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کے اجلاس بھی یہیں منعقد ہوتے ہیں، یہ عمارت ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء میں تعمیر ہوئی ہے، اس کا مادۂ تاریخ ہے، "جائے عجیب وغریب" (۱۳۱۵ھ)

دارالاہتمام کے مشرق میں دفترِ اہتمام کی عمارت ہے، اور اس کے شمال میں مجلّہ دارالعلوم کا دفتر ہے اور یہیں دفترِ دارالاقامہ ہے، جنوب میں محافظ خانہ ہے، جس میں دارالعلوم کا ایک صدی سے زائد مدّت کا ریکارڈ محفوظ ہے ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء میں اس کی تعمیر ہوئی ہے۔ یہ دومنزلہ عمارت ہے۔

محافظ خانے کی مشرقی جانب یعنی دفترِ اہتمام کے بالمقابل جنوبی سمت میں دفتر محاسبی واقع ہے، یہ عمارت ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء کی تعمیر ہے، یہ دفتر دارالعلوم کے جملہ آمد وخرچ کے حسابات کا ذمہ دار ہے، اسی کے ایک محفوظ کمرے میں دارالعلوم کا خزانہ رہتا ہے، دفتر محاسبی اور دفترِ اہتمام کے درمیان ایک کشادہ صحن ہے جس کا دروازہ سڑک پر کھلتا ہے، دونوں دفتروں کے نیچے کی منزل میں شعبۂ برقیات اور شعبۂ تعمیرات کے دفاتر ہیں، اور اوپر امورِ خارجہ کا دفتر ہے، اسی کے قریب مجلس معارف القرآن کا دفتر ایک کشادہ ہال میں ہے۔

دفترِ اہتمام کے شمال ومشرق میں دارالعلوم کی حسین اور خوشنما دومنزلہ مسجد ہے جس کی رُدکار، ستون اور مینار بادامی رنگ کے پتھر سے بنائے گئے ہیں، جن پر حسین اور خوبصورت نقش ونگار بنے ہوئے ہیں یہ مسجد ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء کی تعمیر ہے اور سنگ تراشی کی بہترین صنعت کی شاہکار ہے، صحنِ مسجد کے آخر میں حوض ہے، اندرون مسجد کا رقبہ

۲۴ × ۳۳ مربع فٹ ہے، صحن کا عرض ۵۰ فٹ اور طول ۱۱۸ فٹ ہے، مسجد کی شمالی اور جنوبی سمتوں میں طلبار کی رہائش کے کمرے ہیں۔

صحنِ مسجد کے مشرقی رُخ پر حوض کے اوپر دارالافتار کی عمارت واقع ہے، یہ وسیع اور کشادہ عمارت تین ہالوں پر مشتمل ہے، جن کے سامنے دالان ہے، برّاعظم ایشیا کا یہ سب سے بڑا دارالافتار ہے، جس سے ہندو بیرونِ ہند کے ہزاروں لاکھوں مسلمان ہر سال خط وکتابت کے ذریعے سے شرعی مسائل میں رہنمائی حاصل کرتے ہیں یہ تعمیر ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء کی ہے، دارالافتار کے قریب ہی ڈاک خانہ ہے، یہ ڈاک خانہ "دارالعلوم پوسٹ آفس" کے نام سے موسوم ہے۔

دارالحدیث کے میدان کے اطراف میں جدید دارالاقامہ کے ۱۰۷ کمرے ہیں[۱]، کمروں کے سامنے اونچی اونچی محرابوں کے طویل دالان ہیں، دارالاقامہ کے ہر کمرے کا رقبہ ۱۹ × ۱۸ فٹ ہے، اور اس پورے احاطے کا رقبہ ۵۰۰ × ۳۶۲ مربع فٹ ہے، اس کی تعمیر کا آغاز ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء میں ہوا اور تکمیل ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء میں ہوئی، اس وقت دوسری منزل پر کمرے بنائے گئے ہیں، دارالاقامہ کے ہر کمرے پر اس شخص کے نام کا سنگِ مرمر کا کتبہ لگا ہوا ہے، جس کے روپے سے اس کی تعمیر ہوئی ہے، دارالاقامہ کے احاطے میں دو سڑکیں ہیں ان سڑکوں نے دارالاقامہ (دارِ جدید) کے احاطے کو چار قطعوں میں تقسیم کر دیا ہے، ان قطعات میں چمن لگا ہوا ہے۔

---

[۱] جدید دارالاقامہ کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی متفرق طور پر طلبار کے لئے رہائشی کمرے ہیں، دارالاقامہ کے کمروں کی مجموعی تعداد ۲۱۰ ہے، جن میں ۱۱۷۷ طلبار کے قیام کی گنجائش ہے، یہاں پر یہ بتادینا ضروری ہے کہ احاطۂ دارالعلوم میں طلبار کے لئے بقدرِ ضرورت کمرے نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے طلبار شہر کی مسجدوں اور کرائے کے مکانوں میں رہتے ہیں۔

دارالاقامہ کے شمال، جنوب اور مغرب میں تین بڑے دروازے ہیں، مغربی دروازہ باب الظاہر کے نام سے موسوم ہے، باب الظاہر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے سفرِ افغانستان اور سابق شاہِ افغانستان محمد ظاہر شاہ کے عطیے کی یادگار ہے، اس کی تعمیر ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء میں ہوئی ہے، باب الظاہر کا رقبہ ۵۴ × ۲۴ مربع فٹ ہے، اس میں تین درس گاہیں شعبہ خوش خطی کی ہیں۔ باب الظاہر کے سامنے سیمنٹ کی پختہ سڑک ہے جس پر دیوبند کے میونسپل بورڈ نے دارالعلوم روڈ کے نام کا بورڈ لگا ہوا ہے، یہ سڑک دارالعلوم کو ریلوے اسٹیشن سے ملاتی ہے۔

دارالحدیث کے کچھ فاصلے پر جنوب مشرق کی جانب دارالقرآن کی پانچ درسگاہیں واقع ہیں جو ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۹ء میں تعمیر ہوئی ہیں، ان میں ہر ایک کا رقبہ ۲۵ × ۲۱ مربع فٹ ہے۔

دارالقرآن کے قریب مطبخ کی عمارت ہے جو کئی حصوں پر مشتمل ہے، دفتر اجناس کا گودام، سوختے کا گودام، کھانا پکانے کے ہال، کھانا تقسیم کرنے کا ہال، ان سب عمارتوں کے مجموعے کا نام مطبخ ہے، مطبخ میں روزانہ دونوں وقت ایک ہزار طلبار کے لئے کھانا پکایا جاتا ہے، مطبخ کے قریب دارِجدید کی دوسری منزل پر دو جدید درس گاہیں بنائی گئی ہیں۔

مشرقی دروازے سے احاطۂ دارالعلوم میں داخلے کے وقت بائیں جانب نیچے کی منزل میں شعبہ برقیات کا دفتر ہے، دفتر محاسبی جس کا اوپر ذکر گزر چکا ہے اسی کے اوپر ہے، دفتر برقیات کے برابر سے ایک راستہ احاطۂ کتب خانہ میں نکلتا ہے، یہاں نیچے کی منزل میں دارالصنائع کے علاوہ اوقاف کا دفتر ہے، اور اوپر کی منزل میں کتب خانے کی طویل عمارت کا سلسلہ ہے، کتب خانے میں تین بڑے ہال اور ۸ کمرے ہیں یہاں ایک لاکھ سے زائد کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے، اس کی تفصیل باب ہشتم میں گزر چکی ہے، کتب خانے کی عمارت کا آغاز ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء میں ہوا، اس کا تیسرا ہال ابھی ۱۳۹۶ھ میں

تعمیر ہوا ہے۔

یہ کتب خانہ دارالعلوم کی جان اور برِ صغیر کے مسلمانوں کی فیاضی کا بے نظیر سرمایہ ہے، اس میں درسی کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ شاید ہی کسی دوسری جگہ ہو۔

کتب خانے ہی کے نیچے کی منزل میں جانب جنوب دفتر تنظیم و ترقی کا دفتر ہے ' یہ شعبہ دارالعلوم کے لئے مالیات فراہم کرتا ہے، اس کے صحن میں ایک پُر فضا چمن ہے، اوپر کی منزل کا تعلق کتب خانے سے ہے۔

دفتر تنظیم و ترقی کی پشت پر مسجدِ چھتہ ہے، یہ وہی قدیم مسجد ہے جس کے صحن میں انار کے درخت کے نیچے دارالعلوم کا افتتاح ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۶ء میں ہوا تھا، اس مسجد کا رقبہ ۴۸ × ۴۰ مربع فٹ ہے۔

اگر آپ دارالعلوم میں اس کے شرقی دروازے سے داخل ہوں تو احاطۂ دارالعلوم سے باہر مسجدِ دارالعلوم کے بالمقابل شارع عام کی شرقی جانب آپ کو ایک پُرشکوہ دومنزلہ عمارت نظر آئے گی، یہ دارالعلوم کا مہمان خانہ ہے جو ۱۳۷۷ھ ۱۹۵۸ء میں تعمیر ہوا ہے، نیچے کی منزل میں مدرسین کے لئے رہائشی مکانات ہیں اور اوپر مہمان خانے کی وسیع عمارت ہے جو متعدد کمروں اور کئی دالانوں پر مشتمل ہے اسکا رقبہ ۱۱۵ × ۸۰ مربع فٹ ہے۔ مہمان خانے کے پہلو میں جانب شرق ایک شاندار دومنزلہ عمارت ہے جس میں چھ مکان ہیں، اس کے ایک حصے میں اجلاس صد سالہ کا دفتر ہے۔

دارالطلباء اور باب الظاہر کے شمال میں کسی قدر فاصلے پر جامعۂ طبیۂ دارالعلوم کی عمارتیں ہیں، جامعۂ طبیۂ میں متعدد ہال اور دالان ہیں اور مریضوں کے لئے دو جنرل وارڈ ہیں۔

جامعۂ طبیۂ کی پشت پر افریقی منزل کی عمارت ہے، جو ابھی زیرِ تعمیر ہے، مکمل ہونے پر یہ عمارت دارالعلوم کی عمدہ عمارتوں میں سے ہوگی۔

مطبخ کی پشت پر بھی طلبار کے لئے ایک نیا دار الاقامہ بنایا گیا ہے۔
دارالعلوم کی عمارتوں کے متعلق یہ بات خاص طور پر ملحوظ رہنی چاہیئے کہ یہ عمارتیں پہلے سے تیار کردہ نقشے کے مطابق ایک ساتھ تعمیر نہیں ہوئی ہیں جیسا کہ اُنکے سنینِ تعمیر سے واضح ہے، بلکہ جوں جوں دارالعلوم ترقی کرتا رہا اس کی عمارتوں میں بھی حسبِ ضرورت اضافہ ہوتا رہا ہے، جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے اور انشار اللہ تعالےٰ آئندہ بھی اسی طرح جاری رہنے کی توقع ہے۔ ؎

ہے کوششِ کرام سے اُمیدِ فتح باب
اور فضلِ ایزدی سے یقینِ کشود کار

واردین وزائرین کے اسماءِ گرامی

عبدالواحد منصف رہتک

محمد حسین وزیر ریاست پٹیالہ

سید محمد شاہ محدث رام پوری

پی ، سی ، پگاٹ مجسٹریٹ سہارنپور

آر پی ، ڈیو ہرسٹ ، جج سہارنپور

جے ، ڈی ، لاٹوش لفٹیننٹ گورنر صوبہ متحدہ

نواب احمد حسن خاں رئیس حسن پور

نیاز الدین خاں اکسٹرا اکمشنر پنجاب

مولانا فتح محمد لکھنوی

مولانا انوار اللہ خاں حیدر آباد

سید محمد ابراہیم انجینیر لکھنو

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں

کمشنر میرٹھ ڈویژن

امیر حسن ، ڈپٹی کلکٹر سہارن پور

سید ضمیر الدین چیف سکریٹری ریاست بھوپال

مولانا شوکت علی

نواب لطیف یار جنگ بہادر حیدر آباد

نواب محمد اسماعیل خاں میرٹھ

سلیمان یوسف ملان ڈربن

ضیاء الاسلام مجسٹریٹ کاندھلہ

ڈاکٹر جولینس جرمیس عبدالکریم بوڈاپسٹ یونیورسٹی

محمد یوسف الزماں فاروقی منصف دیوبند

فضل الٰہی میئر کلکتہ

سید محی الدین پرنسپل عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن

گوئی وینٹ پروفیسر آکسفورڈ یونیورسٹی

ایم ، آئی ، شاہ کیوچن صدر چینی مسلم مشن جامعہ ازہر

محمود علی خاں سکریٹری روبکاری شملہ

نواب بہادر یار جنگ ، حیدر آباد

فتح الدین ایڈوائزر

ڈاکٹر شفاعت احمد خاں

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

عبدالرشید، لدھیانہ

بشوا ناتھ مکرجی

محمد محسن، دہلی

محمد عثمان کے، دو نمائندہ چینی فیڈریشن

ڈاکٹر احمد جلال الدین، لاہور

جے، ڈی، شکلا کلکٹر سہارن پور

گنگا سنگھ پرنسپل مشنری کالج امرتسر

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سہارن پور

مسز کلثوم سایانی ایڈیٹر "رہبر" بمبئی

سردار نجیب اللہ خاں سفیر افغانستان

ایم، اے امین ڈپٹی ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو

عبدالفتاح عودہ ناظم نشریات عربی، ریڈیو دہلی

علی امیر معز ناظم نشریات فارسی دہلی ریڈیو

شیخ محمد مستنصر اللہ لکھنؤ

مولانا ابوالکلام آزاد

ایل، ایس، بشٹ سہارن پور

عبداللطیف وزیر عدل وصحت حکومتِ برما

انور السادات، وزیر حکومتِ مصر

علی اصغر حکمت سفیرِ ایران

ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریۂ ہند

شاہ افغانستان محمد ظاہر شاہ

ایچ، ایم، حسین سکندر آباد

سی، ایل ماتھر ہندوستان ٹائمز

سالوجی، جنوبی افریقہ

نیاز برکینر، ترکی

شیخ سعد حجازی

ڈاکٹر پی، جی، ہارڈی، لندن یونیورسٹی

جے، ڈی، ایڈرسن لندن یونیورسٹی

پروفیسر ہمایوں کبیر

محمد یوسف فرانس ساؤتھ افریقہ

باسدیو سنگھ، رجسٹرار اترپردیش

جگدیش سہائے جسٹس الہ آباد

ساوتری شیام

عبدالفتاح ابوغدہ

عبدالستار امین متحدہ عرب جمہوریہ

الشنکاوی

درباری لال شرما چیرمین لیجس لیٹیو کونسل لکھنؤ

ایچ، اے حمید، امریکہ

اجیت پرشاد جین، گورنر کیرالہ

ابراہیم خلیل، افغانستان

کے. لکشمن شاستری

عمر ابوریشہ سفیر مملکتِ شام

انس یوسف یٰسین سفیر سعودی عرب

عیسیٰ سراج الدین سفیر مملکتِ مصر

مولوی محمد فاروق، کشمیر

بی. گوپالا ریڈی، گورنر یو. پی

جگرٹ اے. جیمس، دہرہ دون

مہادیو پرشاد چیف وہپ مرکزی حکومت

رام چندر وکل، ممبر پارلیمنٹ

ولیم، آر. راف، پروفیسر تاریخ کولمبیا یونیورسٹی (امریکہ)

جے. پی. ایس. او. بی. رائے پروفیسر دلی یونیورسٹی

ناظم عمومی رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ

ڈاکٹر محمد اسحاق، پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی

اکبر علی خاں، گورنر اتر پردیش

سوئیس دان، مغربی جرمنی

عبدالخالق ہمدانی، جموں وکشمیر گورنمنٹ

ڈاکٹر محمد لوجل، استنبول

شہباز حسین، ترقی اردو بورڈ دہلی

وفد رابطہ علماء عراق، بغداد

شیخ محمد الحکیم، مفتی حلب (شام)

تان سری حاجی عبدالخالق، ہائی کمشنر ملیشیا

شیخ عبدالحلیم محمود، شیخ الازہر

علی عبید محمد غزالی، متحدہ امارت

شیخ محمد الفحام، شیخ الازہر

یوسف السیّد ہاشم رفاعی

عبدالمعز عبدالستار، قطر

منظور عالم قریشی، سفیر حکومتِ ہند

احسام الدین

باسدیو سنگھ، اسپیکر اتر پردیش اسمبلی

فخر الدین علی احمد، صدر جمہوریہ ہند

فتحی عبدالحمید، تنظیم آزادی فلسطین

مہندر پرتاپ سنگھ

حکیم عبدالحمید، متولی ہمدرد دواخانہ دہلی

مقبول عبدالکافی مدرسہ تحفیظ القرآن مکہ مکرمہ

دو منظوم معائنے

حاجی ضیاء الاسلام ضیاء، رئیس کاندھلہ

مولانا ظفر علی خاں، ایڈیٹر اخبار "زمیندار" لاہور

بابِ دهم

گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

واردین و زائرین کے مشاہدات و تاثرات

دارالعلوم دیوبند جس طرح اپنی تعلیمی، تربیتی، تہذیبی اور سیاسی خدمات کی وجہ سے عالمی شہرت و عظمت اور مقبولیت کا حامل ہے، اسی طرح یہ دنیا کے مشاہیر علم و فضل اور سیاسی قائدین بالخصوص ذمہ دارانِ حکومتِ ہند کی توجہات اور آمد و رفت کا بھی مرکز رہا ہے۔

دارالعلوم کے حالات اُسی کے سوانح نگار کی زبان و قلم سے سُننے کے بعد اُن مبصرین عالم کی زبانوں سے سُننا زیادہ دلچسپی کا موجب ہوگا جنھوں نے دارالعلوم کو بچشم خود دیکھ کر اُس کی مرکزیت، ہمہ گیر افادیت، دینی خدمت، اساتذہ کی علمی پختگی اور اخلاص و ایثار، پاکیزہ اخلاق اور سادہ اسلامی زندگی، طلبار کا تعلیمی ذوق اور بلند کردار، کارکنوں کی فرض شناسی اور محنت و دیانت، حسابات کی عمدگی، صفائی کا التزام اور کتابوں کی

فراوانی وغیرہ اہم اُمور کی ضروری تفصیلات پر روشنی ڈالی ہے، ان میں اکثر عالمِ اسلام کی مشہور شخصیتیں اور ممتاز علماء ہیں ان واردین وصادرین میں ہند و بیرونِ ہند کے مسلمانوں کے علاوہ مختلف مذاہب اور مختلف خیال کے بھی لوگ شامل ہیں، انمیں قدیم وجدید تعلیمی اُمور کے مبصر بھی ہیں اور حسابات کے ماہر بھی، حکّام بھی ہیں اور اہلِ ثروت بھی، تاجر بھی اور عالم بھی، مدیرانِ جرائد بھی ہیں اور قانون داں بھی، دانش مند بھی ہیں اور لیڈرانِ قوم بھی اور انجینیر بھی ہیں، طبیب بھی ہیں اور ڈاکٹر بھی مُسلمان بھی ہیں اور غیر مُسلم بھی ہندو وسکھ بھی ہیں اور یورپین بھی، عرب بھی ہیں اور چینی و افریقی بھی، غرض کہ دارالعلوم کا معائنہ کرنیوالوں میں مختلف ممالک، مختلف اقوام اور مختلف زاویۂ ہائے نظر کے سبھی لوگ موجود ہیں اور ہر ایک نے علیحدہ علیحدہ مختلف اوقات میں اپنے اپنے نقطۂ ہائے نظر سے دارالعلوم کی اہمیّت کا اعتراف کیا ہے اور اپنے تاثرات اور خیالات کا آزادانہ اظہار کیا ہے۔

معائنہ جات کی عبارت میں لفظی بندش اور فقروں کی ترتیب کو علیٰ حالہٖ باقی رکھا گیاہے، اس کی وجہ یہ خیال ہے کہ قاری کے ذہن کو اصل عبارت اور اس کے طرزِ ادا سے بہرحال قریب تر رہنا چاہیئے، تاکہ وہ ہر شخص کے اسلوبِ نگارش اور عہد بعہد کے اندازِ فکر کو جان سکے، ان میں بہت سے معائنے اُردو کے علاوہ عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، ہندی، چینی اور دوسری مختلف زبانوں میں لکھے ہوئے ہیں، ایسے معائنوں کا اُردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

ان معائنوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دنیا کے اہل الرائے دارالعلوم کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں، یہ معائنہ جات کئی ضخیم جلدوں میں لکھے ہوئے ہیں اور اکثر سالانہ رودادوں میں شائع بھی ہوچکے ہیں، اس لئے ان سب کا پیش کرنا ناخوشگوار طوالت کا باعث ہوگا، لہٰذا یہاں اُن کا انتخاب واقتباس پیش کرنا ہی مناسب

ہوگا۔ معائنہ جات ملاحظہ ہوں :۔

"میں اتفاقیہ مدرسہ دیوبند میں آیا، یہ ایک نہایت عمدہ مدرسہ ہے، عمارتِ مدرسہ اور صفائی اور طریقۂ تعلیم اور مصروفیت مدرسین اور کوشش طالب علمان جماعات عربی و فارسی وغیرہ جو میں نے دیکھی ہے اس کی جس قدر تحسین کی جائے کم ہے دفتر نہایت تہذیب اور ترتیب کے ساتھ رکھا ہوا ہے، کتب ہر قسم تفسیر و حدیث و فقہ و اصول وغیرہ جو کم دستیاب ہو سکتی ہیں اس مدرسہ میں موجود ہیں اور بہت جلد برآمد ہو جاتی ہیں، میں نے رات کو دیکھا ہے کہ اپنے دلی شوق سے تھوڑی رات گئے سے طالب علم مصروفِ تعلیم ہو جاتے ہیں، میں نے مدرسہ جات اسلامیہ پنجاب اور دہلی اور پورب میں دیکھے، یہ عمدہ طریقہ جس میں ہر ایک امر کا لحاظ عمدہ طور پر کیا گیا ہے دیکھنے میں نہیں آیا، خدائے تعالےٰ یوماً فیوماً اس کی فضیلت و برکات اور اشاعت میں ترقی فرمائے۔

محمد عبدالواحد

منصف روہتک ۴ محرم ۱۳۰۶ھ

"آج میں نے مدرسہ اسلامیہ دیوبند کو دیکھا، اس بات کے معلوم کرنے سے کہ اب مدرسہ میں تین سو طالب علم ہیں طبیعت بہت مسرور ہوئی، عمارتِ مدرسہ مضبوط اور خوشنما ہے، صفائی بہت اچھی ہے، آج طلبہ امتحان تحریری کے دینے میں مصروف تھے، اس مدرسہ کو شروع ہوئے اونتیسواں (۲۹) سال ہے، جو امر خلوصِ نیت اور عزم درست سے کیا جاوے خداوند تعالےٰ اس میں ہمیشہ برکت دیتا ہے، اس مدرسہ کا وجود اس کے نامور علماء مولوی محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ و مولوی محمد یعقوب صاحب

لہ افسوس ہے کہ ۱۳۰۶ھ سے قبل کے معائنوں کا ریکارڈ موجود نہیں ہے۔

اوران کے رفتار کی درستیٔ نیت اور عزم واستقلال کا نتیجہ ہے، میرے خیال میں بقائے طریقۂ تعلیم قدیمہ کا اگر کوئی طریق ہے تو یہی ہے، جن لوگوں کو زمانہ حال کی تعلیم کارآمد معاش کے حاصل کرنیکی غرض سے اور صرف اپنے مذہب اور اپنے بزرگوں کے طریقۂ تعلیم سے غرض رکھتے ہوں بے شک اس مدرسہ سے بہت فوائد حاصل کر سکتے ہیں، اور اس زمانہ میں تحصیلِ علوم متعلقہ معاش کے لئے جبکہ بے شمار مدرسے اور اسکول ہیں ایسے خاص طور کی درس گاہ اور ایسے صاحبِ شوق طالب علموں کا وجود دونوں مغتنمات سے ہیں، میری دلی دعا ہے کہ خداوند تعالےٰ عز و شانہٗ جمیع فرقِ اہلِ اسلام کو سرسبز اور کامیاب رکھے اور جن امور سے کہ مذہب اسلام اور امور خاصہ فرق اہلِ اسلام کا ابقاء اور احیاء ممکن ومنصور ہو ان میں اللہ تعالےٰ برکت دے۔"

سید محمد حسین

وزیر ریاست پٹیالہ ۵ رشعبان ۱۳۱۱ھ

"میں نے اس مدرسۂ عالیہ دیوبند کو دیکھا، میرے نزدیک اکثر مدارس اسلامیہ سے یہ بہتر اور اعلیٰ ہے، اس کی عمارت میں استحکام اور مدرسین وعلماء کا آرام زیادہ تر ملحوظ ہے، اس کے علماء وطلباء متدین صاحبِ اخلاقِ حمیدہ اور صاحبانِ کمال ہائے درس کا ضابطہ ایسا رکھا گیا ہے کہ علوم مشہورہ متداولہ میں سے کسی علم میں اس کا پڑھنے والا عاری نہ رہے گا، یہ بھی حالات دیکھنے سے ظاہر ہوا کہ قولاً وفعلاً اتباعِ سنّت کا لحاظ رکھنا مطلوب ہے، ہاں اتنا میں کہتا ہوں کہ فارسی کی کتابیں جو پڑھائی جاویں تو اون میں سے مضامینِ عقلیہ اور دقائق صوفیہ اور جو مضامین کہ اطفال ونوجوانوں کے حق میں مضر سمجھے جائیں دور کر دیئے جائیں۔"

سید محمد شاہ ابن سید حسن شاہ محدث رامپوری

۲۰ رشوال ۱۳۱۴ھ

"مجھ کو آج مدرسہ عربیہ دیوبند کے معائنہ کرنے سے غیر معمولی مسرت ہوئی جو شخص اس مدرسہ کے دروازے سے گذر کر اس کے کشادہ صحن میں قدم رکھے اور وہاں اس کے بیل بوٹے اور پھول وغیرہ ملاحظہ کرے اور بعدہٗ اس کی نہایت وسیع درسگاہوں میں داخل ہو جہاں کہ گروہ در گروہ طالبانِ علم دل سے اپنے اپنے کام میں مشغول ہیں اس کو ضرور بالضرور یقین ہو جائے گا کہ میں میلے کچیلے قصبہ دیوبند میں نہیں ہوں بلکہ اس سے ہزاروں میل دور ہوں، میں مدرسہ کی عمارت کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھ کو یہ عمارت ہندوستان میں کالجوں کی عمارتوں کا ایک عمدہ نمونہ معلوم ہوتی ہے طرزِ تعلیم کے حق میں، میں کوئی آزادانہ رائے قائم نہیں کرسکتا مگر طالبانِ علم کا ایسے دور دراز مقامات سے جیسے سورت، کابل، بلخ وغیرہ یہاں موجود ہونا کالج کی شہرت کی کافی شہادت ہے، کالج کے بارے میں میں پورے طور سے اندازہ کرسکتا ہوں کہ حال کی ضروریات میں سے ایک بڑی ضرورت کو بخوبی پورا کرسکتا ہے، میں نہایت خوشی سے اپنا نام فہرستِ چندہ دہندگان میں شامل کرتا ہوں۔"

پی، سی، پگاٹ، جنٹ مجسٹریٹ سہارنپور

۶ر اپریل ۱۸۹۷ء

"میں نے ۲۹ مارچ ۱۹۰۲ء کو مدرسہ عربیہ دیوبند کی سیر کی اور یہاں جو کچھ دیکھا اس سے بہت ہی مسرور ہوا، یہ ایک عدیم المثال درس گاہ ہے جو مسلمانوں کو نہ صرف ہندوستان کے اطراف وجوانب سے بلکہ بخارا جیسے دور دراز مقامات سے اور کبھی کبھی خاص عرب سے اپنی جانب کھینچتی ہے، اگرچہ مدرسہ کا نصب العین اسلامی دینیات کی تعلیم محض ہے، مگر میں یہ دیکھ کر از حد محظوظ ہوا کہ عربی ادب کی بھی تعلیم دی جاتی ہے، اور اکثر طلباء اس زبان میں بآسانی نظم ونثر میں طبع آزمائی کرسکتے ہیں بعض کو مقاماتِ حریری کے چیدہ چیدہ مقامے حفظ یاد ہیں، مجھ کو بذاتِ خود ان بزرگوں

کی رائے سے اتفاق نہیں جو مدرسہ کے موجودہ نصابِ تعلیم میں اصلاح و تغیر کی تجویز پیش کرتے ہیں، اگر اُن کی رائے کے بموجب جدید علوم بھی داخلِ نصاب کر دیئے گئے تو ضرور ہے کہ مدرسہ اس امتیازی حالت پر نہ رہے گا، اس قسم کی اصلاح کی کوشش کا نتیجہ اگر کچھ ہوگا تو یہ ہوگا کہ مدرسہ کے چہرہ کے وہ نمایاں خط و خال مٹ جائیں گے جنکی بدولت آج یہ مدرسہ سربلند اور ممتاز ہے۔ طالب علم یا اُن کے والدین اگر علومِ مروجہ زمانۂ حال کی تعلیم مغربی اصول پر دلانے کے خواہش مند ہوں تو اُن کو دیوبند آئے بدون بیشمار جگہ اس قسم کی تعلیم مل سکتی ہے، میرے نزدیک جماعتِ انتظامیہ کا یہ نصب العین ہونا چاہیئے کہ مدرسہ کی اس تخصیصی اور امتیازی حیثیت کو قائم رکھیں، گویا یہ ایسی درسگاہ ہے جس میں محض عربی دینیات، منطق، زباندانی اور ادب وغیرہ کی تعلیم پر خصوصیت کے ساتھ توجہ مبذول کی جاتی ہے۔

اس بات کے دیکھنے سے گوناگوں اطمینان ہوتا ہے کہ مدرسہ کے علمار نے مدرسہ میں تعلیم دینے کے لئے خلوص و یک جہتی سے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔"

آر، پی ڈیو ہرسٹ، جج سہارن پور

۲۹ مارچ ۱۹۰۲ء

"میں نے آج مدرسہ عربیہ دیوبند کو دیکھا، گروہِ کثیر طلبہ کا ہندوستان کے تمام حصوں سے آکر مدرسہ میں داخل ہونا اس کی اعلیٰ وقعت اور قدر کو ثابت کرتا ہے جو کہ مسلمانانِ ہند مدرسہ ہذا کی نسبت اپنے دل میں رکھتے ہیں، مجھ کو اس امر کا یقین دلایا گیا ہے کہ جس طالب علم نے اس مدرسہ کے نصابِ تعلیم پر عبور حاصل کرلیا ہے وہ اپنی زندگی میں کوئی معزز مرتبہ حاصل کرنے میں کبھی قاصر نہ رہے گا، دراں حالیکہ یہ امر قرار دیا گیا ہے کہ یہ مدرسہ ایک بلند اخلاقی تعلیم کے لئے قابلِ اطمینان گارنٹی (سند) عطا کرتا ہے، میں اس آزاد مستقل اور سرگرم سعی و کوشش کے حق میں جو مسلمانوں کی ترقی کے واسطے عمل

میں آئی ہے ہر قسم کی کامیابی کی خواہش کرتا ہوں ۔

جے، ڈی، لاٹوش لفٹیننٹ گورنر صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ

۶ جنوری ۱۹۰۸ء

" آج ۳ رجب ۱۳۲۵ھ کو مدرسہ میں آنے کا اتفاق ہوا، چونکہ حسن پور ضلع مرادآباد میں ایک اسلامی مدرسہ میرے زیر اہتمام ہے اس کی اصلاح کے خیال سے میں نے سارے رجسٹر اور حساب وکتاب مدرسہ غور وخوض سے دیکھے اور ان کی جانچ کی، مدرسہ کی مجموعی حالت دیکھ کر میں بے حد خوش ہوا، کوئی امر ایسا نہیں دیکھا کہ جس میں کسی قسم کی فروگزاشت ہو، جملہ انتظام مناسب اور اعلیٰ درجہ کا، سارے حساب وکتاب نہایت صحیح و درست، کل متعلقینِ مدرسہ اپنے کام میں مستعد و خیر خواہ، سارے طلبہ محنتی اور جفاکش، انتظام نہایت صفائی کے ساتھ باقرینہ، غرضکہ ہر آئینہ مدرسہ کی حالت ہندوستان کے سوا دیگر ممالک سے بھی زیادہ بہتر ہے، چنانچہ میں نے مصر کا جامع ازہر جو دنیا میں مشہور ہے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے، جس میں سترہ ہزار طلبا پڑھتے ہیں، اُس سے بھی اِس مدرسہ کو بہت سے امور میں ترجیح حاصل ہے، خداوندِ کریم بطفیلِ حبیب پاک اس سے زیادہ ترقی دے اور اس گلزارِ محمدی کو ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھے اور ترقی عطا فرمائے ۔

نواب حاجی احمد حسن خاں
رئیس حسن پور

" میں نے مدرسہ دیوبند کی منظم جماعت علماء سے نیاز حاصل کیا، میں نے انکو نہایت متواضع، حلیم الطبع، منکسر المزاج بزرگ پایا، میں اگرچہ بوجہ اپنی بے علمی کے انکے اعلیٰ علمی خیالات اور قیمتی کتب خانہ سے پورا فائدہ نہ اُٹھا سکا مگر یہ مقام شکر ہے کہ ہمارے یہ علماء زمانہ کی ضرورت سے واقف اور وسیع النظر اور موجودہ مذہبی سوالات اور

حالات سے پوری آگاہی رکھنے والے ہیں، مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ یہ بزرگ اپنی قدیم مذہبی وضع کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، ملک میں مذہبی ضعف عام ہے، اس لئے اس مدرسہ کا وجود مسلمانوں کے لئے بلاشبہ رحمتِ الٰہی ہے، تعمیر مسلمانوں کے عام افلاس کی موجودگی میں نہایت شاندار اور مضبوط ہے۔

محمد نیاز الدین خاں

اکسٹرا کمشنر پنجاب ۱۳۲۵ھ

"میں نے ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۲۵ھ کو مدرسہ کی درس گاہیں اور تمام عمارات دیکھیں، حسابات ایسے صاف اور مکمل پائے جس پر زیادتی غالباً ناممکن ہے، کتب خانہ بہت بڑا اور باترتیب دیکھا، فارسی خواں بچوں کی تعلیم نہایت قابلِ اطمینان ہے قرآن مجید کا بھی بہت اچھا انتظام ہے، قرأت کا جداگانہ اہتمام ہے، حدیث کے درس میں پچاس طالب علم صرف ترمذی شریف کے درس میں شریک تھے، یہ جماعت خصوصاً ایک مسلمان کی نظر میں نہایت عظمت و شان کی معلوم ہوتی ہے، اس کے علاوہ معقول کی جماعت بھی بہت بڑی اور اچھی نظر آئی، عموماً مدرسین و طلباء اپنے اپنے کام میں مشغول پائے گئے، طلبہ کے رہنے، کھانے، لباس اور دوا کا عمدہ انتظام ہے، سب سے بڑی بات جو اس مدرسہ کو روزانہ ترقی کی خوش خبری سناتی ہے وہ اس کے مدرسین و مہتممین کا اخلاق اور سنت پر عمل ہے، اس میں شبہ نہیں کہ مدرسہ دیوبند آج ہندوستان میں اپنی آپ ہی نظیر ہے، اگر عالی ہمت مسلمان ایسے مدرسہ کی اعانت و خدمت میں تساہل کریں تو خود ان کی بدقسمتی ہے، اللہ تعالےٰ ایسے مدرسہ کو اسی اسلامی روش پر قائم، اور اس کے طلباء کو دولتِ علم و عمل سے کامیاب اور اس کے مدرسین کو اپنی رضا و رحمت سے مسرور رکھے آمین"

(مولانا) فتح محمد، مہتمم مدرسہ رفاہ المسلمین لکھنؤ

"مجھ کو مدرسہ کی کمال شہرت کی بنا پر اس کے دیکھنے کا شوق تھا، الحمد للہ آج ۱۰ اپریل کو میں مدرسہ میں پہونچ گیا، مدرسہ کی عمارت خوشنما اور مضبوط بنائی گئی ہے، مدرسہ عمدگی کے ساتھ ترقی پذیر ہے، میں نے اپنی ذاتی واقفیت سے جو کچھ مجھ کو تعمیرات کے متعلق حاصل ہے، زیرِ تعمیر عمارت کو جانچا اور ہر اعتبار سے اچھا پایا، یہ مدرسہ خالص اسلامی اور مذہبی ہونے کی حیثیت سے اپنی نظیر نہیں رکھتا، ۳۵۰ طلباءؔ میں سے ۱۸۶ مدرسہ کے دارالاقامہ میں رہتے ہیں، طلباء کے جملہ مصارف کھانا کپڑا اور ان کی صحت کے لئے یونانی طبیب اور دوا وغیرہ کا انتظام بھی مدرسہ سے کیا جاتا ہے، صفائی کا بھی اچھا انتظام ہے، کتب خانہ دفتر اور اس کے رجسٹر اور تمام کاروبار باقاعدہ ہیں۔"

سیّد محمد ابراہیم
انجینیر، لکھنؤ ۱۳۲۵ھ

"میں نے آج اس مدرسہ کو دیکھا، طریقۂ تعلیم درست پایا، اساتذہ اپنے فرائضِ منصبی میں نہایت مستعد، طلباء نہایت جفاکش اور سرگرم تحصیل ہیں، غیر مذاہب سے مناظرہ کی تعلیم بھی عمدہ اصول پر ہو رہی ہے، قرآن مجید فنِ تجوید کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے، جس کے سننے سے ایمان تازہ ہوتا ہے، غرض کہ تحصیل و تکمیلِ علوم کے لئے جس قدر لوازم و ذرائع ہیں بفضلہٖ تعالیٰ سب مہیا ہیں، حق تعالیٰ اہلِ اسلام کو توفیق عطا فرمائے کہ اس کی تائید کر کے مستحق اجرِ عظیم ہوں۔"

مولانا انوار اللہ خاں استاذ نظام دکن

۱۴ رجب ۱۳۲۷ھ

"۲۶ سال کے بعد میں نے اس مدرسہ کی زیارت کی جس کی بنیاد مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رکھی تھی، پہلی مرتبہ میں نے مدرسہ کی اُس وقت زیارت کی تھی جب الشیخ الفاضل، مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کے صدر المدرسین تھے۔

یہ مدرسہ اس وقت انتہائی بلندی تک ترقی کرچکا ہے، اس کے باوجود کہ مُسلمانوں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں کی، اس کی عمارتیں بہت کافی بڑھ گئی ہیں، مدرسہ کے ذمہ داروں نے اس کی شان کے مطابق علماء اور اساتذہ کے جمع کرنے میں بڑی توجہ صرف کی ہے، خدا کی ذات سے مجھے اُمید ہے کہ یہ مدرسہ مزید ترقی حاصل کرے گا۔

میں جمعیۃ الارشاد کے جلسہ میں حاضر ہوا، جس میں طلباء کی دو جماعتیں بنی ہوئی تھیں، اور آپس میں ذبیحہ کے مسئلہ پر بحث کر رہی تھیں، میں اس لطیف بحث کو سن کر بہت محظوظ ہوا، میرا خیال ہے کہ اگر اس طریقہ پر مداومت کی جائے تو اس سے طلباء اور مُسلمانوں کو بہت بڑا فائدہ پہونچے گا۔

حضرت مہتمم صاحب کے توجہ دلانے پر میں نے مدرسہ کی صفائی کو دیکھا، مجھے وقت کی تنگی کا بڑا افسوس ہے ورنہ میں اپنے خیالات کو بسط و تفصیل سے بیان کرتا۔"

(مسیح الملک) محمد اجمل خاں

"میں نے پیشتر بھی اس مدرسہ کی بابتہ کچھ سُنا تھا مگر میں اتنی بڑی اور ایسی سرسبز تعلیم گاہ کے دیکھنے کے لئے تیار نہیں تھا، نہ مجھ کو یہ خیال تھا کہ میری ملاقات اُن طلباء سے ہوگی جو یوربین روس وایشیائی روس اور جملہ اقطاعِ ہند متصلہ خود مختار ممالک سے تحصیل علم کے لئے آئے ہیں، یہ امر نہایت قابلِ اطمینان ہے کہ مسلمان اس

مدرسہ کی پوری امداد کر رہے ہیں جس کی وجہ سے بیرونی امداد کی ضرورت نہیں، میں اس مدرسہ کے لئے ہر قسم کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔"

کمشنر، میرٹھ ڈویژن

۹ر دسمبر ۱۹۰۹ء
۱۳۲۷ھ

"آج میرا گذر دیوبند میں ہوا، اور میں نے مشہور مدرسہ عربیہ دیوبند کو نہایت شوق سے جاکر دیکھا، جس امر نے مجھ کو بحرِ تحیر میں غوطہ زن کیا وہ یہ ہے کہ چند بوریہ نشین علماء کی مساعیٔ جمیلہ نے عام مسلمانوں کے چندے سے ایک معمولی مکتب کو عظیم الشان عربی کالج کے پیمانے پر پہنچا دیا ہے، اس دارالعلوم نے اپنے تئیں ایشیا کا ویسا ہی مرکزِ علوم بنا رکھا ہے جیسا کہ مصر میں جامع ازہر، ان خیالات نے میرے دماغ میں دنیائے اسلام میں سلف کے مدارس قرطبہ، بغداد، بخارا، سمرقند اور نظامیہ وغیرہ کا نقشہ کھینچ دیا، جن کا ذکر میں نے تاریخوں اور سفرناموں میں پڑھا ہے، یہ ایسے ہی مدارس کا فیض اور ایسے ہی علماء کی تصانیف کی برکت ہے کہ اسلامی سلطنتیں اور موجودہ حکومتیں جب کہ معرضِ تزلزل میں ہیں، مگر اسلام بحیثیت ایک حقانی مذہب کے اپنی خالص وحدانیت کے ساتھ اسی طرح قائم ہے جیسا کہ ابتداء میں تھا اور انشاء اللہ تاقیامِ قیامت قائم و برقرار رہے گا۔"

امیر حسن

ڈپٹی کلکٹر سہارنپور ۱۳۲۷ھ

خوش قسمتی سے مجھ کو مدرسہ دیوبند کے دیکھنے، اس کے طلبہ کو قرآن مجید پڑھتے ہوئے اور عربی میں تقریریں کرتے ہوئے سننے کا موقع ملا، انھوں نے نہایت قابلِ تعریف پیرائے میں اپنی تقریروں کو انجام تک پہونچایا، اور ہندوستان میں مشرقی تعلیم کا ایک بے نظیر سماں دکھلا دیا، ان قلیل التعداد مدرسہ عربیہ کے

متعلق جو ہندوستان میں موجود ہیں، بالعموم یہ شکایت کی جاتی ہے کہ ان میں تعلیم پائے ہوئے اشخاص اپنے خیالات کا عربی میں اظہار نہیں کر سکتے لیکن اس مدرسہ کے طلبہ نے اس عام خیال کی پورے طور پر تکذیب کر دی، اور اپنی عربی تقریروں کے انداز سے اچھی طرح ثابت کر دیا کہ وہ نہایت روانی کے ساتھ گفتگو کرنے کے عادی ہیں، میں اس تعلیم گاہ کے اساتذہ اور منتظمین کو مبارکباد دیتا ہوں۔

حسابات کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ تعلیم گاہ انتہائی کفایت شعاری کے اصول پر چلائی جارہی ہے۔"

سید ضمیر الدین

چیف سکریٹری ریاست بھوپال ۱۳۲۷ھ

"جو اثر میرے قلب پر دیوبند کو دیکھ کر ہوا وہ نہایت دل خوش کن تھا، میں دیوبند میں وہ اثرات پاتا ہوں جن سے کسی قوم کے زندہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔"

(مولانا) شوکت علی

۷ جنوری ۱۹۱۴ء

"میں نے جتنے قومی اور سرکاری ادارے دیکھے ہیں قدرِ مشترک طور پر سب کا حال یہ ہے کہ اُن کی شہرت واقعیت سے زیادہ ہے، جس قدر ان کے کارنامے شائع کئے جاتے ہیں وہ اندرونی حالات کے اعتبار سے زائد ہوتے ہیں۔ لیکن دارالعلوم دیوبند کو دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس کی واقعی خدمات اس کی اشاعت سے بہت زیادہ ہیں[1]۔"

مولانا عبدالباری فرنگی محلی

---

[1] ماخوذ از رپورٹ مرتبہ حضرت مولانا محمد اعزاز علیؒ

میں نے باوقات متعدد و متفرق جماعتوں اور ان کی ٹکڑیوں میں ٹھہر ٹھہر کر انکے بحث و مباحثہ کو سُنا اور دیکھا، دل بہت خوش ہوا، معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا فیضانِ خاص اس درس گاہ پر ہے، دین کی تعلیم فرشتوں کو ہو رہی ہے اس وقت تقریباً چھ سو سے زائد طلبہ ہیں، اور اکثر کا قیام مدرسہ میں ہے، اور سب مسجدِ مدرسہ میں نماز کے لئے آتے ہیں، زندگی بالکل ساکت و صامت ہے، راتوں کو ۱۲ بجے تک عام طلبہ اور اس کے بعد بھی بعض طلبہ مطالعہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، جب کوئی شخص خواہ کسی درجہ کا ہو ان کے سامنے آئے تو ادب سے سلام کرتے ہیں اور باحیا طریقہ پر جھک کر پیش آتے ہیں، یہ اسلامی اور نورانی سماں دوسرے مقام پر ہندوستان میں تو مفقود ہے کہیں مقاماتِ مقدسہ میں ہو تو ہو۔

تقسیم خوراک کے وقت میں نے دیکھا کہ ایک سلیم طریقہ پر خوراک اور اس کے لوازم بغیر کسی شور و شر کے تقسیم ہو جاتے ہیں، روٹی اور سالن کو چکھ کر دیکھا اچھا تھا اور مزے دار تھا، تعمیر کو بھی دیکھا نہایت عمدہ سلیقہ پر کرائی گئی ہے، صفائی اس قدر ہے کہ سرکاری دفاتر جن پر ہزاروں روپیہ صرف ہوتا ہے اس سے کسی طرح کم نہیں ہے، بہرحال میری توقع اور اُمید سے بہت ہی زیادہ مجھے یہ درس گاہ نظر آئی، اساتذہ خاص خاص فن میں یکتا ہیں، میرے دل سے دعا نکلتی ہے کہ خداوندِ عالم کارکنانِ مدرسہ کی عمر اور ایمان میں برکت دے افسوس ہے کہ میں نے جو کچھ دیکھا اس کے اظہار کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔"

نواب لطیف یار جنگ بہادر حیدرآباد دکن

۱۷ ذیقعدہ ۱۳۴۷ھ

❖

"میں آج بہمراہی قاضی مسعود حسن صاحب دیوبند آیا، ہم لوگوں کو مدرسہ کے حسابات دکھلائے گئے اور ہم نے تفصیل سے اس کی جانچ کی، ہم یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ حسابات رکھنے میں بہت محنت سے کام لیا گیا ہے اور بہت مفصل حساب کی کتابیں باقاعدہ موجود ہیں، ہماری رائے میں حسابات میں مشکل سے اس سے زیادہ ترقی ہو سکتی ہے، ہم یہ دیکھ کر بھی بہت مسرور ہوئے کہ نئی عمارات کے بنانے میں ترقی کی جارہی ہے کتب خانہ بہت اچھی حالت میں پایا گیا، اور اس میں بیش قیمت قلمی نسخے موجود ہیں۔"

(نواب) محمد اسمٰعیل خاں، قاضی مسعود حسن گنگوہی
ایڈوکیٹ میرٹھ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۲۹ء

دارالعلوم کے جملہ شعبوں کو بغور دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ میں نے اپنے سفر و سیاحت میں کسی جگہ ایسی عظیم الشان مذہبی درس گاہ جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک مرکزی دینی درس گاہ کہلانے کی مستحق ہو نہیں دیکھی، اور نہ موجودہ تاریخ اسکی نظیر اور ثبوت بہم پہونچا سکتی ہے۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز اور محیّر العقول کارنامہ جو اس درس گاہ میں میری آنکھوں نے دیکھا وہ یہ ہے کہ اس جامعہ کے جملہ اکابر و مدرسین نے جن میں ہر ایک اپنی نوعیت اور اپنے اپنے فن میں اعلیٰ وارفع شان کے مالک ہیں نہایت ہی معمولی معمولی تنخواہوں پر اپنی عزیز زندگی کو اسلامی خدمات کے لئے وقف کر رکھا ہے، اور نہایت خوش دلی، جوش اور اُمنگ کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول ہیں، حالانکہ ہندوستان کی دوسری درسگاہوں کے تناسب سے ان کی تنخواہیں چوتھائی بھی نہیں ہیں، اس سے ان حضرات کی بزرگی، تقدس، ایثار اور للّٰہیت کا پتہ چلتا ہے۔"

سلیمان یوسف ملان ڈربن جنوبی افریقہ ۳ر ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ

"دارالعلوم کے معائنہ کا شرف حاصل ہوا، حسابات تفصیل سے دیکھے، مجھے تعجب ہے کہ اس قدر کم عملہ اس صفائی کے ساتھ حسابات کو رکھنے پر کس طرح قادر ہے، دیگر دفاتر کے عملہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے عملہ اس قدر کم ہے کہ حیرت ہوتی ہے، حسابات صاف اور خوشخط ہیں، باوجود کوشش کے مجھے کوئی رقم یا عبارت کٹی ہوئی یا مشکوک نہیں ملی، ہر رقم کے لئے دفتر کی رپورٹ اور مہتمم کی منظوری ہوتی ہے، حسابات کو اس عمدگی کی حالت میں دیکھنے کا مجھے کوئی گمان بھی نہ تھا، ہر شعبہ میں جداگانہ مسلیں مرتب رکھی جاتی ہیں، میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ کسی بڑے سے بڑے دفتر کا بڑے سے بڑا عملہ حسابات کو جتنا شاندار اور صحیح رکھ سکتا ہے اسی قدر میں یہاں دیکھ رہا ہوں، مجھے اس سے بہتر حسابات دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، مجھے حیرت ہے کہ اس قدر کام اتنے کم اصحاب کس طرح انجام دیتے ہیں۔

طلبہ کی تعداد بہ تفصیل ذیل ۸۳۷ ہے۔"

بیرون ہند	مدینہ طیبہ	برما و آسام	بنگال	بہار	صوبہ متحدہ	پنجاب	سندھ
۴۸	۲	۱۰	۲۱۳	۳۳	۳۴۷	۱۰۱	۱۱

ریاست ہائے ہند	بمبئی	مدراس
۲۰	۵	۳

کتب خانہ نہایت باقاعدگی کے ساتھ آراستہ ہے، ہر فن کی چٹ علیحدہ رنگ کی ہے، چالیس ہزار سے زیادہ کتابیں موجود ہیں، باقاعدگی اور صفائی قابل تعریف ہے۔"

ضیاء الاسلام

مجسٹریٹ درجہ اول کاندھلہ ۱۶ر نومبر ۱۹۲۹ء

"ہم نے آج دارالعلوم دیوبند کو دیکھا، درس گاہوں کو طلبہ سے بھرا پایا، دارالاقامہ کی سیر کی جہاں طلبہ مصروفِ مطالعہ و مذاکرہ تھے، طلبہ میں سادگی، صفائی، خوش اخلاقی اور تواضع کے جوہر نمایاں ہیں، ان کی نورانی پیشانیوں سے اخلاص ٹپکتا ہے، یہ سب اکابرِ دارالعلوم کی اعلیٰ تربیت کا نتیجہ ہے۔"

محمد اسمٰعیل و محمد ادریس، جاپان ہاؤس کلکتہ
محمد احمد اینڈ سنز دہلی

میں نے دارالعلوم دیوبند کی شہرت اپنے وطن مالوف بوڈاپسٹ میں سُنی تھی اور ہمیشہ اس کا آرزومند رہا کہ علم اور صحیح اسلامی روح کے اس قلعہ کی زیارت کروں بالآخر میری تمنا پوری ہوئی اور اللہ تعالےٰ کی توفیق سے اس عدیم المثال ادارہ کو دیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ ترکی اور مصر کی قدیم طرز کی درس گاہوں کے مقابلہ میں اس دارالعلوم کی چہار دیواری میں عربی اور اسلامی علوم کی قوت اور گہرائی کو دیکھکر میں حیرت میں رہگیا۔ اس ادارہ کے پرنسپل، اساتذہ اور تمام طلباء نے مجھ جیسے ناچیز زائر کیساتھ جس محبّت و خلوص کا معاملہ کیا اس سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔"

ڈاکٹر جولینس جرمیس عبدالکریم
پروفیسر مذہبیات بوڈاپسٹ یونیورسٹی (ہنگری) ۱۰ر نومبر ۱۹۳۱ء

"مجھے آج دارالعلوم میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا، دارالعلوم اور دارالاقامہ کی صفائی قابل تعریف ہے، طلبہ کے لئے متعدد دارالاقامے ہیں، لیکن دارالاقامہ میں رہنے والے طلبہ کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ منتظمین کو مجبوراً تعداد سے زائد طلبہ کو دارالاقامہ میں رکھنا پڑتا ہے، اقامت گاہوں کی یہ حالت فوری توجہ کی محتاج ہے، خاص کر اس وجہ سے کہ طلبہ کی بہت بڑی تعداد بہت، زیادہ محنت اور کثرتِ مطالعہ کی عادی ہے۔

مطبخ سے قریب پانچ سو طلبہ کو دونوں وقت کھانا تقسیم ہوتا ہے، اس کی

قابل تعریف صفائی دیکھ کر مجھے بہت ہی مسرت ہوئی، مکھیاں جو دیوبند میں ایک بڑی مصیبت ہیں مطبخ میں بالکل مفقود ہیں، مختلف اوقات میں میں نے طلبہ کا کھانا چکھا ہے، کھانا برا نہیں ہوتا اس میں صفائی کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور اتنی مقدار میں ملتا ہے کہ ایک آدمی سیر ہو کر کھا سکتا ہے۔

کتب خانہ اس تعلیم گاہ کی جان ہے اور یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اس کی طرف کافی توجہ کی جاتی ہے، یورپ کے بڑے بڑے کتب خانوں کے مقابلہ میں اس کتب خانہ کی کچھ حقیقت نہیں، لیکن یہاں کے معلّمین و متعلمین کی ضروریات کے واسطے کافی ہے، تاہم مختلف علوم کی کتابوں کے اضافہ کی بہت ضرورت ہے، کتابیں الماریوں میں صفائی اور ترتیب سے رکھی جاتی ہیں اور علوم پر منقسم ہیں۔

میں نے حسابات کے دیکھنے اور جانچ کرنے میں کافی وقت صرف کیا، حسابات اس طریقہ سے رکھے جاتے ہیں جو آج کل مروّج ہے، میں نے اِدھر اُدھر سے مسلیں نکلوا کر دیکھیں، اور ان کا رجسٹروں سے مقابلہ کیا، تمام مسلوں میں رسیدات شامل تھیں، اور سب میں مختلف اہل کاروں کے نوٹ اور مہتمم صاحب کے آخری احکام تھے، روزنامچہ اور کھاتہ باقاعدہ رکھا جاتا ہے اور مہتمم صاحب کے سامنے برابر پیش کیا جاتا ہے۔

طلبہ سادہ اور تقویٰ کی زندگی بسر کرتے ہیں، وہ عموماً بہت خلیق اور نہایت شائستہ ہیں، مجھ پر اس تعلیم گاہ کی خوش انتظامی اور طلبہ کی نفیس تربیت کو دیکھ بڑا اثر ہوا، مجھے اس تعلیم گاہ کے طلبہ سے ملنے کا اکثر موقع ملتا ہے اور میں کبھی کبھی مختلف مبحثوں پر ان سے گفتگو بھی کرتا ہوں ان میں غیر معمولی قوتِ مناظرہ ہوتی ہے، اور ہندوستان کی دیگر تعلیم گاہوں کے معمولی گریجوٹوں کی قوتِ مناظرہ سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

لیکن اس تاریخی تعلیم گاہ کے ایک بہی خواہ کی حیثیت سے میں اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کروں گا، اگر میں یہ ظاہر نہ کروں کہ اس درس گاہ کے نصاب تعلیم میں ترمیم کی سخت ضرورت ہے، آج کل علماء کو عیسائیوں، یہودیوں اور ہندؤں کا اس قدر مقابلہ نہیں کرنا پڑتا جتنا عقلیئین کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے، وقت آگیا ہے کہ موجودہ زمانہ کے علماء کو فلسفۂ جدید اور سائنس سے آشنا کرایا جائے، میں نے یہ خیال دارالعلوم کے اکابر کے سامنے پیش کیا وہ خود اس ضرورت کو محسوس کرتے ہیں، مگر دارالعلوم کی مالیات کسی جدید انتظام کے راستہ میں حائل ہے، اگر کوئی صاحب اس تعلیم گاہ کو اس بارہ میں امداد پہنچائیں تو وہ اسلام کی بڑی خدمت کریں گے۔“

محمد یوسف الزماں فاروقی

منصف دیوبند ۶ر جون ۱۹۳۳ء

”جس قدر خوشی مجھے یہاں کے حضرات اساتذہ اور طالب علموں کو دیکھ کر ہوئی میں بیان نہیں کرسکتا، سب سے بڑی بات جو یہاں دیکھنے میں آئی وہ یہاں کے لوگوں کی سادگی اور اسلامی مساوات ہے، یہاں کا ایک ایک فرد سادگی میں رنگا ہوا ہے یہاں کے لوگوں میں جو اخلاص دیکھا اس کی مثال کم از کم ہندوستان میں تو ملنی مشکل ہے، مختصر یہ کہ اس عالی شان درس گاہ اور یہاں کے لوگوں کی تعریف میری طاقت سے باہر ہے۔

فضل الٰہی

سابق میر کلکتہ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۳۶ء

۱۳۵۵ھ میں جامع ازہر مصر کی جانب سے ایک وفد جو وہاں کے تین عالموں پر مشتمل تھا، ہندوستان آیا تھا، اکابر دارالعلوم کی خواہش پر ارکان وفد دیوبند تشریف لائے اور دارالعلوم کو دیکھ کر ذیل کے تاثرات کا اظہار کیا۔

الحمد لله حق حمده وصلى الله على سيدنا محمد رسوله وعبده وعلى آله وصحبه وحزبه وجنده وبعد فقد سُعِدنا بزيارة جامعة دار العلوم الديوبندية وطُفنا على دروسها في مختلف الطبقات واجتمعنا بمديرها فضيلة الاستاذ شبير احمد عثمانی وحضرات اساتذتنا الاكرمين فشهدنا ما ملأ قلوبنا سروراً ولمحنا للعلم في وجوههم نوراً ارأينا قوماً قد وقفوا حياتهم لخدمة علوم الدين من تفسير القرآن والحديث والفقه واصوله واضافوا الى ذلك من وسائل العلوم الشرعية كعلوم اللغة العربية والمنطق والفلسفة والهيأة ما نرجو ان يعم به النفع للامة الاسلامية ولقد تذاكرنا مع بعض رجال هذه الجامعة المباركة فشهدنا منهم في خدمة العلم ما يشهد لهم بطول الباع وسعة الاطلاع ورأينا اقبال الطلاب على الدروس وآدابهم الدينية والخلقية ما انطق السنتنا بشكر الله وطلب المزيد لنا ولهم من النعم الوافرة الباطنة والظاهرة فنسأل الله لنا ولهم توفيقاً وقبولاً وان يجعل عملنا خالصاً لوجه الله الكريم والله المستعان وصلى الله على سيدنا محمد وعلى آله وصحبه وسلم ۲ ذی القعدة ۱۳۵۵ھ

(۱۷ جنوری ۱۹۳۶ء) عبد الوهاب النجار، مدير التاريخ الإسلامي بكلية اصول الدين وعضو البعث، محمد احمد العدوی عضو البعث ومدرس التفسير بكلية اصول الدين بالازهر، محمد ابراهيم العدوی رئيس البعثة الازهرية للهند (ترجمہ)

دارالعلوم دیوبند کی زیارت سے ہم نے سعادت حاصل کی اور مختلف جماعتوں کے اسباق کا معائنہ کیا اور حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد عثمانی نیز اساتذہ کرام کے ساتھ مجالست نصیب ہوئی، ہم نے یہاں ان چیزوں کو دیکھا جنھوں نے ہمارے قلب کو مسرت سے بھر دیا، ہم نے ان حضرات کے چہروں پر علمی نور دیکھا، ہم نے یہاں وہ جماعت دیکھی جس نے تفسیر حدیث فقہ اصول فقہ وغیرہا علوم دینیہ کی خدمت کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیا ہے، اس کے ساتھ ہی ساتھ وسائل علوم یعنی لغتِ عربیہ منطق فلسفہ، ہیئت کا اس قدر اضافہ کر دیا ہے کہ ہم کو یقین ہے کہ تمام امتِ اسلامیہ کو اس سے فائدہ پہونچیگا اس مبارک جامعہ کے اساتذہ کے ساتھ ہماری گفتگو ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ علمی خدمات میں ان کو کامل دسترس اور زبردست مہارت ہے، اور ہم نے طلبہ کی توجہ اپنے اسباق اور اپنے دینی اور خلقی آداب پر اس قدر دیکھی کہ ہماری زبانون نے خدا کا شکر ادا کیا اور دعا کی کہ کامل نعمتیں ظاہری اور باطنی ہمارے اور ان کے لئے زائد ہوتی رہیں، ہم اپنے اور ان کے لئے توفیق اور قبول کی دعا کرتے ہیں کہ ہمارے اعمال میں اخلاص ہو۔"

عبد الوہاب النجار ، محمد احمد العدوی، محمد ابراہیم رئیس الوفد

بعض جماعتوں کی تعلیم کا معائنہ کیا، ماشاء اللہ دار العلوم کو ترقی کی حالت میں دیکھ کر مجھے نہایت مسرت ہوئی، خدا کے فضل و کرم سے دار العلوم نے ہر شعبہ میں ترقی کی ہے، طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے، الحمد للہ علی ذلک، تحتانیہ، تجوید اور فارسی کی جماعتوں کو خاص طور پر دیکھا، تحتانیہ جماعتوں کی تعلیم بھی مثل اعلیٰ جماعتوں کے نہایت عمدہ

حالت پر ہے ، اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ یوماً فیوماً اس میں برابر ترقی ہو، یہ جامعہ جو ہندوستان کے مسلمانوں کا واحد دینی مدرسہ ہے برابر ترقی کرتا رہے اور مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو مستفید کرتا رہے اور علم کی روشنی دنیائے اسلام میں پھیلے ۔"

سید محی الدین ، پرنسپل عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن

۱۲ر جمادی الثانیہ ۱۳۵۷ھ

"یہ میری نہایت ہی خوش قسمتی ہے کہ میں دیوبند آیا ، اور یہاں آکر دیکھا کہ قدیم اسلامی کلچر اب بھی پوری قوت کے ساتھ سرسبز ہے ، کسی مؤرخ کے لئے اس سے زیادہ روشنی بہم پہنچانے والے مواقع بہت کم میسر آتے ہیں ، میں مولانا مبارک علی صاحب (نائب مہتمم) کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے مہربانی کے ساتھ مدرسہ کی زندگی اور تعلیمی تخیل کو واضح طور سے بیان فرمایا ۔"

گوئی ونٹ ، پروفیسر تاریخ آکسفورڈ یونیورسٹی

۲۷ر مارچ ۱۹۳۹ء

"میں نے ہندوستان کے بہت سے شہروں کی سیاحت کی ، لیکن میں نے دارالعلوم دیوبند سے بڑا کوئی اسلامی مدرسہ اس ملک میں نہیں دیکھا ۔"

ایم ، آئی ، شاہ کیوچن ، صدر چینی مسلم مشن جامعہ ازہر مصر

۱۲ر اکتوبر ۱۹۳۸ء

"میں نے اس مدرسہ میں خالص اسلامی زندگی اور سادگی دیکھی جو اسلامی تاریخ میں ہم کو بجز قرونِ اولیٰ کے نہیں ملتی۔ میں نے طلبہ کی جماعتوں کو اسباق میں منہمک پایا، اور یہی حال ان اساتذۂ کرام کا ہے جو علوم کے سرچشمہ اور شریعت محمدیہ علی صاحبا الصلوٰۃ والسلام کے ستون ہیں، یہ حضرات علومِ دین کی خدمت اور امّتِ محمدیہ کو صراطِ مستقیم کی طرف لانے میں اپنی پوری کوشش صرف کرتے رہتے ہیں، خداوندِ عالم انکی کوششوں کو بارآور کرے، موجودہ زمانہ میں خصوصیت کے ساتھ یہ بڑی عبادت ہے۔"

محمود علی خاں

سکریٹری روبکاری شملہ بھوپال ۲۷؍۳؍ ۵۸ھ

"مجھے آج حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی معیت میں دارالعلوم دیوبند کے معائنہ کی سعادت نصیب ہوئی، اس زمانہ میں جبکہ تفرنج و دہریت نے قلوب و اذہان پر قبضہ کر لیا ہے، اور دنیا میں ہر طرف لامذہبیت کا دور دورہ ہے، وہ نفوسِ قدسیہ قابلِ مبارک باد ہیں جنھوں نے اس درس گاہ کی بنیاد رکھی یا جو اب اس کو نہایت کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں، گذشتہ ستر پچھتر سال میں اس مادرِ علمی کے سپوتوں نے ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام ممالک ایشیا میں دین کی روشنی کو جس طرح پھیلایا اس سے سب واقف ہیں، آج بھی یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ یہاں کاشغر و سمرقند سے لے کر جاوا و سماٹرا تک کے طالبانِ علم زیرِ تعلیم ہیں۔

مدرسہ کا کتب خانہ تمام ضروری کتابوں سے پُر ہے، طلبہ کو نہ صرف تعلیم دیجاتی ہے، اور مفت ان کے قیام و طعام کا انتظام کیا جاتا ہے بلکہ درسی کتابیں بھی مدرسہ کی طرف سے دی جاتی ہیں، انتظامی شعبہ جات نہایت اچھی حالت میں ہیں خصوصاً

حسابی شعبہ نہایت باقاعدگی سے کام کر رہا ہے۔

میں نے حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی سے اس مسئلہ پر گفتگو کی کہ اس درس گاہ میں بعض جدید علوم اور مغربی زبانوں کی تعلیم کے انتظام کی کس قدر ضرورت ہے، مجھے یہ سن کر مسرت ہوئی کہ اس سے قبل اس طرف توجہ کی گئی ہے کہ بعض انگریزی کے فارغ التحصیل طلبہ کو رکھ کر علوم دینیہ کی تعلیم دی گئی اور بعض یہاں کے فارغ طلبہ کو انگریزی کے لئے آمادہ کیا گیا، میری رائے میں کم از کم اس کی شدید ضرورت ہے کہ انگریزی زبان جو کرۂ ارض کے اکثر حصہ پر بولی جاتی ہے اور جس میں علوم جدیدہ کما حقہٗ موجود ہیں بطور زبان کے ہر طالب علم کو پڑھائی جائے تاکہ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس سے وہ باخبر ہو کر اسلام کی زیادہ خدمت انجام دے سکیں۔

مدرسہ میں ایک شعبہ ترقی و تنظیم بھی ہے جو ایک طرف مدرسہ کی ترقی کے اسباب و وسائل پر غور کرتا رہتا ہے تو دوسری طرف مدرسہ کے طلبہ قدیم اور بہی خواہوں کی تنظیم کرتا ہے، میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے آج اس کے بہی خواہوں کی فہرست میں نام درج کرانیکی سعادت نصیب ہوئی۔

مدرسہ میں طلبہ کی ورزش کے لئے ایک میدان تو ہے لیکن طلبہ پر ورزش لازمی نہیں ہے، میری گذارش پر حضرت مولانا عثمانی نے ارشاد فرمایا کہ خود اُنکے پیشِ نظر یہ امر ہے کہ طلبہ پر ورزش کو لازمی قرار دیا جائے، میں نے وعدہ کیا ہے کہ اس سلسلہ میں اپنی طرف سے سو روپیہ کا ایک حقیر ہدیہ پیش کروں گا، میری تمنا ہے کہ اس دارالعلوم کے طلبہ دماغی اور جسمانی دونوں حیثیتوں سے دوسروں کے لئے نمونہ بنیں۔"

بہادر یار جنگ، حیدرآباد دکن ۱۶ رمضان المبارک ۱۳۵۸ھ

"جیسا کہ میں نے سُنا تھا درست پایا، یہاں ہر اسلامی ملک سے طلبہ تعلیم کیلئے آتے ہیں جن کے لئے تعلیم اور رہائش کا دارالعلوم کی طرف سے ہر ممکن طریقہ سے انتظام کیا جاتا ہے، الحمد للہ کہ دینی تعلیم کا یہ مرکز نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام اسلامی دیار کے لئے ایک واحد مرکز ہے جس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

فتح الدین، ایڈوائزر حکومت پنجاب

۲۰ر شوال ۱۳۵۸ھ

"دارالعلوم دیوبند، ہندوستان میں تعلیماتِ اسلام کا مرکز ہے، کتب خانہ کا انتظام نہایت بہتر ہے، تعمیری سلسلہ کی روز افزوں ترقی اس امر کی شاہد ہے کہ دارالعلوم کو مسلمانوں میں کافی مقبولیت حاصل ہے، اس ادارہ کے عمدہ نظم وضبط کے کافی شواہد موجود ہیں۔"

(ڈاکٹر) شفاعت احمد خاں

"ایک عرصے کے بعد حاضر دارالعلوم ہونے کی مسرت حاصل ہوئی، عمارتوں کو دیکھا، اساتذہ سے ملاقات ہوئی، طلبہ سے ملا، الحمد للہ رنگِ قدیم قائم ہے ہر پہلو پر ترقی ہے، عمارتوں میں کثیر اضافہ ہوا ہے، دارالتفسیر نے گویا دارالعلوم کے سر پر تاج رکھ دیا ہے، عمارتوں میں پرانی خصوصیتیں مضبوطی، خوبصورتی اور وسعت قائم ہیں متعدد پرانی عمارتیں وسیع ہوئی ہیں، بہت سی جدید بنی ہیں طلبہ کی تعداد میں کثیر اضافہ ہوا ہے، ان کی تعداد اب ڈیڑھ ہزار ہے، مہتمم و اساتذہ اپنے فرائض میں

مستغنی ہیں، کاش اہلِ خیر بھی مستعدی میں اضافہ کریں۔"

(صدر یار جنگ) مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۳۵۹ھ

"الحمد للہ کہ آج مجھے اس شاندار اسلامی درس گاہ کے دیکھنے کا جو آپ اپنی نظیر آپ ہے موقع نصیب ہوا۔ میں جوں جوں شعبہ جات کو دیکھتا تھا میرے دل میں اس درسگاہ کی توقیر بڑھتی جاتی تھی، چوں کہ میں نے صرف نام ہی سنا تھا دیکھا نہ تھا، آج بچشم خود اس کے انتظام کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ رب العالمین کس طرح اس مدرسہ کے ذریعہ نور پاشی فرما رہے ہیں، مدرسہ کی وسعت، دارالاقامہ کے وسیع و عریض کمرے اور میدان کسی طرح سرکاری کالجوں سے جن میں انگریزی کی تعلیم ہوتی ہے اور جو موڈرن لائن یعنی آج کل کے موجودہ طریق پر چلائے جاتے ہیں کم نہیں ہے، مجھے اس مدرسہ کی تعلیمی بلندی کے ہمراہ سادگی کا پہلو بہ پہلو رہنا بہت ہی قابلِ ستائش نظر آیا۔

میں نے کتب خانہ کا انتظام بھی دیکھا، کتابیں رکھنے کا طریقہ اس قدر اچھا ہے کہ غالباً پنجاب لائبریری میں بھی موجود نہ ہو۔

اساتذہ کا خُلق اور اُن کا طرزِ تعلیم لائق تحسین ہے، اور دل پر گہرا اثر ڈالتا ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ مسلمانانِ ہند اس بے مثال تعلیمی ادارہ کی جانب کچھ کم ملتفت نظر آتے ہیں اور اس کثیر خرچ کا جو اس ادارہ میں محض غرباء کے چندہ پر ہے احساس نہیں کرتے، اس مدرسہ کے متعلق بہت سے لوگوں کے دلوں میں جو کچھ شکوک ہیں وہ غالباً اس لئے ہیں کہ انھوں نے اس مدرسہ کو بچشم خود نہیں دیکھا، ہر ایک شک کا ازالہ محض ایک معائنہ سے ہو سکتا ہے میرے خیال میں جو حضرات اس ادارہ کو دیکھیں اُنکا

فرض ہونا چاہیئے کہ اس کی خوبیاں ہر جگہ بیان فرمائیں اور اِسے اصلی رنگ میں لوگوں کے سامنے پیش کریں بلا شبہ مسلمانانِ عالم کے لئے یہ اسلامی درس گاہ ایک نعمتِ عظمیٰ ہے۔اس کی عمارت اس قدر اعلیٰ نمونہ کی ہے کہ طبیعت کے لئے باعثِ مسرت ہے، میں دعا کرتا ہوں کہ خداوند کریم اس ادارہ کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ اور اساتذہ کو تا دیر سلامت رکھے ،تاکہ وہ ہمہ تن اس کی خدمت میں مصروف رہیں اور دنیائے اسلام کے لئے باعثِ فخر ہوں "

عبدالرشید، بی اے، ایل ایل بی سکریٹری میونسپل کمیٹی

لدھیانہ ۷ اگست ۱۹۴۰ء

" عربی کالج دیوبند اپنی نوعیت کا ایک بیش بہا ادارہ ہے، اس میں نادر کتابیں اور مخطوطات موجود ہیں، یہاں کا عملہ اور دائرہ اہتمام سادگی اور بلند خیالی کا نمونہ ہیں ان کی دائمی نگرانی نے طلبہ کو بہترین اور اثر انداز اخلاقی رنگ میں رنگ دیا ہے، سب کے سب تعلیم کے حاصل کرنے میں مشغول ہیں اور اس انہماک میں انھیں اپنے معمولی آرام و آسائش کا بھی خیال نہیں ہے۔

شعبہ حساب جدید اور علمی اصول کے مطابق چلایا جارہا ہے، لیکن اس میں یہ خوبی ہے کہ قدیم حسابی طریقہ کی شان باقی رکھی گئی ہے، کتب خانہ اور کتابوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا طریقہ اس قدر مؤثر ہے کہ میرا دل چاہتا تھا کہ اس شعبہ سے کچھ عرصہ مستفید ہوں، مشرقی مسائل کے محققین کے لئے یہ ایک متبرک جگہ ہے۔

عمارت صاف ستھری اور اس کی شکست و ریخت پر نظر رکھی جاتی ہے۔

تمام دنیا سے طلبہ یہاں آکر جمع ہوگئے ہیں وہ ایک دوسرے ایسے عمدہ طریقہ

سے مل جل گئے ہیں کہ سرسری نظر سے دیکھنے والے کے لئے اُن کے اوطان کا فرق معلوم کرنا دشوار ہے، یہ سب اس خدا پرست فضا میں خوش وخرم نظر آتے ہیں۔"

بشوا ناتھ مکرجی، ایم۔ اے

ڈویزنل اکونٹینٹ محکمہ زراعت یو۔ پی ۲۶ رجون ۱۹۴۱ء

"مجھے آج دار العلوم کے معائنہ کا اتفاق ہوا، حسابات باقاعدہ رکھے گئے ہیں اور ہر ایک چیز کی تفصیل موجود ہے، محافظ خانہ میں سال وار ریکارڈ سلسلہ بسلسلہ رکھا ہوا ہے، جس سے کسی چیز کی تلاش میں کوئی دقت نہیں ہوتی، جس طرح سرکاری دفاتر میں ریکارڈ کو ترتیب دیا جاتا ہے وہی طریقہ یہاں بھی ہے، بلحاظ صفائی ہر ایک چیز اپنی جگہ پر سلیقہ سے رکھی جاتی ہے، منتظمین مدرسہ نے اپنے حسنِ انتظام سے ہر ایک شعبہ میں ایسی خوبی پیدا کر دی ہے اور کام کی تقسیم اس طرح سے کی ہے کہ ہر ایک شخص اپنے فرائض منصبی کو باحسن وجوہ انجام دے رہا ہے۔"

محمد محسن، انکم ٹیکس انسپکٹر دہلی

۲۰ رجولائی ۱۹۴۱ء

"یہ میرے لئے ایک اعزاز ہے کہ مجھے دار العلوم دیوبند کے دیکھنے کا موقع ملا، مولانا قاری محمد طیّب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے مجھے دار العلوم کی سیر کرائی جس کے لئے میں اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں، یہ ادارہ خالص مذہبی ادارہ ہے، جس کو مشرق کا الازہر کہہ سکتے ہیں، ہندوستان و بیرونِ ہند کے ہر مُسلمان کا فرض ہے کہ

وہ اس مشرقی الازہر کی نگہبانی کرے، اور اس کی امداد میں حصہ لے تاکہ مشرق میں اسلامی کلچر بہتر حالت میں جاری رہ سکے۔

میں اللہ تعالیٰ سے صمیم قلب سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس ادارہ کے بانیین و منتظمین پر اپنی برکات نازل فرمائے اور اُن کے عظیم الشان مقاصد میں ان کی مدد فرمائے۔"

عثمان کے۔ زو، نمائندہ چینی سالویشن فیڈریشن

۷ر ستمبر ۱۹۴۲ء

آج ۷ر رجب ۱۳۶۲ھ کو دیوبند حاضر ہوا، اور مدرسہ دیکھنے کا موقع ملا۔ خدا گواہ ہے کہ ایسا باقاعدہ مکمل انتظام اور دیانتداری سے کام انجام دینے والا کوئی انگریزی دفتر بھی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ حالانکہ یورپ کے ملکوں میں بہت سے دفاتر دیکھنے کا مجھے موقع ملا ہے مگر اس مدرسہ کے مقابلہ میں کم خرچ میں تو کیا بدرجہا زیادہ خرچ کرنے والے دفاتر میں بھی ایسا مکمل کام میں نے نہیں دیکھا، خداوندِ کریم سے دعا ہے کہ سب مسلمانوں کو اس کے دیکھنے اور امداد کرنے کی توفیق دے، میرے خیال میں ہر شخص کو یہ مدرسہ دیکھنا چاہیئے، صرف چند گھنٹے صرف ہوتے ہیں، ریلوے اسٹیشن مین لائن پر ہے اس لئے کوئی دشواری نہیں، صرف ارادہ کی ضرورت ہے۔"

(ڈاکٹر) احمد جلال الدین، مال روڈ، لاہور

"مجھے جناب مہتمم صاحب اور ان کے عملہ کی معیت میں دارالعلوم کی زیارت کا

شرف حاصل کر کے غیر معمولی مسرت ہوئی، میں سب سے زیادہ مہتمم صاحب اور انکے عملہ کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے دارالعلوم کو دکھانے میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا اور ہر جگہ مجھے لے جا کر تمام چیزیں تفصیل کے ساتھ دکھائیں، میں نے جماعتوں کو دوران اسباق میں دیکھا، باورچی خانہ اور لائبریری کا معائنہ کیا، طلبہ اور اساتذہ سے ملاقات کی، یہ ایک عظیم الشان ادارہ ہے، جو مہذب و شائستہ احاطوں میں تقسیم ہے، اساتذہ اپنے علم کے اعتبار سے جتنے بلند پایہ ہیں ان کا طرزِ زندگی اُتنا ہی سادہ اور اطوار و کردار پاکیزہ اور روشن ہیں، یہاں مشرقی مذاہب اور فلسفہ ہی کی تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ اس تعلیم کی حقیقی روح کے افتقار کو پورا کیا جاتا ہے، مجھے یہاں کے نصابِ تعلیم اور نقشہ اسباق کو دیکھ کر خصوصی مسرت ہوئی، یہاں طلبہ کے قیام و طعام لباس اور کتب کا انتظام بلا معاوضہ کیا جاتا ہے، اور تعلیم کی کوئی فیس نہیں لی جاتی، تقسیم طعام کا انتظام بہت شائستہ اور پسندیدہ ہے، یہ یونیورسٹی اپنے مالیات کے نظم اور مطبخ کے انتظام میں کاموں کی باقاعدگی کو نمایاں پیش کرتی ہے، میں نے اپنے وقت کا بہترین حصہ کتب خانہ میں صرف کیا اور بہت سے علمی خزائن کو دیکھ کر بے حد مسرور رہا۔

میرے معائنہ کے اختتام پر عملہ کے ارکان ایک ہال میں مجتمع ہوئے، اور میں نے ان تمام حضرات سے ملاقات کی، جناب مہتمم صاحب نے ایک نہایت عالمانہ خطبہ ارشاد فرمایا جس کا جواب میں نے اتنی ہی غیر عالمانہ تقریر میں دیا، یہاں کی حسبِ ذیل خصوصیات نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا:۔

(۱) تمام اصحابِ متعلقہ کی فروتنی اور انکسار۔

(۲) عظیم الشان ذہنی تربیت اور اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ صاف اور سادہ معاشرت اور عدم کبر و انانیت۔

(۳) قدیم تہذیب کا تحفظ نہایت پاکیزہ انداز میں۔

(۴) عمیق علم بلا نمود و نمائش۔

میں اُمید کرتا ہوں کہ یہ ادارہ سرسبز ہوگا، یہ امر موجبِ فخر ہے کہ اس تعلیم گاہ میں مصر عراق، سوویت روس، شام، ایران، افغانستان، برما، ڈچ انڈیز اور دوسرے بہت سے ملکوں کے طلبار مجتمع ہیں۔

ذریعۂ تعلیم اُردو ہے، مجھے یہ معلوم کر کے بہت مسرّت ہوئی کہ یہ طلبہ اُردو کو اپنے ممالک میں ساتھ لے جاتے ہیں اور اس طرح ہندوستانی اثرات پھیل رہے ہیں، مہتمم صاحب اور ان کے عملہ نے جس طرح میرا خیر مقدم کیا اُس سے میں نے بہت زیادہ فخر محسوس کیا، مجھے امید ہے کہ میں اس فخر و مسرّت کے حاصل کرنے کے لئے بار بار یہاں حاضر ہوتا رہوں گا۔"

جے، ڈی، شکلا، آئی، سی، ایس۔ کلکٹر سہارن پور

۸ر نومبر ۱۹۴۴ء

"آج دارالعلوم کو دیکھنے کا موقع ملا میرے خیال میں اتنے بڑے شاندار تبلیغی کام کے لئے ایسا آشرم ہونا مسلمان قوم کی ایک شان ہے، عملہ کے ممبران بڑے تپاک سے ملے، اور مجھے ہر ایک چیز تفصیل سے سمجھائی، دارالعلوم کا بورڈنگ ہاؤس اور طلبہ کی پڑھائی کا انتظام اسلامی معیار کے عین مطابق ہے خاص کر کورس کی کتابیں جو کالج کی لائبریری سے دی جاتی ہیں ایک نمونہ کا انتظام ہے، میری دعا ہے کہ یہ کالج ہمیشہ پھلتا پھولتا رہے تاکہ دہریت کے اس دور میں لوگوں کو صحیح راستہ ملنے کا انتظام قائم رہے۔

گنگا سنگھ، پرنسپل مشنری کالج امرتسر ۳۰ر جولائی ۱۹۴۵ء

"میں نے دارالعلوم کی سیر کی، ہر طرف لوگ مصروف کار تھے، طلبہ جن کی تعداد ۱۳۱۳ ہے اور جن میں سے ۸۰ سے زائد غیر ممالک کے رہنے والے ہیں، اپنے اپنے درجوں میں لکچر سننے میں محو تھے، اس میں ۴۲ پروفیسر ہیں۔

حساب وکتاب کا طریقہ بہترین ہے، گذشتہ سال آمدنی ۲۸ ۳،۶،۲ روپے تھی اور خرچ ۵،۷،۵ و۸۹ ،ا روپے ۱۰ آنہ ۱۰ پائی تھا، مجھے بتایا گیا ہے کہ سال رواں کی آمدنی کا تخمینہ ۰۰۰، ۲۵، ۳ روپے ہے۔

تاریخ داں اصحاب کے لئے دارالعلوم کا وسیع کتب خانہ مطالعہ اور حوالہ جات کے لئے نہایت بیش قیمت ہے، اس میں ۸۹۲، ۵۶ کتابیں ہیں، جس میں مغل شہنشاہوں کے عہد نیز ان سے قبل کے بیش قیمت جواہر پارے ہیں۔"

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سہارن پور

۷ر فروری ۱۹۴۵ء

"آج یہ یونیورسٹی اسلامی دنیا کی تمام یونیورسٹیوں میں مذہبی حیثیت سے بڑی مانی جاتی ہے، اس میں نوسو طالب علم دنیا کے الگ الگ حصوں سے آکر تعلیم پا رہے ہیں اور کُل پڑھنے والے ۱۲۰۰ سے اوپر ہیں، اس کی عمارت بڑی شاندار اور مضبوط ہے، حالانکہ آج ۷۰ سال سے کھڑی ہوئی ہے، مدرسے کی لائبریری میں ۵۵ ہزار کتابیں موجود ہیں، زیادہ پڑھنے والوں کو کھانا اور کتابیں مفت دی جاتی ہیں۔

مجھے ایک عرصے سے یہ یونیورسٹی دیکھنے کی تمنا تھی، اس سال موقع ہاتھ آیا، اس کی سب چیزیں دیکھ کر میں حیران اور دنگ رہ گیا، تعجب کی بات ہے کہ ایسی جگہ جو کیمیا کے جیسی ہے، شروع ہی شروع میں اپنی تاثیر سے اسنے چند جوہر پیدا کئے،

پارس پتھر کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ جو کوئی چیز اس سے چھو جاتی ہے وہ سونا بنجاتی ہے۔

ایک زمانے میں علماء دیوبند نے نہ صرف ہندوستان کی سیاست کی تحریک میں زبردست حصہ لیا تھا بلکہ دنیا کی سیاست کی تحریک میں بھی اپنا رنگ جمایا تھا، جیساکہ افغانستان، روس، اسپین، ترکستان وغیرہ میں۔"

مسز کلثوم سایانی[1]

ایڈیٹر "رہبر" بمبئی، یکم اپریل ۱۹۴۵ء

"دارالعلوم افغانستان کے عوام کی نظر میں ایک عوامی، علمی اور اسلامی درسگاہ ہے۔ مگر میں اپنے مشاہدہ کی بناء پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ صرف ایک درس گاہ ہی نہیں ہے بلکہ اسلامی ثقافت کا مرکز بھی ہے۔

دارالعلوم نے اس زمانہ میں جب کہ ہندوستان سے اسلامی حکومت رخصت ہو چکی تھی، دین اور دینی علوم کی حفاظت کی، مجھے یقین ہے کہ دارالعلوم آئندہ بھی اسی طرح علوم وفنون کی خدمت میں مشغول رہے گا۔

افغانستان کے عوام، علماء اور علم دوست لوگ اس کے قدر دان ہی نہیں بلکہ علماء کے بہی خواہ اور مددگار بھی ہیں۔

دارالعلوم ثقافتِ اسلامی کا ایک ممتاز ترین ادارہ ہے، اور آپ اپنی نظیر ہے ثقافتِ اسلامی کی بنیاد سچائی، محبت، مساوات، اخوت اور حقیقت شناسی پر

---

[1] ماخوذ اخبار "رہبر" بمبئی، یکم اپریل ۱۹۴۵ء صفحہ اوّل

مبنی ہے اور یہ ادارہ ان اجزاء پر مشتمل ہے۔

دارالعلوم کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس نے ہمیشہ راست کردار مجاہد اور راست گفتار فرزند پیدا کئے ہیں، جن پر دارالعلوم صحیح طور پر فخر کر سکتا ہے، دارالعلوم تنہا ہندوستان کا ورثہ نہیں ہے، بلکہ تمام عالم اسلامی کی میراث ہے، اس لئے میں خداوند تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس دارالعلوم کو ترقیوں کے ساتھ باقی رکھے اور عالمِ اسلامی کے لئے مفید بنائے۔"

(سردار) نجیب اللہ خاں سفیر افغانستان

نئی دہلی ۱۳۶۹ھ

"میرے لئے یہ امر باعثِ مسرت و صد افتخار ہے کہ مجھے اس قدیم اور تاریخی ادارے کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا، یہاں پر سادہ زندگی اور بلند عزائم کی روح اپنے حقیقی معنیٰ میں ملتی ہے، مجھے مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اور مولانا مبارک علی صاحب نے دارالعلوم کی سیر اپنے ہمراہ کرائی، میں نے بعض لیکچروں کو سُنا اور دیکھا کہ درجوں میں کس طرح تعلیم دی جاتی ہے، اور یہ بھی دیکھا کہ طلباء کو کس نظم و ضبط کے ساتھ کھانا تقسیم کیا جاتا ہے، مطبخ بہت صاف ستھرا تھا، دارالعلوم کی مالیات کا حساب بہت باضابطہ رکھا جاتا ہے، دارالعلوم میں ایک بہت بڑا کتب خانہ ہے جس میں مختلف مضامین پر متعدد قیمتی کتابیں ہیں، حقیقت میں یہ ادارہ ایک چھوٹی سی یونیورسٹی ہے، موذن کی آواز پر جس طرح طلباء و اساتذہ نماز کے لئے جمع ہو جاتے ہیں اس نے مجھے بہت متاثر کیا، ورزش جسمانی بھی کرائی جاتی ہے اور شام کے وقت طلباء وسیع میدان میں کھیلوں کیلئے جمع ہو جاتے ہیں۔

میں تمام متعلقین دارالعلوم کا بیحد ممنون ہوں خصوصاً مولانا سید حسین احمد صاحب

اور مولانا مبارک علی صاحب کا کہ ان حضرات نے دورانِ قیام میں بڑی عنایت وعزت افزائی فرمائی "۔

ایم، اے، امین ڈپٹی ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو

۱۰ ستمبر ۱۹۵۰ء مطابق ۲۶ ذی قعدہ ۱۳۶۹ھ

" یہ امرِ واقعہ ہے کہ میں نے دیوبند میں اسلام کا ایک قلعہ پایا، ایمان اور سُننِ نبوی کی ایک پناہ گاہ پائی اور یہاں آکر میں نے معلوم کیا کہ دین، دنیا اور آخرت دونوں کیلئے کس طرح صلاحیت رکھتا ہے، اور یہ کہ سلفِ صالح کی وہ تقلیدات جنکی بڑے بڑے بزرگوں نے محافظت کی اور جن سے محترم طلبار اقتباس کرتے ہیں ....

یہ بڑی قیمتی میراث ہے، جس کے ساتھ تمسک کرنا ہمارے لئے ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ ہم مستقبل کی تعمیر کے لئے اُسے عماد اور ستون بنائیں، اور یقیناً ہندوستان کی آزادی میں بڑے بڑے بزرگوں کی کوشش اور آزادیٔ وطن کے راستہ میں استاذِ جلیل مولانا حسین احمد مدنی کی قیادت میں اِن بزرگوں کے چہرے کی روشنی ہندوستان میں مسلمانوں کو اور اسلام کو ایسی دینی اور دنیاوی عظیم قوت پیدا کردے گی جس پر آبادی اور ایمان کے بڑے بڑے قلعے تعمیر کئے جاسکیں "۔

محمد عبدالفتاح عودہ ناظم نشریات عربی

دہلی ریڈیو

" یہی وہ جگہ ہے جہاں میں نے حقیقی اسلام کی عظمت اور قدرت کا احساس کیا، اور پایا اور اس طرح پایا کہ مسلمانوں کی صفیں نماز میں خالی نہیں اور ہر ایک آگے بڑھنے اور دوسرے کی جگہ لینے کی کوشش کرتا ہے، آخرکار ایک دن آئے گا کہ اسلام کے

اتحاد و سادگی کا سایہ مسلمانوں کی بے ریائی اور بے لوثی کے نتیجے ہیں" نور محمدی" یعنی اسلام سارے جہان پر چھا جائے گا۔

اسلام یعنی رسولِ خدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق خدا کی عبادت جس سے ہم مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں دور ہو گئے تھے اور دنیاوی مال و دولت اور جاہ و جلال نے ہماری آنکھوں کو اندھا کر دیا تھا اس اسلام کو ہم نے اس مقدس مقام میں پایا اور اسلام کی عظمت سے ہم دوبارہ آگاہ ہوئے۔"

علی امیر معز ناظم نشریات فارسی

دہلی ریڈیو

" ایک عرصے سے میری دلی تمنا تھی کہ دارالعلوم دیوبند کو بنظرِ خود دیکھوں ، میرے علم میں ہندوستان میں کوئی دوسرا علمی ادارہ اس قدر و منزلت کا نہیں ہے جس پر اسقدر کثیر روپیہ گورنمنٹ کی کسی امداد کے بغیر محض مسلم قوم کا صرف ہوا ہو، اور اس کا صحیح مصرف اس طور پر نمایاں ہو کہ اس کی عمارت میں بارہ سو طلباء کی تعلیم کا انتظام ہو ، اور تقریباً چھ سو طلباء کے لئے دارالاقامہ موجود ہو ، و نیز اسی قدر طلباء کو کھانا ، کپڑا اور کتابیں بھی تقسیم کی جاتی ہوں ، بغیر کسی ذاتی مصارف کے ہندوستان و نیز بیرونجات کا کوئی بھی خواہش مند طالب علم فارغ التحصیل ہو کر مدرسہ کی سند حاصل کر سکتا ہے ، کھانے کا انتظام دیکھ کر توحیرت ہوتی ہے کہ گویا روزانہ کسی تقریب کے سلسلے میں طعام پک رہا ہے ، اور تقسیم طعام کے طریقے نے تو اس بات کو ثابت کر دیا ہے ، کہ عربی تعلیم یافتہ انسان آجکل کے انگریزی داں طبقے سے دنیاوی اُمور میں بھی کسی طرح کم نہیں ہے ، ان کو ایک خوشنما سلیقے سے انجام دیتا ہے ، نہ صرف انتظاماتِ طعام وغیرہ ، اگر انتظاماتِ کتب خانہ پر نظر ڈالئے تو آجکل کی لائبریریاں جن میں نئی روشنی کے انتظام کو دخل ہے ، کسی طرح بھی

دارالعلوم کے کتب خانے پر فوقیت نہیں رکھتیں، صفائی کے انتظامات دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ محکمہ کسی مستقل پاس شدہ ہیلتھ آفیسر کی نگرانی میں ہے، ایک بہت ہی وسیع مسجد پانچوں وقت کی نمازوں سے جس میں کم از کم پانچ سو طلبہ نماز میں شرکت کرتے ہیں ایک ایسا منظر پیش کر رہی ہے کہ جس کی مثال ہندوستان بھر میں ملنا مشکل ہے، یہ سب کچھ حقیقت میں اللہ تعالےٰ اُن بزرگانِ دین کے طفیل میں ہم پہنچا رہے ہیں، جن کی انتھک کوششوں اور جذبۂ عمل سے دارالعلوم قائم ہوا، اور آج بھی ان کا فیض جاری ہے، اللہ تعالےٰ ایسے مقدّس نفوس کے ذریعے یہ کام انجام دلا رہا ہے جو اِن ہی درس گاہوں کے فارغ التحصیل ہیں، اور ان میں سے اکثر و بیشتر سلفِ صالحین کا نمونہ ہیں۔ اور ان کی یاد تازہ کر رہے ہیں، اور قابلِ مبارک باد ہیں یہ حضرات جو ایک قلیل معاوضے ہی پر اکتفا کر کے اس درس گاہ کا عظیم الشان کام انجام دے رہے ہیں، نیز وہ لوگ بھی قابلِ مبارک باد ہیں جنھوں نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے تعمیرات بنوائیں، اور تقریباً تین لاکھ سالانہ کا خرچ برداشت کر رہے ہیں، میری دعا ہے کہ جس طرح متوسطین اور غریب طالب علم اس درس گاہ سے فیض حاصل کر رہے ہیں، امراء کے صاحبزادگان بھی اس سے فائدہ اٹھائیں گے، اللہ تعالےٰ کارکنان کی چشمِ بصیرت میں فراوانی عطا فرمائے۔

آخر میں مہتمم صاحب، اور اُن کے رفقاء کا مشکور ہوں کہ جن کے باعث مجھے دورانِ قیام میں ہر طرح کی سہولت حاصل ہوئی، اور میری معلومات متعلق مدرسہ میں اضافہ ہوا۔"

نیاز مند شیخ محمد مستنصر اللہ، بنارسی باغ لکھنؤ

۲۳ر نومبر ۱۹۵۰ء

اپنی گزشتہ حاضری کے طویل وقفے کے بعد دارالعلوم میں دوبارہ حاضر ہونے اور اس مدت میں دارالعلوم نے جو ترقی کی ہے اس کو دیکھنے سے مجھے بڑی خوشی ہوئی، ہندوستان کے اسلامی تعلیمات کے اس عظیم ادارے میں نہ صرف ہندوستان کے حصوں سے طلبہ کھنچے چلے آتے ہیں، بلکہ انڈونیشیا، ملیشیا، افغانستان، وسط ایشیا اور چین جیسے دور دراز ممالک سے بھی یہاں طلبہ آتے ہیں، اس قدر وسیع رقبے میں دارالعلوم کی ہر دلعزیزی اسکی عظمت کا ثبوت ہے یہ ادارہ صحیح معنی میں اسلامی تعلیمات کی ایک بین الاقوامی یونیورسٹی ہے۔

میں نے گزشتہ مرتبہ ۱۹۱۴ء میں اس ادارے کا معائنہ کیا تھا، درمیانی مدت سختیوں اور تکالیف کا زمانہ تھا، لیکن مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان تمام سالوں میں دارالعلوم نے ترقی کی ہے، جدید عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں اور تعلیمی سہولتوں میں بہت زیادہ توسیع عمل میں آئی ہے، مجھے یقین ہے کہ اس ادارے کو چلانے والی علماء کی ممتاز جماعت اس کے معیار کو بڑھانے اور سہولتوں کے اضافے میں مزید ترقی کرے گی۔

مجھے یہ معلوم ہو کر بھی خوشی ہوئی کہ گورنمنٹ ادارے کے ساتھ ہمدردی اور تعاون کرتی ہے، مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی یہ عمل جاری رہے گا، اور مقامی حکام ادارے کی ضروریات اور مفاد کا خیال رکھیں گے۔

ابوالکلام آزاد، وزیر تعلیم حکومت ہند

۸ جنوری ۱۹۵۲ء

"آج مجھے دارالعلوم دیوبند کے معائنہ کا فخر حاصل ہوا، میں نے اس ادارے کے ہر شعبے کا معائنہ کیا، جس نے مجھے سب سے زیادہ متأثر کیا وہ اس ادارے میں علم کا لازمی مشرقی ماحول ہے، غالباً یہ ادارہ ہمارے ملک میں لاثانی ہے، اس کی ترقی کا راز بظاہر وہ مشنری اسپٹ (تبلیغی جذبہ) ہے جس کے ماتحت اس کا اسٹاف کام کرتا ہے، غالباً پورے ہندوستان میں طلبہ کی اتنی بڑی تعداد (۱۵۰۰) کی تعلیم، رہائش، پوشش، خوراک اور کتب کا بالکل مفت انتظام اور کہیں نہیں ہے، اُن سے کسی قسم کی فیس نہیں لی جاتی ہے، دوسری دلچسپ خصوصیت اس ادارے کی یہ ہے کہ اس کے پاس کوئی ایسی جائداد نہیں ہے جو مستقل آمدنی کا ذریعہ ہو، دارالعلوم صرف عوام کے چندے اور عطیات سے چلایا جاتا ہے، جو ہر سال وصول کیا جاتا ہے، سالانہ خرچ تقریباً ۴ لاکھ روپیہ ہے، اِس سے اُس اعلیٰ ترین عقیدتمندی کا پتہ چلتا ہے، جو اُن تمام معاونین کو دارالعلوم کے ساتھ ہے جو سال بسال اسے امداد دیتے ہیں، اس ادارہ نے جس اعلیٰ معیار کو قائم کیا ہے اس کا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب ہر سال چندہ وصول کرنے کے موقع پر لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔

میں یقین رکھتا ہوں کہ اس ادارے میں ایشیا اور افریقہ کے طلبار کی بہت بڑی تعداد کھنچ کھنچ کر آرہی ہے، مجھے بتایا گیا ہے کہ شاید اس سال اُن طلبہ کو سند دینے کیلئے جو گزشتہ ایام میں یہاں سے فارغ ہو چکے ہیں ایک جلسہ کیا جانے والا ہے، ایسا ہی ایک جلسہ اب سے ۳۰ سال قبل ہو چکا ہے، میں اس موقع کا بہت بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں، میں دارالعلوم کے اسٹاف کا اور خصوصاً پرنسپل صاحب اور سکریٹری صاحب کا ممنون ہوں۔"

ایل، ایس، بشٹ۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس سہارنپور ۵-۴-۱۹۵۲ء

"۹ر دسمبر ۱۹۵۴ء کو مجھے دارالعلوم دیوبند دیکھنے کا شرف حاصل ہوا میں اس ادارے اور اس کام سے جو اس ادارے میں علماء کرام انجام دے رہے ہیں بہت زیادہ متأثر ہوا، یہ ایک ایسا ادارہ ہے جس نے نہ صرف ایک فرقے کے لئے بلکہ پورے ملک کے لئے لیڈر پیدا کئے ہیں۔

میں اُمید کرتا ہوں کہ یہ لائق فرزند پیدا کرتا رہے گا جو قوم اور ملک کی بیش بہا خدمات انجام دے کر ہندوستان کو ایک بہت بڑی قوم بنا دیں گے، اور عالمی امن کے لئے جدوجہد کریں گے۔"

عبداللطیف وزیر عدل وصحت

(حکومت برما)

"اس عظیم دینی اور تاریخی درس گاہ کی زیارت نے مجھے مجبور کیا کہ میں بصمیم قلب اپنے ان بھائیوں کی خدمت میں مبارک باد پیش کروں جو اس کو چلا رہے ہیں میں اللہ تعالےٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس ادارے کو علم و معرفت کا منارہ بنائے اور ہمیشہ ہمیشہ مسلمانوں کو اس سے مستفید ہونے کا موقع عطا فرمائے۔"

الورالسادات

وزیر حکومت مصر (موجودہ صدر جمہوریہ مصر)

"اللہ تعالےٰ کا شکر ہے کہ اس نے اس عبدِ ضعیف کو اس عظیم الشان دارالعلوم دیوبند کی زیارت سے نوازا، اور یہاں کے اساتذۂ کرام اور علمائے عظام کی مصاحبت کی توفیق عطا فرمائی۔ اُن کے کلمات طیبات سے اِس عبدِ ضعیف کے دل وجان بہرہ ور ہوئے، انکے باقی رہنے والے آثار و تالیفات سے محظوظ ہوا، جو کہ بقول "مداد العلماء، افضل من دماء الشہداء"

(علماء کی روشنائی شہدائے کے خون سے افضل ہے) اپنے دامن میں برکات ربانی اور آسمانی فضیلتیں لئے ہوئے ہیں۔"

علی اصغر حکمت سفیر ایران برائے ہندوستان

جمادی الاولیٰ ۱۳۷۶ھ

"آپ کے دارالعلوم نے صرف اس ملک کے بسنے والوں ہی کی خدمت نہیں کی بلکہ آپ نے اپنی خدمات سے اتنی شہرت حاصل کر لی ہے کہ غیر ممالک کے طلبہ بھی آپ کے یہاں آتے ہیں، اور یہاں سے تعلیم پاکر جو کچھ یہاں انھوں نے سیکھا ہے، اپنے ممالک میں اُس کی اشاعت کرتے ہیں، یہ بات اِس ملک کے سب ہی باشندوں کے لئے قابلِ فخر ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے بزرگ علم کو علم کے لئے پڑھتے اور پڑھاتے رہے ہیں، ایسے لوگ پہلے بھی ہوئے ہیں، مگر کم، اُن لوگوں کی عزت بادشاہوں سے بھی زیادہ ہوتی تھی، آج دارالعلوم کے بزرگ اِسی طرز پر چل رہے ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف دارالعلوم یا مسلمانوں ہی کی خدمت نہیں بلکہ پورے ملک اور دنیا کی خدمت ہے، آج دنیا میں مادیت کے فروغ سے بے چینی پھیلی ہوئی ہے اور دلوں کا اطمینان اور چین مفقود ہے، اس کا صحیح علاج روحانیت ہے، میں دیکھتا ہوں کہ سکون و اطمینان کا وہ سامان یہاں کے بزرگ دنیا کے لئے مہیا فرما رہے ہیں، اگر خدا کو اس دنیا کو رکھنا منظور ہے تو دنیا کو بالآخر اسی لائن پر آنا ہے، میں دارالعلوم میں آکر بہت زیادہ مسرور ہوا، اور یہاں سے کچھ لے کر جا رہا ہوں۔"

ڈاکٹر راجندر پرشاد، صدر جمہوریہ ہند

۱۳؍ جولائی ۱۹۵۷ء

"میں بہت مسرور ہوں کہ آج مجھے دارالعلوم کو دیکھنے کا موقع حاصل ہوا، یہ دارالعلوم افغانستان میں اور خاص طور سے وہاں کے مذہبی حلقوں میں بہت مشہور و معروف ہے، افغانستان کے علماء دارالعلوم دیوبند کے بانیوں اور یہاں کے اساتذہ کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے آئے ہیں، اور علم و روحانیت کے یقین میں جو فضیلت اور مرتبت انھیں حاصل ہے اس کے ہمیشہ قائل اور مداح رہے ہیں، بہت سے افغان علماء اس دارالعلوم سے فیضیاب ہوئے، اور انھوں نے اپنے وطن عزیز واپس جاکر وہاں علم کی روشنی پھیلائی اور ملک کی خدمات انجام دیں۔"

سابق شاہِ افغانستان: محمد ظاہر شاہ کی تقریر دارالعلوم میں

"عمر بھر میں توکل کا فلسفہ آج دارالعلوم کا عمل دیکھ کر سمجھ میں آیا ہے، بانی مدرسہ اور منتظمین نے لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ کی تفسیر اور اَلسَّعْیُ مِنَّا وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰهِ کی جو تشریح اپنے عمل اور یقین اور توکل سے پیش کی ہے وہ پہلی عملی مثال ہے جو میں نے اپنی عمر میں دیکھی ہے۔

باری تعالیٰ تمام مسلمانوں کو ایسے نیک عمل کی توفیق عطا فرمائے، میں دارالعلوم کے تمام منتظمین اور خاص طور پر جناب علامہ قاری محمد طیب صاحب کی خدمت میں اس نیک کام پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔"

ایچ، ایم حسین

سکندر آباد، ۱۵ر نومبر ۱۹۵۸ء

❁

"میں اِس عظیم ادارے کی شہرت سنا کرتا تھا، اور اب مجھے اس کو خود دیکھنے کا موقعہ ملا، میں عملۂ دار العلوم کا بہت ممنون ہوں کہ اس نے مجھے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کیں اور ہر طرح مہمان نوازی کی، لائبریری اور اس کی بیش قیمت قلمی کتابوں کے ذخیرے نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا، میں نے یہاں اتنا خلوص دیکھا کہ اپنی ممنونیت کے اظہار کے لئے پوری طرح الفاظ نہیں پاتا، میں اس عمدہ کام پر جو یہاں کا عملہ اور مدرسین انجام دے رہے ہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ مستقبل میں انھیں ہر طرح کی کامیابی نصیب ہو۔

میں نے ابھی ابھی وہ رومال دیکھا جو ترکی کے حکمراں محمد پنجم نے بطور تحفہ اس چندے کے صلے میں بھیجا تھا جو دیوبند نے جنگِ بلقان کے وقت ترکی کی امداد کے لئے بھیجا تھا، یہ رومال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جبۂ مبارک پر لپٹا ہوا تھا جو ترکی میں "خرقۂ سعادت" کے خزانہ میں محفوظ ہے، میں نے ان کتابوں کو بھی دیکھا جو سلطان عبدالحمید خاں کے زمانے میں عبدالحق حمید کی معرفت جو ترکی کے مشہور شاعر اور بمبئی میں ترکی کے قونصل تھے دیوبند بھیجی گئی تھیں۔"

نیاز برکینز، ترکی

۹ مارچ ۱۹۵۹ء

"یہ دار العلوم دنیائے اسلام میں ایک بے مثال جامعہ ہے، ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہندوستان میں ایسی عظیم دینی درس گاہ اور اسلامی اخلاق کی ایسی بڑی تربیت گاہ موجود ہوگی۔"

شیخ سعد، شیخ علی، شیخ حسین حجازی

"اس لاثانی ادارے کو دیکھ کر میرا دماغی اُفق وسیع ہو گیا، میں اپنے احساسات ہندوستان ٹائمز میں ظاہر کروں گا۔"

سی، ایل، ماتھر اسٹاف رپورٹر

روزنامہ ہندوستان ٹائمز دہلی ۸ جنوری ۱۹۵۸ء

"میں نے اس ادارے کا معائنہ کیا اور یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ تعلیم باقاعدہ درس گاہوں میں دی جاتی ہے، دارالاقامہ میں رہنے والوں کے لئے جو دنیا کے ہر حصے سے آتے ہیں مناسب انتظام کیا گیا ہے۔

دارالعلوم ان لوگوں کے لئے تعلیم کا مفت انتظام کرتا ہے جو اپنے اخراجات خود نہیں برداشت کر سکتے، ایسے لوگوں کو کمرا، کھانا، کپڑا، کتابیں اور دھلائی پارچہ مفت دیا جاتا ہے، علماء اپنے فرائض میں تندہی سے مصروف ہیں جس کا معاوضہ انھیں بہت قلیل ملتا ہے، اسی وجہ سے یہ ادارہ بآسانی چل رہا ہے ہمیں کے علم میں یہ تنہا ادارہ ہے جو اسلام کی مکمل تعلیم دیتا ہے، اور ایسے علماء تیار کرتا ہے جو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح نمونہ ہیں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالے اس مدرسے، یہاں کے تمام علماء، پروفیسروں، طلباء اور بہی خواہوں پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے، خدا کرے یہ مدرسہ قیامت تک اسی جوش کے ساتھ جاری رہے۔"

سالوجی، ۱۴۰ کوئن اسٹریٹ ڈربن جنوبی افریقہ

۵ ستمبر ۱۹۵۹ء

"میں ہندوستان میں یہ توقع اور مقصد لے کر آیا کہ یہاں مجھے اسلام کے سلسلے میں قیمتی مواد فراہم ہو سکے گا، چنانچہ یہاں آنے کے بعد میں نے دارالعلوم دیوبند آنے کا ارادہ کیا کہ یہاں میں اپنا مقصد حاصل کرسکوں، یہاں آنے کے بعد نہ صرف یہ کہ میری توقعات پوری ہوئیں، بلکہ یہاں کے بہترین اخلاق اور مخلصانہ مہمان داری نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ یہاں کے فاضل علماء نے میری رہنمائی کی جن میں بالخصوص حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے میرے مقصد کے سلسلے میں میری بہترین رہبری فرمائی۔

میں نہ صرف اپنے یہاں کے انتہائی مختصر پروگرام کے دوران کی بہترین یادیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا، بلکہ واقعۃً اس بات کی کوشش کروں گا کہ مجھے ایک بار پھر یہاں آنے کی اجازت دی جائے۔

آخر میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے میری یہاں کی آمد کو کامیاب بنایا۔"

(ڈاکٹر) پی ہارڈی لیکچرار تاریخ اسلام

اسکول آف اورنٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز

یونیورسٹی آف لندن، انگلینڈ، ۲۱ر دسمبر ۱۹۶۰ء

"دارالعلوم دیوبند کو جس کے بارے میں میں نے بہت کچھ پڑھا تھا اور سنا تھا دیکھ کر میں بیحد خوش ہوا، مجھے اس کے بارے میں قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ یہ اس قدر بڑا ہوگا، جتنا میں نے اسے پایا، میں یہاں کی تواضع ومدارات اور خوش اخلاقی سے بیحد متاثر ہوں اور سب حضرات کا بیحد ممنون ہوں۔

خاص طور پر اسلامی قانون کے نکات پر مختلف علماء سے گفتگو کرنے کا جو موقع ملا اس سے

میں بہت خوش ہوا۔"

جے، ڈی اینڈرسن، ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ

لیگل اسٹڈیز اینڈ ہیڈ، ڈیپارٹمنٹ آف لا

اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز یونیورسٹی آف لندن، انگلینڈ

"مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ آج جبکہ دنیا بھر کی یونیورسٹیاں کروڑوں روپے خرچ کرتی ہیں، یہ دارالعلوم بہت ہی کم خرچ سے اس قدر بڑی اور قابلِ قدر خدمات انجام دے رہا ہے! یہ واقعہ ہے کہ اگر اس کے بانیوں اور کارکنوں میں خدا ترسی اور خدمتِ خلق کا جذبہ نہ ہوتا تو وہ اس پر ہر سال کروڑوں روپے خرچ کرتے، مگر ان کے ایثار اور خلوص کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے کبھی حکومت سے امداد کے لئے ایک پیسہ نہیں مانگا اور صرف خدا کے بھروسے اور غریب مسلمانوں کی امداد پر اسے چلاتے رہے اور آج تک چلا رہے ہیں، اگر ایسے دارالعلوم کو کوئی مشنری سوسائیٹی چلاتی تو اس کا سالانہ بجٹ کسی ریاستی بجٹ سے کم نہ ہوتا، مگر دنیا یہ سنکر حیرت کرے گی کہ دارالعلوم ایک سو سال سے کم سے کم مصارف کے ساتھ اعلیٰ سے اعلیٰ خدمات انجام دے رہا ہے، وہ علماء جو کسی سرکاری یونیورسٹی میں پروفیسر بن کر ہزاروں روپے مشاہرہ پاتے وہ اس میں اقلِ قلیل تنخواہ لے کر کام کرتے ہیں۔ اور بوریہ نشینی کے ساتھ وہ کام انجام دیتے ہیں جو ائرکنڈیشنڈ کمروں اور کرسیوں پر بھی نہیں دیا جا سکتا، یہ دارالعلوم دوسری یونیورسٹیوں کے لئے ایک مثالی یونیورسٹی ہے، اس کی سادگی اور اس کے اربابِ کار کا خلوص و ایثار اور مقصد کی لگن دوسروں کے لئے نمونہ بن سکتا ہے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ علمی اور مذہبی ادارہ فرقہ پرستی کا قائل یا حامی ہے وہ چمکتے ہوئے سورج کی کرنوں کا انکار کرتے ہیں، نہ صرف یہ ادارہ بلکہ اس کے فضلاء اور مدرسین

فرقہ پرستی کے ہمیشہ مخالف رہے ہیں، فرقہ پرستی کی مخالفت بہت معمولی بات ہے، یہ ایک منفی چیز ہے، اس ادارے نے تو سارے ملک میں حریتِ وطن کی شمع روشن کی اور قوم کو آزادی کے لئے بیدار کیا، اگر اس کے اکابر اس وقت آزادی کا نعرہ نہ لگاتے جب کہ کانگریس کا وجود تک نہ تھا تو آج ہندوستان کی تاریخ یہ نہ ہوتی جو آج نظر آرہی ہے، یہ ادارہ آزادی کا معلّم اور استقلالِ وطن کا شمع بردار رہا ہے۔ آزادی کا جو تخم اس نے بویا تھا آج ہم اسکا پھل کھا رہے ہیں۔"

پروفیسر ہمایوں کبیر

وزیر سائنسی تحقیقات وثقافتی امور حکومت ہند

(روزنامہ الجمعیۃ دہلی ۲۷؍اکتوبر ۱۹۶۱ء)

"دارالعلوم میں آکر اور اسے دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ہندوستان میں ایک انتہائی دلکش اسلامی ادارہ ہے، میں اس تعلیم گاہ کو دیکھ کر بے حد خوش ہوا جو اسلام کی اس قدر خدمت کر چکی ہے، اس ادارے میں جو تقریباً ایک صدی قبل قائم کیا گیا ایک انتہائی دلچسپ اور عظیم لائبریری ہے جس میں بیش بہا اسلامی مواد موجود ہے، سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہ ادارہ بغیر حکومت سے کوئی مالی امداد لئے ہوئے اتنے طویل عرصے سے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنا کام کر رہا ہے، مجھے امید ہے اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس ادارے پر ہمیشہ حق تعالےٰ کے احسان وکرم کی بارش ہوتی رہے گی، اور یہ ہمیشہ اس ملک کے مسلمانوں کو صحیح اسلامی تعلیمات دینے کی کوشش میں کامیاب رہے گا۔"

محمد یوسف فرانسس

۱۵ لیور پور اسٹریٹ پورٹ آف اسپین ٹرینڈاڈ، ویسٹ انڈیز

والے ساؤتھ امریکہ، ۱۰؍جنوری ۱۹۶۱ء

"آج مورخہ ۱۶ رمارچ ۱۹۶۲ء کو دارالعلوم دیوبند کے طبّی شعبہ کا معائنہ کیا، میں نے دارالعلوم دیوبند کے ان تمام آلات و اسباب کو دیکھا جو طلبہ کے استعمال کے لئے حال میں خرید کر کے منگائے گئے ہیں، آلات و اسباب کو دیکھ کر میں بہت خوش ہوا خصوصاً یہ معلوم کر کے کہ تمام سامان بلا امداد سرکار خریدا گیا ہے، ایسی عمارت ہمارے اُن کالجوں میں بھی نہیں ہے، جہاں پنج سالہ کورس چلائے جا رہے ہیں، طبّی کتب کی تعداد دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی اور مسرت حد سے زیادہ، شعبۂ طب کے لئے دارالعلوم کے باہر اسپتال کے لئے علیحدہ عمارت کا انتظام کیا جا رہا ہے، اُمید ہے کہ یہ عمارت جلد از جلد تیار ہو جائے گی، تب طبّی شعبہ کو چار چاند کا کام دے گی، اور یہ صوبہ کے عمدہ اداروں میں شمار کیا جا سکے گا۔"

باسدیو سنگھ

رجسٹرار بورڈ آف انڈین میڈیسن اتر پردیش، لکھنؤ

۱۶ رمارچ ۱۹۶۲ء

"جذباتِ عقیدت لئے ہوئے میں نے دارالعلوم کی سیر کی، جو کچھ میں نے دیکھا وہ اس سے کہیں زیادہ تھا، جو میں نے سُنا تھا، یہ ایک ایسا ادارہ ہے جس پر ہر ہندوستانی کو فخر کرنا چاہیئے، صرف یہی نہیں کہ یہ ادارہ ساری دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے، بلکہ یہ علم کا ایک بہت بڑا مرکز ہے جو کرۂ ارض کے طول و عرض میں اپنی روشنی پھیلا رہا ہے، یہ ادارہ ہر قسم کی امداد اور اعانت کا مستحق ہے۔"

جگدیش سہائے

جسٹس الہ آباد - ۱۲ رمئی ۱۹۶۳ء

"ہم ممبران لیجسلیٹو کونسل یو پی و ممبران انشورنس کمیٹی کو آج دارالعلوم میں حاضر ہوکر بہت خوشی ہوئی یہ ادارہ جو ہندوستان کی جنگِ آزادی کا سینٹر اور ملک کے اتحاد کا علمبردار رہا ہے، اور جس کی تعریف راشٹر پتا مہاتما گاندھی جیسی ہستی نے کی ہے حقیقت ہے کہ اس میں حاضری اور اس کو دیکھنا ہمارے لئے قابل فخر ہے۔

ہم کو یہ دیکھ کر بہت حیرت اور بہت خوشی ہوئی کہ یہ دارالعلوم بزرگوں کی روایات کے مطابق مفت تعلیم صرف عوامی چندے پر دے رہا ہے، اور کسی مستقل آمدنی یا کسی بڑی شخصیت کا محتاج نہیں ہے۔

یہ وہی دارالعلوم ہے جس نے مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولانا حفظ الرحمٰن جیسے رہنما پیدا کئے، دارالعلوم کے رہنما تمام ملک میں اتحاد اور امن کا کام کر رہے ہیں ہم کو اُمید ہے اور یقین ہے کہ دارالعلوم اپنے رہنما مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کی رہنمائی میں اپنی روایات جاری رکھتے ہوئے مزید شاندار مستقبل بنائے گا۔

ساوتری شیام ، شیوراج وتی نہرو ، سعید الحسن ، اسحاق سنبھلی

ایم۔ایل۔سی ایم۔ایل۔سی ایم۔ایل۔سی ایم۔ایل۔سی

"راقم سطور کے لئے یہ اللہ تعالےٰ کا بہت بڑا فضل وانعام ہے کہ اس نے ہندوستان کے شہروں کی سیاحت وزیارت کا موقع بہم پہونچایا، بالخصوص ان شہروں میں سرِ فہرست دیوبند اور اسکی دینی درس گاہ "دارالعلوم" کا درجہ ہے جو درحقیقت ہندوستان کا علم وتقویٰ سے بھرپور زندہ قلب، علماء ومؤلفین کا مرکز اور دین ومعرفت کے طلباء کی آماجگاہ ہے، اس مرکزِ علم کی زیارت عمر بھر کی تمناؤں اور لیل ونہار کے خوابوں میں سے ایک خواب وتمنا تھی خدا کا شکر ہے کہ آج دارالعلوم دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی، اور پرانا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔

دور رہتے ہوئے اس کے بارے میں جو کچھ سُنا تھا، اس کا جو کچھ ذہن میں خاکہ اور تصور تھا قریب سے دیکھ کر اس کو اس سے کہیں زیادہ اچھا وبہتر پایا۔ اس مقدس ادارے کے گوشے گوشے سے انوارِ علم کا فیضان ہوتا ہے، اور اس کی درس گاہوں میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی تعلیم دیجاتی ہے، اور تشنہ کامانِ علم اور طالبانِ رُشد ہدایت کے لئے مثالی نظم ونسق، سلیقہ شعاری اور روشن دماغی کے ساتھ اس اُسلوب سے احکامِ دین وشریعت بیان کئے جاتے ہیں جس میں اہلِ روحانیت کی روحانیت اور اصحابِ علم وتحقیق کے آثار وفیوض نمایاں طور پر جھلکتے ہیں۔

اللہ تعالےٰ کا یہ کمالِ فضل واحسان ہے کہ مجھے الشیخ المحدّث السیّد فخرالدین احمد المرادآبادی کے درس حدیث شریف کے کچھ حصّے کی سماعت کا شرف حاصل ہوا، حضرتِ موصوف نے احقر کی رعایت کرتے ہوئے حدیث بنی سلمہ پر عربی میں تقریر فرمائی جس میں ذکر ہے کہ بنی سلمہ کی خواہش ہوئی کہ وہ اپنے مکان کو چھوڑ کر مسجدِ نبویؐ کے جوار میں منتقل ہو جائیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اُن کے اس ارادے کا علم ہوا تو ارشاد فرمایا " دیارکم تکتب آثارکم " موصوف کی تقریر بیش بہا موتیوں اور تابناک ستاروں کا مجموعہ اور فیضِ باری اور عمدۃ القاری کا مصداق تھی، اسی کے ساتھ شیخ موصوف کی طرف سے ان طلباء کو جو گوش بر آواز تھے اپنے خصوصی ارشادات سے نوازنے کا سلسلہ جاری تھا جوان تلامذہ کے نفوس میں اس طرح سرایت کرتے تھے جس طرح عطر ہوا میں اور زندگی پانی میں کرتی ہے، میری دعاہے کہ اللہ تعالےٰ موصوف کو سنّتِ مطہرہ اور اس کے متبعین کی طرف سے جزاءِ خیر دے، اور اس ادارے کو

سماحۃ الشیخ صدرالمدرسین مولانا العلامۃ ابراھیم البلیاوی اور مولانا القاری محمد طیّب صاحب جیسے ارکان واساطین ائمۂ اجلّہ بدرالہدیٰ (بدر ہائے ہدایت) اور مصابیح دجیٰ (شمع ہائے ظلمت) کے زیر سایہ ہمیشہ پھلتا پھولتا

قائم رکھے، اور ان بزرگوں کے نفع بخش اوقات اور انفاس طاہرہ میں برکت عطا فرمائے۔

نیز وہ چیز جس کے لئے آج ہم سب اللہ تعالیٰ کے مرہونِ منت اور احسان مند رہے ہیں وہ یہ ادارہ ہے جو مع اساتذہ و تلامذہ کے دین کا گھنا سایہ دار درخت علم و تقویٰ کا مرکز اور جسم اسلامی کی بقار کا ضامن وہ پھیپھڑا ہے جس میں حیاتِ روحانی کے آثار رواں دواں ہیں، ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو اس ادارے کی بقار و ترقی اور اس کے علمار کو طولِ حیات سے زیادہ سے زیادہ مستفیض فرمائے۔

واللہ یُجیب ولا یُخیب رجاء الراجین فضلاً منه وکرماً۔

علم و تقویٰ کے اساطین سے مالا مال اس عظیم الشان ادارے کے علمار عظام کی خدماتِ جلیلہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں، بلکہ اگر ذرا جرأت کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہمارا ایک واجبی حق ہے جس کا مطالبہ میں کر رہا ہوں، وہ یہ ہے کہ ان علمار کرام کا فریضہ ہے کہ اپنے متفردانہ عقول کے نتائجِ فکر اور بیش بہا علمی فیوضات و تحقیقات کو عربی زبان کا جامہ پہنا کر عالم اسلام کے دوسرے علمار کے استفادے کا موقع فراہم کریں، یہ فریضہ ان حضرات پر اس لئے عائد ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص ہندوستان کے علمائے محققین کی کوئی تصنیف پڑھتا ہے تو اس میں اس کو وہ نئی متفردانہ تحقیقات ملتی ہیں جن کا مدارِ علیہ گہرے علم اور وسیع مطالعے کے علاوہ تقویٰ و صلاح اور روحانیت ہوتی ہے، اور چونکہ ہندوستان کے علمار و شیوخِ کرام نیکی و صلاح اور روحانیت اور استغراق فی العلم جیسی شروط پر نہ صرف یہ کہ پورے اترتے ہیں، بلکہ سلفِ صالحین کے صحیح وارث اور اُن کے نمونے ہیں، اس لئے ان کی کتابیں نئی اور کارآمد چیزوں سے خالی نہیں ہوتیں، وذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء بلکہ ان حضرات کی بعض کتابیں تو وہ ہیں جن میں ایسی چیزیں ملتی ہیں جو متقدمین علمائے اکابر

مفسّرین و محدّثین اور حکماء کے یہاں بھی دستیاب نہیں ہوتیں، لیکن افسوس اور قلق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان نادر تالیفات میں سے اکثر بلکہ سب کی سب اُردو زبان میں لکھی گئی ہیں، جو گو ہندوستان کی عام اسلامی زبان سہی لیکن عربی کو کثیرالاستعمال اور علوم اسلام کی خاص زبان ہونے کا جو شرف حاصل ہے ظاہر ہے کہ وہ اُردو کو حاصل نہیں، لہٰذا یہ علوم و بیش قیمت تحقیقات جو ہمارے برادرانِ اسلام علمائے ہند کا خصوصی حصہ اور کارنامہ ہیں اگر اُردو ہی کے قالب میں محبوس رکھی گئیں تو ہم عربی زبان بولنے والوں سے مخفی و پوشیدہ رہکر ہماری محرومی کا باعث بنی رہیں گی، اس طرح نہ صرف یہ ہمارے ساتھ ہی زبردست ناانصافی ہوگی بلکہ علم و دین کے حق کا بھی ایک بہت بڑا نقصان ہوگا۔

اس لئے فریضۂ معرفت اور امانتِ علم کی ادائیگی کے لئے یہ بات آولین واجبات میں سے ہے کہ ان نفیس شاہکار اور عمدہ کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جائے تاکہ ان سے وہ آنکھیں روشنی حاصل کریں جو ایسی چیزوں کے لئے بیتاب تشنہ اور مشتاق ہیں، اور جیساکہ میرا خیال ہے اس اہم ذمہ داری اور کٹھن فریضے کی ادائیگی کا کام اسی ادارۂ عامرہ کے افراد کر سکتے ہیں جو علمائے کرام اور طلبائے نجباء کا گہوارہ اور سرچشمہ ہے۔

اس موقعہ پر جبکہ میں ذمہ دارانِ ادارہ کے مشفقانہ طرزِ عمل، نوازشاتِ بزرگانہ اور طلباءِ عزیز کے جذباتِ محبّت و اُخوت کے لئے کلماتِ شکر حیطۂ تحریر میں لا رہا ہوں اپنے مذکورہ بالا حق اور مطالبے کو دُہرانے کی ایک بار پھر پُر اُمید ہو کر جرات کرنا ضروری سمجھتا ہوں، اس لئے کہ اگر ان حضرات نے اس فریضے کی ادائیگی کی طرف توجہ مبذول فرمائی تو اس طرح جہاں وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوں گے ساتھ ہی ساتھ یہ دین و ثقافت کی ایک عظیم الشان خدمت اور قابلِ ذکر کارنامہ ہوگا، کیونکہ یہ علوم دنیا کے مسلمانوں ہی کی مِلک نہیں بلکہ تمام بنی نوعِ انسان مساوی طور پر ان سے استفادے

کے مستحق ہیں چہ جائیکہ صرف ہندوستان ہی کے مسلمان ان کے اجارہ دار قرار پائیں، اس لئے ازبس ضروری ہے کہ اُردو کتابوں کے عربی میں تراجم کئے جائیں، تاکہ ان کی زیادہ سے زیادہ ترویج و اشاعت ہو، اور وسیع پیمانے پر ان سے استفادے کے مواقع فراہم کئے جاسکیں۔

مجھے یہ سن کر کسی حد تک اطمینان اور مسرت ہوئی کہ یہ اہم مسئلہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے زیرِ غور ہے، اور وہ عنقریب اس اہم بار اور ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے قدم اُٹھانے والی ہے، جو درحقیقت اس ادارے کے علماء کا اور بالخصوص طلبہ کا واجبی فرض ہے، میں اس خوشخبری کے بعد تمام علمائے اکابر کا اُن کے اس مبارک عزم اور اقدام پر تہِ دل سے پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں اور ساتھ ہی اللہ تعالےٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس کارِ عظیم میں اس کی خصوصی مدد و معاونت ان کے شاملِ حال ہو، تاکہ بسہولت وہ اس فریضے کو مرحلۂ تکمیل تک پہونچا سکیں، باری تعالےٰ کے لئے یہ کوئی دشوار امر نہیں، ولیس ذلک علی اللہ بعزیز، اور نہ ہی ان علماءِ اماجد کے لئے ان کے پختہ عزائم کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی ایسا کٹھن اور دشوار گزار مرحلہ ہے جو ناقابلِ عبور ہو۔"

عبدالفتاح ابن محمد ابو غدہ

۲۸ ربیع الاوّل ۱۳۸۲ھ

"ہم خداوند کریم کے لئے حمد و سپاس گزار ہیں کہ اُس نے اس عظیم الشان دینی ادارے کے دیکھنے کی توفیق بخشی جو دینِ اسلام کی تعلیمات و اُصول کی علمبرداری کا فریضہ انجام دے رہا ہے، اسلامی سرمائے کی حفاظت کے لئے اس ادارے کی سرگرمی ایک زندہ نمونہ ہے، مجھے اس کی سرگرمی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھ کر انتہائی خوشی

اور مسرت ہوئی، میں اللہ تعالےٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس ادارے کو پروان چڑھانے والوں کی حفاظت فرمائے اور ان کو ہر اس کام کی توفیق دے جس میں مسلمانوں کی فلاح وبہبود ہو۔"

عبدالستار امین، سفارت خانہ متحدہ عرب جمہوریہ

۲۴ر جمادی الثانی ۱۳۸۳ھ

"ہمیں اس بات کا احساس ہوا بلکہ پتہ چلا کہ یہ عظیم ادارہ اُن اہم مراکز میں سے ہے جنھوں نے اس عظیم ملک اور دوسرے ممالک میں محض دین کی نشرو اشاعت کو اپنا مقصد بنایا ہے۔

ہم مدرسہ کے ذمہ داران کا ان کی عالی ہمتی پر اور تعلیم کو عام کرنے اور زمین پر اسلام کے ستونوں کو رسوخ و ثبات بخشنے کی راہ میں یہ حضرات جو کوششیں صرف کر رہے ہیں اُن پر شکریہ ادا کرتے ہیں۔"

الشنکادی، سفارتخانہ متحدہ عرب جمہوریہ

۲۴ر جمادی الثانی ۱۳۸۳ھ

"میں نے دارالعلوم کی خدمت انجام دینے میں ہمیشہ خوشی محسوس کی ہے، چنانچہ جب میں وزیر خوراک بنا تو مجھے دارالعلوم کی خدمت کا موقع ملا تھا۔ دارالعلوم کے ہشتگانہ اصول کا جو نظریہ حضرت بانی کا ہے وہ ایک بے نظیر اصول ہے، کانگریس کے متعلق گاندھی جی کا بھی یہی نظریہ تھا، وہ کہا کرتے تھے کہ کانگریس کو غریب ہی رہنا چاہیئے اگر کانگریس دولت مند ہو گئی تو اس میں پھوٹ پڑ جائے گی، جو کانگریس کو ختم کر دے گی۔

اس ادارے کی تاریخ بڑی شاندار ہے، آج کل تعلیم کے لئے جن چیزوں اور عظیم سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے، آپ نے اُس کو چھوڑ کر بڑی سادگی اختیار کی ہے اور اس ادارے میں غریب آدمیوں کا زیادہ لحاظ رکھا جاتا ہے، آپ نے دارالعلوم میں سادگی کا جو نمونہ پیش کیا ہے میں سمجھتا ہوں اصل سوشل ازم یہی ہے، لوگ سوشل ازم کا نام تو لیتے ہیں مگر اس کے تقاضوں پر عمل پیرا نہیں ہیں، مگر آپ نے اس پر عمل کر کے دکھایا ہے، اور ایک بڑی اچھی مثال پیش کی ہے، آپ نے دارالعلوم کے ذریعے ملک کی عزت بڑھائی ہے، اور اس طرح آپ نے ہندوستان کی جو شاندار خدمت انجام دی ہے میں اُس پر آپ کو مُبارک باد پیش کرتا ہوں۔

اسلامی ممالک میں جب ہندوستان کا ذکر آتا ہے تو دارالعلوم دیوبند کا نام بھی ضرور لیا جاتا ہے، مصر کے جامعۂ ازہر میں جب میں نے اپنے آپ کو دیوبند کے قریب کا رہنے والا بتایا تو وہاں کے علماء نے بڑی خوشی کا اظہار کیا، جس سے میں نے اپنی عزت افزائی محسوس کی۔

میں امریکہ اور یورپ کے ممالک میں بھی گیا ہوں، وہاں کی یونیورسٹیاں اور وقیع ادارے دیکھے ہیں جو اچھے کام کر رہے ہیں مگر دکھلانے والوں نے ان کی برتری بیان کرنے کے سلسلے میں اُن کی شاندار عمارتوں اور اُن کے سرمایہ و دولت کا کافی تذکرہ کیا، لیکن یہاں آکر میں نے اس کے بالکل برعکس پایا، یہاں کے محترم ذمہ دار کی زبان سے اس ادارے کی خصوصیات میں غربت اور فقیری کا تذکرہ سُنا جس سے میں بیحد متاثر ہوا ہوں، حقیقتاً انسانیت کا جوہر دولت و مال نہیں بلکہ کمال ہے، جو خدا نے آپ کو دیا ہے۔

آپ صرف اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں اور یہی سب سے بڑا بھروسہ ہے، میری دعا ہے کہ یہ دارالعلوم ترقی کرے، اچھے مسلمان پیدا کرے اور ملک کی فلاح

وبہبود کی خدمت انجام دے۔"

اجیت پرشاد جین، گورنر کیرالہ
۸ ستمبر ۱۹۶۵ء

"دارالعلوم دیوبند میں ہم لوگوں کو علمائے حقانی سے مل کر بہت مسرت حاصل ہوئی ہم حق تعالیٰ کا شکرادا کرتے ہیں کہ اس نے اس خطۂ ارض کو ایسے صاحبِ فضائل اور لائقِ احترام علمار سے نوازا ہے جو علم دین کے احیار اور اس کی تبلیغ و اشاعت میں سرگرمی سے حصّہ لے رہے ہیں، درحقیقت دارالعلوم دیوبند ایک ایسا روشن چراغ ہے جو پوری دنیا کی رہنمائی کر رہا ہے۔

(جناب ابراہیم خلیل شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین خطّاط بھی ہیں، اُنھوں نے شعبۂ خوشخطی میں طلبار کی کتابت کے نمونوں کو دیکھ بڑی خوشی کا اظہار فرمایا)

موصوف نے دارالعلوم کی نسبت برجستہ جو شعر موزوں فرمائے وہ درجِ ذیل ہیں:-

مسجدِ فرخندۂ دارالعلومِ دیوبند — نور بخشندہ است درآفاق چوں شمس و قمر

عالمے را بہرہ مندِ علم دینی ساختہ — فیض بخشائے حقیقت گشتہ بر نوعِ بشر

تاجہاں باقی ست باقی باد این دارالعلوم — تاابد آباد بادا ایں منبعِ فیض و ہنر

ابراہیم خلیل
(افغانستان)

جناب درباری لال شرما چیرمین یو.پی لیجس لیٹیو کونسل لکھنؤ نے لکھنؤ واپس پہونچ کر حضرت مہتمم صاحب مدظلہٗ کے نام جو مکتوب ارسال فرمایا ہے اس میں

حسبِ ذیل تاثرات کا اظہار کیا گیا ہے:۔

"۱۱ر اکتوبر ۱۹۶۷ء کو مجھے دار العلوم دیوبند کا معائنہ کرکے بڑی مسرت ہوئی۔ دار العلوم دیوبند دینی و تعلیمی اداروں میں امتیازی شان رکھتا ہے۔ مجھے یہ معلوم ہوکر بڑی خوشی ہوئی کہ یہاں تقریباً چودہ سو طلبا رہیں۔ اس ادارہ میں غیر ملکی طلبہ کے لئے بڑی آسانیاں فراہم کی جاتی ہیں۔

یہ ادارہ سو سال سے خدمات انجام دے رہا ہے، مرحوم مولانا حسین احمد مدنی جو اس ادارہ کے عظیم سرپرست تھے، انھوں نے مہاتما گاندھی کی پکار پر انگریزوں سے جنگ کی جو مثال پورے ملک کے سامنے پیش کی ہے اس سے دیوبند کا نام ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

مجھے پوری امید ہے کہ طب یونانی کے سلسلہ میں جو اقدام اس ادارہ نے کئے ہیں وہ یونانی طبی طریقہ علاج کی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔"

دربار ی لال شرما

چیرمین یو، پی لیجس لیٹیو کونسل (لکھنؤ)

امریکی مسلمانوں کی ایک تبلیغی جماعت جو امیر رشید، ایچ، اے حمید، محمد احمد، سعید احمد، امیر حسن صاحبان پر مشتمل تھی ۱۳۷۵ھ کے اواخر میں یہاں آئی تھی۔

یہ سب امریکی نو مسلم حضرات تھے، ان کا لباس اور وضع قطع بیحد سادہ تھی، دار العلوم کے متعلق ان کا یہ جملہ یادگار رہے گا:۔

"اسلام کو ہم نے کتابوں میں پڑھا، مگر اس کا عملی نمونہ یہاں آکر دیکھا۔"

❊

"ہم کمیٹی کے ممبر ادارے کے طریقۂ تعلیم اور انتظام سے بہت زیادہ خوش ہوئے جو کہ ملک میں یکتا ہے منتظمین اور اساتذہ بہت زیادہ محنت اور محبّت سے کام کرتے ہیں۔ ہم ادارے کے بانیوں اور منتظمین کو مُبارک باد پیش کرتے ہیں"

کے لکشمن شاستری

ممبر کلاسیکل لینگو یج ڈیولپمنٹ کمیٹی۔ اے۔ پی ۲۶/۳/۱۴ء

"دار العلوم دیوبند تقریباً سو سال سے مسلمانانِ برصغیر کی علی الخصوص اور اسلامیانِ عالم کی علی العموم جو خدمات انجام دے رہا ہے وہ تاریخ کا لافانی باب ہے تعلیم اسلامی کے اس سرچشمہ سے اطراف واکناف میں دل ودماغ کی جو سیرابی ہوئی ہے وہ مسلمانوں کی ناقابلِ فراموش خدمت ہے۔

موجودہ زمانے میں دنیا ہر قسم کے بحران علی الخصوص کردار کے بحران سے دوچار ہو رہی ہے اگر ہم بانیانِ ادارہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی علیہ الرحمۃ اور حضرت مولانا محمود حسن علیہ الرحمۃ وغیرہ کے کردار کو اپنا مشعلِ راہ بنائیں اور ادارہ کے ساتھ وابستہ نصب العین کو عمل سے زندہ رکھیں تو مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ تعالے کردار کے بحران اور دیگر ہمہ قسم کی مشکلات سے نجات حاصل کرنے میں بنی نوعِ انسان کی بے مثال خدمت انجام دینگے۔ وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل کی شدّت سے ضرورت ہے، اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلّم کا بنایا ہوا یہ نسخہ دین ودنیا میں سرفراز اور سرخرو ہونیکی واحد راہِ نجات ہے، دار العلوم دیوبند کے طلباء عملاً اور ذہنی طور سے پاک وصاف ہیں خدائے تعالیٰ ہم سب کو توفیق بخشے، آپ کو کامیاب وکامران کرے۔

شیخ محمد عبد اللہ ۲۸ جنوری ۱۹۶۸ء

"میں نے سفیر متحدہ عرب جمہوریہ جناب عیسیٰ سراج الدین کی معیت میں کتب خانہ کا معائنہ کیا، میرے دل میں اس وقت کتب خانہ کی زیارت نے گہرا نقش چھوڑا ہے حضرات علماء نے زمانۂ ماضی میں نایاب قلمی ذخیرے کی فراہمی کے لئے جو زبردست سعی کی ہے ہمارے دل میں اس کی بڑی قدر ہے، اور ہم اسے ایک عظیم سرمایہ سمجھتے ہیں جو تمام دنیائے شائقین علم وفن کے لئے ہمیشہ چشمۂ جاریہ کی حیثیت سے باقی رہے گا۔"

عمر البوریشہ، سفیر مملکت شام

۱۳ر اگست ۱۹۶۸ء

"خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس زبردست مرکز کے دیکھنے کا موقع ملا جس میں خدا کا نام لیا جاتا ہے اور کتاب اللہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔

میں خدائے عزّوجل سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس مرکز کو ایسے افراد پیدا کرنے کا موقع دے جو اسلامی تحریک کی قیادت اور مسلمانانِ عالم کی عزت وعظمت کی بازآوری کا کام انجام دیں۔"

انس یوسف یاسین سفیر مملکت سعودی عرب

۲ر فروری ۱۹۶۹ء

"میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ مجھے اس ادارے کو دیکھنے کا موقع ملا جو ایک ایسے شاندار مقصد کی تکمیل کے لئے قائم کیا گیا ہے جس سے انسانیت کو حقیقی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔

اس ادارے کے ذریعے اس کے رجال کار نے تمام دنیا میں اسلام کا وہ پیغام

پھیلا دیا ہے جو امنِ عالم کی اساس اور اتحاد کی بنیاد ہے، اور اس مقدس فریضے کی ادائیگی میں اپنی زندگی وقف کئے ہوئے ہیں۔

میں ان سب کے لئے اور کارکنان کے لئے نیک توفیق اور خدا کی جانب سے جزائے خیر کی دعا کرتا ہوں، واللہ ولی التوفیق ‘‘

عیسیٰ سراج الدین، سفیر مملکت مصر

۲ر فروری ۱۹۶۹ء

’’ میری یہاں آنے کی دیرینہ تمنا تھی الحمد للہ کہ وہ پوری ہوئی، اور میں یہاں آکر بے حد مسرور اور متاثر ہوا۔ ہمارے خاندان کا اس ادارے سے گہرا تعلق رہا ہے، دارالعلوم دیوبند جو اسلامیانِ عالم کی خدمت انجام دے رہا ہے وہ قابلِ صد تحسین ہے، میری دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ اس ادارے کو اور زیادہ خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

یہاں کے اکابرین سے مل کر خاص کر مولانا محمد طیب صاحب سے مل کر مجھے بیحد مسرت ہوئی، اس کے لئے بھی میں خاص طور سے شکرگذار ہوں ‘‘

محمد فاروق عفی عنہٗ

۱۰ر فروری ۱۹۶۵ء

’’ مجھے خوشی ہے کہ میں دارالعلوم دیوبند دیکھ سکا جو آج اسلامی تعلیم کا ایک بین الاقوامی طور پر مشہور ادارہ ہے، اس مرکز میں ایک بہت بڑی لائبریری ہے، اور ڈیڑھ ہزار سے زائد طلباء یہاں زیر تعلیم ہیں، اُن میں سے ایک بڑی تعداد کو قیام و طعام اور کتابیں مفت دی جاتی ہیں، میری تمنا ہے کہ یہ ادارہ مذہبی تعلیمات کے ایک مرکز کی حیثیت سے اپنی آن بان کو باقی رکھے اور نیز ملک کی خدمت کے جذبے کو بھی فروغ دے اور

اس پر زور دے ۔"

بی گوپالا ریڈی، گورنر آف یوپی
۲۲ر ستمبر ۱۹۶۹ء

"اس عظیم ادارے کو دیکھنا ایک زبردست نیکی اور مسرت کی بات ہے، جب اس کے کچھ نوادرات کا مجموعہ اور بیش قیمت علمی خزانے دیکھنے کو ملتے ہیں تو دیکھنے والے کو یہ جملہ یاد آتا ہے :۔
سمندر کے تاریک اور اتھاہ غاروں میں شفاف کرنوں والے بڑے بڑے موتی موجود ہیں ۔
میری آرزو ہے کہ یہ ادارہ اور اس میں کام کرنے والے لوگ ہر کامرانی اور شوکت وعزت سے ہمکنار رہوں ۔"

جگرٹ، اے جیمس، انکم ٹیکس آفیسر، دہرہ دون

"میں نے آج دارالعلوم گھوم کر دیکھا، یہ ادارہ اپنے طرز کا نرالا ہے، مجھے نہیں معلوم کہ کوئی اس قسم کا دوسرا ادارہ بھی ہے، یہاں کی سادگی دیکھ کر میرے اوپر بڑا اثر پڑا، اونچے خیالات کے لئے سادگی کا ماحول بڑا ضروری ہے،
میری تمنا ہے کہ دارالعلوم اپنے معیار کو قائم رکھے اور پھولے پھلے ۔"

مہادیو پرشاد، گورنمنٹ ڈپٹی چیف وہپ
بھارت سرکار ۱۱ر اکتوبر ۱۹۶۹ء

☆

"میری بہت دنوں سے دارالعلوم دیوبند کو دیکھنے کی خواہش تھی۔

دارالعلوم کی عمارت وطلباء، اور مختلف شعبوں کو دیکھا، کتب خانہ کا نظام دیکھا، سچائی اور امن کا جو ماحول یہاں ملا وہ دوسری جگہ نہیں ہے۔

دیوبند دارالعلوم کا قیام ہی وطن پرستی سے شروع ہوا ہے، قریب سو سال سے دارالعلوم نے ملک کے سامنے اپنی وطن پرستی کا رویہ رکھا ہے۔

اس ادارے نے ملک اور ملک سے باہر غیر ملکی طالب علموں کے ذریعے ہندوستان کی ہمدردی کا پروپیگنڈا کیا ہے۔

یہ ادارہ سچائی، امن اور وطن پرستی کی تعلیم دینے والا ہے، اسی جذبے سے میں یہاں آیا اور بہت ہی اچھا اثر لے کر جا رہا ہوں۔"

رام چندر وکل شفقت جنگ، ملکی راج ممبران پارلیمنٹ

۱۲ر دسمبر ۱۹۷۱ء

جنوبی مشرقی ایشیا کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے دارالعلوم دیوبند میں چوبیس گھنٹے گذارنے پر بے انتہا خوشی ہوئی معمولی نہیں، کیونکہ میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ نہایت فیاضانہ اور مہربانی کا سلوک کیا گیا، میں دارالعلوم کی متعدد چیزوں سے بہت متاثر ہوا، اس کی عمدہ لائبریری، اس کی خوبصورت عمارات دنیائے اسلام کے ہر گوشے سے آنے والے طلباء اور ہر حالت میں اس ادارے کو چلاتے رہنے کا عزم، بانیوں کے مقرر کردہ حصول علم کے اصول۔

میں یہاں سے بے غرضانہ خدمتِ علم، ڈسپلن کی سختی سے پابندی اور مسلموں وغیر مسلموں کے ساتھ اعلیٰ رواداری کے جذبات کی ایک ایسی یادگار لے جا رہا ہوں جو

ہمیشہ میرے دل پر نقش رہے گی ۔"

ولیم ، آر ، راف ، پروفیسر تاریخ کولمبیا یونیورسٹی

نیویارک (امریکہ)

۲۰ر محرم ۱۳۹۳ھ مطابق ۲۴ر فروری ۱۹۷۳ء

"میں مدت سے یہ جذبہ رکھتا تھا کہ دارالعلوم کی زیارت کروں کیوں کہ میں اسلامک اسٹڈیز کا طالب علم ہوں، دوسرے میں ایسے پنجابی خاندان سے متعلق ہوں جسے بہت عرصے تک اسلام سے دلچسپی رہی ہے میں نے افغانستان میں سوشیالوجی (علم سماج) پر جو ریسرچ کی اس سے مجھے معلوم ہوا کہ دارالعلوم کے اثرات وسط ایشیا میں کہاں تک وسیع ہیں، مجھے اس کا شرف حاصل ہوا کہ میں اس عجیب و غریب ادارے کو دیکھوں اور اس بے غرضانہ خدمت اور ان روایت کو دیکھوں جنھوں نے ایک صدی سے دنیائے علم میں دارالعلوم کو بے نظیر پوزیشن دے رکھی ہے، اگر وہ جذبہ جو یہاں کار فرما ہے ہماری کچھ یونیورسٹیوں میں بھی پیدا ہو جائے تو اسکالروں اور طلبہ کے طبقے مالا مال ہو جائیں ۔"

جے ، پی ، ایس ، او بی رائے ، پروفیسر سوشیالوجی

دلی یونیورسٹی

۲۰ر محرم ۱۳۹۳ھ مطابق ۲۴ر فروری ۱۹۷۳ء

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالصَّلٰوۃُ عَلَى النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ !

یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ آج ہم اس عظیم الشان ادارے کو دیکھنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں جو علم و معرفت کا منارہ و سرچشمہ سمجھا جاتا ہے، اور ہدایت و معرفت

کا مرکز ہے، جس نے برِ صغیر میں علماء و محدثین کی ایک بہت بڑی جماعت تیار کی جسکے ذریعے خدائے عزّ و جل نے گمراہی و بدعت کا قلع قمع کرادیا اور اپنے دین کی حفاظت کا کام لیا۔

آج اس ادارے کی چہار دیواری میں ہمیں بہت سی چیزوں کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا، خصوصاً بے شمار کتابوں سے بھری ہوئی لائبریری، اور معزز اساتذہ سے ملاقات، جس نے دار العلوم کے اغراض و مقاصد کے سمجھنے میں بھرپور معلومات فراہم کیں۔

ہمارے دل خوشی و مسرت کے ملے جلے جذبات سے معمور ہیں، ہم ان تمام حضرات کے تہہِ دل سے شکر گذار ہیں جنھوں نے ہمارے لئے اپنی بے مثال مہمان نوازی اور پُرجوش استقبال کا مظاہرہ کیا اور جس کے نتیجے میں ہم اس عظیم الشان ادارے کو دیکھنے کا شرف حاصل کر سکے۔

خدا سے دعا ہے کہ وہ اس ادارے کے ذمہ دار حضرات کے دینی جذبات واحساسات میں مزید ترقی عطا فرمائے اور اپنے فضل و کرم سے ان کی تائید غیبی فرماتا رہے۔"

واللہ ھو الولی۔

ناظم عمومی رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ، ناظم دفتر وزارت حج و اوقاف، نمائندہ بحوث علمیہ اور افتاء، ۳۱ اگست ۱۹۷۳ء

"دار العلوم دیوبند اُفق اسلام کا ایک چمکتا ہوا ستارہ ہے اللہ کا شکر ہے کہ دار العلوم ایک صدی سے زائد اسلام کی تبلیغ اور اسلامی سائنس کی حفاظت کی خدمت انجام دے رہا ہے، یہی نہیں بلکہ اسلام کے ہر کونے میں عالم پیدا کر رہا ہے جو کہ ہمارے نبیؐ کی سنت پر سختی سے پابند ہیں، جس کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میں دار العلوم کی روحانی اور تعلیمی برادری کے ساتھ رہا ہوں اور جماعتوں،

دفاتر، لائبریری اور اس کے متبرک احاطے سے فائدہ حاصل کیا ہے، اس کی تمام فضار پر روحانیت اور علمیت کا دور دورہ ہے میرے ساتھ بڑی عزّت کا معاملہ کیا گیا جسکا اثر ہمیشہ میرے دماغ پر تازہ رہے گا اور میری زندگی میں رہ نمائی کا باعث ہوگا۔

اللہ تعالےٰ دارالعلوم پر رحمتوں کی بارش کرے اور روزِ قیامت تک تمام اطراف سے اس کی حفاظت کرے تاکہ اس کی روشنی تمام دنیا پر باقی رہے۔"

ڈاکٹر محمد اسحاق، ایم اے، پی ایچ ڈی

پروفیسر اور چیرمین شعبہ عربی اور اسلامک اسٹڈیز

یونیورسٹی آف ڈھاکہ، ڈھاکہ (بنگلہ دیش)

۲۶ر ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۲ر جنوری ۱۹۷۴ء

"میں آج اس دارالعلوم میں حاضری کو اپنے لئے باعث عزّت و افتخار سمجھتا ہوں میری نیک تمنائیں اس مرکز علم اور مرکز آزادیٔ ہند کے ساتھ ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔

خدا کرے کہ یہ دارالعلوم روز افزوں ترقی کرے اور علم و دانش کے پھیلانے میں اور خدمتِ خلق کی خدمت گذاری کے جذبے میں ترقی دینے اور حب الوطنی کے احساسات کو قوی تر کرنے میں اپنی دیرینہ کوشش و مساعی کو جاری رکھے۔"

اکبر علی خاں

(گورنر اتر پردیش)

۱۲ر دسمبر ۱۹۷۳ء، مطابق ۱۲ ذیقعدہ ۱۳۹۳ھ

-*-

"افسوس کہ میں دو دن سے بھی کم قیام کرسکا۔ لیکن یہاں بہت تھوڑے وقفے کے قیام سے مجھے بہت زیادہ تجربہ حاصل ہوا۔ میں نے دارالعلوم دیوبند کے متعلق کافی سیکھا اور پڑھا، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے متعلق ایک خاص دلچسپی پیدا ہوئی جو کچھ میں نے دیکھا اور تجربہ ہوا علماء کے حقیقی خوش آمدید اور ہمدردانہ صحبت اور علماء کی سادگی اور صاف دلی نے مجھے بہت متاثر کیا۔ یہاں کے مذاکرات اور دوستانہ گفتگو سے مجھے بہت زیادہ مسرت ہوئی اور میرے ریسرچ ورک کے پورا کرنے میں کافی ہمت افزائی ہوئی۔

یہاں کی عمدہ اور خوبصورت لائبریری نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا اور میں اُمید کرتا ہوں کہ میں آئندہ کے کام میں اسی لائبریری کو زیادہ استعمال کرسکوں گا۔ لائبریری میں ایک گھنٹہ رہ کر میں نے چار کتابیں نکالیں جو میرے موجودہ کام میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں، میں نے ہندوستان سے باہر اور اندر بہت سی لائبریریوں میں کتابیں دیکھی ہیں۔ بہت زیادہ دل کی گہرائیوں سے میں اس ادارے کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس کے اساتذہ نے مجھے خوش آمدید کہا ہے۔ یہ ادارہ اسلامی دینیات اور مذہبی سائنس میں بڑا کام کررہا ہے، خدا کی بڑی عنایات اس ادارے پر ہیں۔"

سوئس وان، ڈبلوٹروبخ
ریہوبیکراسٹریٹ، 55-53
بون مغربی جرمنی ۲۷ر مارچ ۱۹۷۴ء

"میں ایک ہفتہ سے زائد یہاں رہا۔ بچپن سے دلی خواہش تھی کہ اس مشہور و معروف دارالعلوم کو دیکھوں کیوں کہ جب میں بچپن میں قرآن شریف اور علوم دینیہ

پڑھتا تھا تو مجھے دو استاد فاضلِ دیوبند ہی پڑھاتے تھے، حالانکہ میں نے علیگڈھ مسلم یونیورسٹی میں بھی تعلیم پائی اور وہاں بہت عرصہ رہ کر ایک اعلیٰ ڈگری حاصل کی کبھی دارالعلوم کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا، خدا نے اب ایک ایسا سبب بنا دیا کہ گورنمنٹ جموں وکشمیر نے ایک دینی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے مجھے یہاں بھیجا، اس قلیل عرصہ میں میری بڑے بڑے علماء دین سے ملاقات ہوئی اور میں نے سارا دارالعلوم دیکھا خاص طور سے بخاری شریف کے درس میں بیٹھا ہوں، یہاں آکر میرا ذہن سدھر گیا خاص طور سے یہاں پر اصلی دینِ اسلام ہے، میرے دل میں خواہش پیدا ہوگئی کہ کشمیر میں اس دارالعلوم کی ضرور نقل کی جائے اور مدرسہ قائم ہو جو کہ یہاں کے انتظام سے وابستہ ہو، میں نے ہر ایک شعبہ کا معائنہ کیا، خدا کا شکر ہے کہ جو مجھے یہاں لایا اور خدا کے فضل سے محظوظ و مسرور ہو کر جا رہا ہوں، بہرحال یہاں سے صحیح دینِ اسلام لیکر جا رہا ہوں۔"

عبدالخالق ہمدانی ڈپٹی سیکریٹری محکمہ قانون
جموں وکشمیر گورنمنٹ
۲۲ راگست ۱۹۷۴ء

"ہم نے دارالعلوم دیوبند کی زیارت کی اور ہمیں بے حد خوشی ہے کہ اس کو خیال و تصوّر سے بلند تر پایا، اللہ تعالےٰ سے ہماری دعا ہے کہ وہ دارالعلوم کے لئے خدمتِ علوم کی سعادت برقرار رکھے اور دارالعلوم اسی طرح اپنی کامیاب زندگی گذارتا رہے اللہ جل شانہ سے ہماری یہ بھی التجا ہے کہ وہ ہمیں اہلِ السنت والجماعت کے عقیدے سے ہمیشہ وابستہ رکھے اور گمراہ فرقوں کے شر سے محفوظ فرمائے، دنیا میں مزید اس جیسے مدارس کو وجود بخشے اور سارے عالم کے لئے اس کے نفع کو عام کر دے،

جس سے توقع ہے کہ انشاء اللہ روئے زمین پر اسلام کا دورِ اول پھر سے واپس آجائے گا۔"

ڈاکٹر محمد یوجل سول انجینئر، استانبول
ذکی جلب، ۵ر شعبان المعظم ۱۳۹۴ھ

"دارالعلوم دیوبند ایک ایسا قومی ادارہ ہے جس پر بجا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے، یہاں آکر مجھے بے حد خوشی ہوئی، یہاں کا طریقۂ تعلیم، طلبار کو حاصل سہولتیں اور اساتذہ کا علم و فضل غالباً سارے ملک میں منفرد ہے اس ادارے نے بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی اس سے قوم و ملک کو بیش بہا فائدے پہنچیں گے۔"

شہباز حسین، ترقی اُردو بورڈ
وزارتِ تعلیم حکومت ہند

"حامداً و مصلیاً

آج ہمیں اس مرکزی درس گاہ "دارالعلوم دیوبند" کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی، جو اپنے مخلص ذمہ داروں اور کارکنوں کے ساتھ دین کی خدمت میں سرگرم عمل ہے، دیوبند کی اس اسلامی یونیورسٹی میں حاضری فی الواقع ہماری خوش نصیبی ہے ایک حقیر رقم (جو اس عظیم ادارہ کے شایان شان تو نہیں تاہم وہ اسلامی اخوت و محبت اور اس کے ساتھ ہمارے مخلصانہ تعلق کی آئینہ دار ضرور ہے) سے اس کی خدمت میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں، ہم نے یہاں علمار ہند کی مساعی کے طفیل دو چیزیں دیکھیں جو ہمارے تصور سے بالاتر تھیں، خدائے تعالےٰ ان حضرات علمار

کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ہم سب کو نیک کاموں کی توفیق بخشے۔"

وفد رابطہ علماء عراق بغداد معتمد جمعیۃ الشیخ نوری
رکن الجمعیۃ الشیخ ابن منصور السعدی رکن الجمعیۃ الشیخ ابراہیم
یکم ذیقعدہ ۱۳۹۴ھ

"آج مجھے دوسری مرتبہ دارالعلوم دیوبند کو دیکھنے کا موقع ملا، میں نے پہلی حاضری کے بعد سے اب تک دو سال کے عرصے میں ہونے والی اس ادارے کی ترقیات کو دیکھ کر بڑی خوشی محسوس کی اس کے اساتذہ کی کاوشیں قابلِ احترام اور اس کے طلباء کی ترقیات قابلِ ستائش ہیں، خدا سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو اسلام اور مسلمانانِ عالم، خاص طور پر ان قابلِ قدر ہندوستانی علماء حضرات کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے جنھوں نے اسلامی تہذیب و ثقافت اور علم و عرفان کی اشاعت کے لئے اپنے آپکو وقف کر دیا ہے اور ہمیں اپنی مرضیات کی توفیق دے، آمین۔"

شیخ محمد الحکیم مفتی حلب (شام)
۹ ذیقعدہ ۱۳۹۴ھ

"اس عظیم ادارہ یعنی جامعہ دارالعلوم نے اسلام کی زبردست خدمت کی ہے، اسلئے مجھے حضرت مولانا محمد طیب صاحب اور ادارے کے دیگر پروفیسر حضرات سے اپنی ملاقات پر فخر ہے۔ میں ادارہ کا بیحد ممنون ہوں کہ یہاں ملیشیا کے طلبہ کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا گیا ہے"

تان سری حاجی عبدالخالق
ہائی کمشنر ملیشیا [illegible] ۲۵ مارچ ۱۹۷۵ء

"میں نے دارالعلوم دیوبند کی زیارت کی اور یہاں کچھ وقت گذارنے کی سعادت حاصل کی، میں نے طلبار کو دیکھا کہ وہ محنت وجانفشانی کے ساتھ طلبِ علم میں لگے ہوئے ہیں اور دوسری طرف اساتذہ کے بارے میں بھی اندازہ ہوا کہ خلوصِ قلب کیساتھ افادۂ علمی کی خاطر ہر جدوجہد کے لئے کمربستہ ہیں۔

دارالعلوم میں جو نظام چل رہا ہے اس کے تحت طلبہ نہایت سہولت وآسانی کیساتھ قیام وطعام اور تعلیم وتدریس سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

میں یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دارالعلوم کے مہتمم صاحب کے زہد وتقوی اور رفعت علمی اور اخلاص وللّٰہیت ہی کے یہ آثار ہیں جو اس ادارہ میں مشاہد ہوئے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ فضلائے دارالعلوم تمام شہروں اور ملکوں میں پہنچکر اشاعتِ علم میں کامیابی کے ساتھ مشغول ہیں۔

ہم سب کی یہ دعار ہے کہ اللہ تعالےٰ دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داروں اور اساتذہ وطلبار اور بہی خواہوں کو بے مثال اجر وثواب سے نوازے۔"

عبدالحلیم محمود شیخ الازہر

۲۶ر اپریل ۱۹۷۵ء

"میں نے دارالعلوم کی زیارت کی اور اس کی علمی سرگرمیاں معلوم کرنے کا شرف حاصل ہوا خصوصاً احادیث وتفسیر کے سلسلہ میں اس کی خدمات قابل تعریف ہیں، بڑی خوشی محسوس ہوئی جب ان حضرات کے کلماتِ عالیہ عربی زبان میں سننے کا موقع ملا۔

دعا ہے کہ اللہ جل شانہ اس ادارے کو تادیر قائم رکھے، اور اس کے بانی کو مغفرت سے نوازے اور اسی طرح جو بھی اس کیخدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

اور مسلمانوں کو اس بات کی توفیق دے کہ اس عوامی ادارے کی خوب خوب مدد کریں۔

اللہ گواہ ہے کہ جو کچھ ہم نے خیال ظاہر کیا ہے وہ قلب کی نیک تمنائیں ہیں، اور دارالعلوم کی یہ نیک زیارت یکشنبہ کے دن ۲۹ر شعبان ۱۳۹۵ھ موافق ۷ر ستمبر ۱۹۷۵ء کو ہوئی۔"

والسلام

علی عبید محمد غزالی دولۃ الامارت العربیۃ

"مدت سے دارالعلوم دیوبند کی شہرت سن رکھی تھی اور میرے علم میں یہ بات بھی تھی کہ اس کے اساتذہ عربی زبان کو اطراف ہند میں مکمل جد و جہد کے ساتھ پھیلا رہے ہیں تو یہ باتیں میرے لئے بڑی خوشی کا سبب بنتی تھی۔

ایک زمانے سے اس کی زیارت کا اور علماء دارالعلوم کی زیارت کا مشتاق تھا اور جب میں نے یہ سنا کہ وہاں کے طلبہ عربی میں بڑی جانفشانی سے لگے ہوئے ہیں حتیٰ کہ انکے اور اساتذۂ دارالعلوم دیوبند کے مضامین اور کتابیں بھی عربی میں آنے لگی ہیں تو میرا اشتیاق اور بھی بڑھ گیا، حتیٰ کہ میرا یہ اشتیاق دن بدن ترقی کرتا رہا اور اللہ سے میں نے دعاء کی کہ میری موت اُس وقت تک نہ آئے جبتک کہ میں دارالعلوم کی زیارت نہ کرلوں، اس کے علماء اور طلباء سے ملاقات نہ کرلوں۔"

الحمدللہ کہ میری یہ تمنا پوری ہوئی اور میں نے اپنی مراد پالی اور اس کی زیارت ایک دن نصیب ہوئی جس کو تا قیامت بھی نہیں بھول سکتا، اور وہ دن ۲۶ر اپریل یکشنبہ ۱۹۷۵ء کا دن تھا اور میں نے اپنی آنکھ سے جو کچھ یہاں دیکھا وہ کانوں کے سُنے ہوئے سے بہت زیادہ تھا، ایک طرف طلبہ اپنے اسباق میں محو ہیں تو دوسری طرف اساتذہ

اپنی ذمہ داری کے احساس میں غرق ہیں، اور عربی زبان جو کہ قرآن وحدیث کی زبان ہے اسکو اپنا سرمایہ سمجھتے ہیں۔

اور اس کے عظیم کتب خانہ کو بھی دیکھنے کا موقع ملا تو واللہ لغت اور تاریخ کی بے انتہا کتابیں پائیں۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالے دارالعلوم دیوبند اور اس کے علماء کو ہر قسم کی توفیق اور ترقی سے نوازے اور اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ ادارہ اسلام کے قلعوں میں سے ایک محفوظ قلعہ ہے، اللہ تعالے ان لوگوں کی مکمل اعانت فرمائے جو اس میں لگے ہوئے ہیں کہ دین اسلام کی خوب خوب خدمت کریں، واللہ ولی التوفیق "

محمد الفحام شیخ الازہر السابق

"اللہ تعالے نے مجھے اور میرے ساتھی استاذ عبدالرحمن کو جو کہ عربی دینی پرچے "البلاغ" کے ایڈیٹر ہیں جو "کویت" سے نکلتا ہے اس اسلامی عظیم قلعہ کے زیارت کی توفیق بخشی، جسے ہم دارالعلوم دیوبند ازہرالہند سے یاد کرتے ہیں۔

یہ زیارت بروز جمعہ ۷ر ذی القعدہ ۱۳۹۵ھ موافق ۱۱ر نومبر ۱۹۷۵ء کو اس وقت ہوئی جب کہ ہم سب ندوۃ العلماء لکھنؤ کے تعلیمی جشن کے سلسلہ میں اسلامی وفد کی صورت میں حاضر ہوئے تھے۔

بحمداللہ ہم نے اس ادارہ کو خوب پایا، دل بھر کر دیکھا، سن تو پہلے ہی چکے تھے، مسرت محسوس ہوئی اور مجھے طلبہ سے بھی خطاب کا موقع ملا، اس جلسہ میں جو مہمانوں کی تعظیم میں منعقد کیا گیا تھا۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالے اس اسلامی ادارے کو دینِ حنیف کی خدمت اور اسلامی دعوت کی خوب خوب توفیق دے، اللہ ہی توفیق کا

ماالک ہے۔"

یوسف السید ہاشم رفاعی سابق وزیر حکومت کویت

۷ ذیقعدہ ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۱ نومبر ۱۹۷۵ء

"اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں اس بات پر کہ اس نے دارالعلوم کی زیارت کی توفیق عنایت فرماکر ہم پر احسان فرمایا۔

دیار مصر اور خطۂ عرب میں اس ادارے کا خوب چرچا ہے اور سب ہی اس کے ذکر میں رطب اللسان ہیں اور از ہر ہند سے یاد کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ادارہ اپنی زندگی اور ہر سرگرمی کو اسلام کی خدمت کے لئے مخصوص کئے ہوئے ہے، اور اسلام کا جھنڈا اس کی بنا پر بلند ہے اور پورے عالم کو اس کی روشنی پہنچ رہی ہے، واللہ جتنا سنا تھا اس سے کہیں زیادہ پایا اور اسی طرح یہاں کے علماء کا تبحر فی العلم اور مسلسل جدوجہد اور اپنے طلبہ کے ساتھ خیر خواہی، اللہ اور اس کے رسول اور دین کے لئے نیک جذبہ، یہ ایسی چیزیں تھیں کہ میرے خوشی کی انتہا نہ رہی۔

اور مہمانوں کے ساتھ ان کا اخلاق انداز بیان اور سنجیدگی، یہ چیزیں اور بھی حُسن کو دوبالا کر رہی تھیں۔

اللہ تعالیٰ سے یہ التجا ہے کہ جس طرح اس نے اس ادارہ کو اس خطۂ ارض میں علوم قرآن وحدیث کا روشن چراغ بنایا ہے، اسی طرح اس کو اپنے مقصد میں کامیاب فرمائے اور اس کا ہر اگلا دن پچھلے سے اچھا ثابت ہو، جس طرح آج کا دن کل گذشتہ سے بہتر ہے اور اس کے طلبہ جو اس کی پیداوار ہیں انکو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا صحیح وارث بنائے اور میں اپنے ان بھائیوں کی جانب سے جو قطر میں رہتے ہیں ان کی تمنائیں پیش کرتا ہوں۔"

عبدالمعز عبدالستار (قطر) ۷ ذیقعدہ ۱۳۹۵ھ م ۱۱ نومبر ۱۹۷۵ء

"میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت خیال کرتا ہوں کہ خدا کے فضل وکرم سے آج میری بہت ہی دیرینہ تمنا اس مشہور ادارے دارالعلوم دیوبند کی زیارت کی پوری ہوئی، یہ ادارہ اسلام، عربی زبان اور ملکی زبانوں کی بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے، تعلیم رہائش اور خوراک کا انتظام قابلِ تقلید ہے، مجھے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ طلبہ کو خوراک اور کمرے مُفت دیئے جاتے ہیں، یہ ادارہ ۱۸۶۶ء میں تقریباً سات سو روپے سالانہ آمدنی سے شروع ہوا اور امسال کا بجٹ ۲۶ لاکھ روپے سے بھی زیادہ ہے اور یہ سب اخراجات صوبائی یا مرکزی حکومت کی کسی امداد کے بغیر صرف عوامی چندہ کے ذریعے پورے ہوتے ہیں، میں خاص طور سے مولانا محمد طیب مہتمم اور ان کے اسٹاف کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میرے معائنے کے سلسلہ میں تکلیف اُٹھائی۔

لائبریری کو دیکھ کر مجھے انتہائی خوشی حاصل ہوئی جس میں عربی، فارسی اور اُردو کے نایاب مخطوطات ہیں، قرآن شریف کے کچھ مخطوطات قدیم آرٹ کے بیش بہا نمونے ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو ترقی عطا فرمائے۔"

منظور عالم قریشی

سفیر ہند برائے سعودی عرب ۵ مارچ ۱۹۷۶ء

"دارالعلوم دیوبند جو ایک عظیم معہد علمی ہے اس کی زیارت سے مشرف ہوا اور قلب کو اطمینان محسوس ہوا کہ جب تک ان جیسے حضرات جو دارالعلوم دیوبند میں لگے ہوئے ہیں اور اس کے علمی کارنامے انجام دے رہے ہیں موجود ہیں، اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہونچے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ عظیم کارنامے جو یہ حضرات انجام دے رہے ہیں، یعنی مُسلمانوں کی دینی اُمور کی رہنمائی اور تعلیم و تربیت یہ اللہ کے راستے میں ایک عظیم جہاد ہے،

اللہ تعالےٰ آپ حضرات کو توفیق سے نوازے اور آپ کی مدد فرمائے ۔ اور اپنی ذمہ داری ادا کرنے کی ہر صلاحیت سے نوازنے اور مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی مدد کریگا۔

حسام الدین

۱۲ر مارچ ۱۹۷۶ء

آج میں نے دارالعلوم کو دیکھا ۔ یہاں علم کے تعلق سے جو کام ہو رہا ہے اسکی مکمل کامیابی کا میں خواہاں ہوں ۔ مجھے نہایت مسرت حاصل ہوئی ۔ یہ ادارہ عوام کی اصلی خدمت انجام دیتا رہے یہ میری دلی خواہش ہے ۔

باسدیو سنگھ اسپیکر اترپردیش اسمبلی

۱۶ر مئی ۱۹۷۶ء

مجھے دارالعلوم دیوبند کو دیکھکر مسرت ہوئی، اس درس گاہ نے علم و عرفان کی روشنی سے دنیا والوں کے دلوں کو منوّر کیا اور اس کی مایہ ناز ہستیوں نے ملکی سیاست میں نمایاں کارنامے انجام دے کر اپنی عظمت کا پرچم بلند کیا ہے ۔ اس سے بھی سبھی بخوبی واقف ہیں کہ یہ ادارہ ملک میں اپنی علمی ملی اور سیاسی خدمات میں ممتاز رہا ہے ۔

میں اس کے کتب خانہ میں نادر کتابوں کے عظیم ذخیرہ کو دیکھ کر متاثر ہوا ۔ مجھے مولانا قاری محمد طیب صاحب ان کے شرکا رکار اساتذہ اور طلبہ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دارالعلوم دیوبند کو نئی روشنی میں پرانی روایات کو قائم رکھتے ہوئے آگے بڑھنے کی توفیق عطا فرمائے اور ملک و ملت کی خدمت میں ہمیشہ اس کو نمایاں مقام حاصل ہو ، آمین ۔

فخر الدین علی احمد صدر جمہوریہ ہند

۲۴ر اپریل ۱۹۷۶ء

"میں اس بات پر فخر اور عزت محسوس کرتا ہوں کہ مجھے دارالعلوم دیوبند کو دیکھنے اور یہاں کے علماء، اساتذہ اور دوسرے کارکن اور طلبہ سے ملنے کا موقع ملا جو ان علماء سے تعلیم و تربیت حاصل کر رہے ہیں اس ملاقات نے ہمارے لئے اس بات کا موقع فراہم کیا ہے کہ ہم اپنی طرف سے اور تنظیم آزادی فلسطین کی طرف سے اس درس گاہ کے علماء اساتذہ اور اس ادارے کے ماضی اور مستقبل کے بارے میں اپنے اچھے جذبات کا اظہار کریں۔

نیز ہندوستانی عوام کا اس بات پر بھی شکریہ ادا کریں کہ انھوں نے ہمیشہ فلسطین اور عرب عوام کی تائید کی ہے، ہندوستانی عوام کا یہ رویہ دنیا کے دوسرے ممالک کے عوام کے لئے بھی قابلِ تقلید ہے، ہندوستانی عوام کا موقف ان اعلیٰ اصول اور اقدار پر مبنی ہے جو ہندوستانی عوام اور اپنی آزادی اور اپنی عزت کے لئے لڑنے والے فلسطینی عوام کے درمیان مشترک ہیں۔

اپنے تأثرات اور شکریہ کے الفاظ کو ختم کرنے سے پہلے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنی طرف سے اس خواہش اور اُمید کا اظہار کریں کہ "تنظیم آزادی فلسطین" آپ کے صد سالہ جشن میں شرکت کرے گی، اور اس وقت تک عرب فلسطینی عوام اپنی آزادی کو حاصل کرنے اور اپنے وطن کی مقبوضہ سرزمین کو واپس لینے میں کامیاب ہو چکے ہوں گے۔

اللہ تعالےٰ ان اُمیدوں کو بر لائے۔

فتحی عبدالحمید ناظم دفتر تنظیم آزادی فلسطین دہلی

۱۱ رجولائی ۱۹۷۶ء

"ہم گورمنٹ مشنری کالج دہلی کے پربندھک اور طلباء اس ادارے کی واقفیت حاصل کرنے کے لئے آج بتاریخ ۱۴ر جولائی ۱۹۷۶ء یہاں حاضر ہوئے، غازی صاحب اور وائس چانسلر صاحب سے اس ادارے کی تاریخ اور انتظامات کے بارے میں واقفیت حاصل کی، جس پیار اور عقیدت سے دونوں حضرات نے اور تمام اسٹاف نے کافی وقت لگاکر صرف اس ادارے کی ضروری واقفیت ہی نہیں دی بلکہ اسلام اور سیکولرازم کے قریبی رشتے اور اصولی ایکتا کی بات بڑے زور سے دہرائی، ہمیں اپنے ادارے کو چلانے کے لئے ان حضرات سے کافی روشنی اور سیدھ ملی ہے جس کے لئے ہم ان کے لئے تہِ دل سے مشکور ہیں، خدائے تعالیٰ ایسے دن لائے کہ ہم میں باہمی اتفاق اور عقیدت بڑھے اور مل جل کر ایک دوسرے کے کام آسکیں۔

مہندر پرتاپ سنگھ

۱۴ر جولائی ۱۹۷۶ء

"دارالعلوم میں حاضری آج بڑی مدت کے بعد ہوئی، اس دوران میں اس کے کئی نئے شعبوں اور سابقہ ترقیوں کے دیکھنے کا موقع ملا، حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ کے اہتمام اور نگرانی میں ہندوستان کا یہ علمی اور روحانی ادارہ علم دین کی خدمت میں معروف ہے، اپنی ۱۱۲ سال کی زندگی میں اس نے اسلامی علوم کے بہت سے شعبوں میں ہزاروں ایسے اصحاب فضل وکمال پیدا کئے جن کے اثرات اس برصغیر ہی میں نہیں بلکہ دوسرے ممالک میں موجود رہے ہیں اور اب بھی یہ موجود ہیں، گزشتہ دس سال میں کتب خانہ میں کتابوں کا اچھا اضافہ ہوا ہے، لیکن افسوس ہے کہ جگہ کی کمی کی وجہ سے وہ زیادہ مرتب حالت میں نہیں، لائبریری کے لئے واقعتاً ایسے ایسے کئی ہالوں کی ضرورت ہے، دارالعلوم کی صد سالہ تقریب کا بڑے پیمانہ پر

کام شروع کردیا گیا ہے اور ایک کمیٹی اس کے عملی پہلوؤں پر کام کر رہی ہے، یہ ایک ضروری تقریب ہے جسے دارالعلوم کے شایانِ شان منایا جانا چاہئے۔ مجھے یہ معلوم کرکے بھی خوشی ہوئی کہ دارالعلوم کے پورے کیمپس کے پلیننگ پر بھی منتظمین متوجہ ہیں، یہ بہت ضروری کام ہے، تعمیر و ترقی کے آئندہ کام پلان کے ماتحت ہی ہونے چاہئیں، میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ دارالعلوم ترقی کی نئی منزلیں بھی حسن وخوبی سے طے کرے، منتظمین کو وہ مزید ہمت و قوت عطا فرمائے اور اسکی خدمات کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا جائے۔

(حکیم) عبدالحمید

متولی ہمدرد دواخانہ دہلی

میں اس عظیم اسلامی درس گاہ کی زیارت سے مشرف ہوا، میں نے جو عظیم کارنامے یہاں دیکھے ہیں اس سے دلی خوشی محسوس ہوئی، یہ ادارہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے سلسلہ میں بڑے اہم کام انجام دے رہا ہے۔

ایسے وقت میں جبکہ مادّیت نے تمام اصول و اقدار کو پامال کر رکھا ہے اس طرح کے اداروں کی شدید ضرورت ہے، دارالعلوم دیوبند اسلام کا ایک اہم ترین قلعہ ہے اور اس کو چلانے والے لوگوں کے بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ بہترین لوگوں میں سے ہیں کیونکہ سب سے بہتر لوگ وہی ہوتے ہیں جو قرآن کی تعلیم و تدریس میں مشغول ہوں میں اس ادارہ کیلئے مزید ترقی کا متمنی ہوں اس ادارہ کی مثال میرے نزدیک وہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:-

مثل کلمة طيبة كشجرة طيبة اصلها ثابت وفرعها في السماء

اس ادارے کے افراد علم نافع کے ہتھیاروں سے لیس کفر کی تاریکیوں میں منارۂ نور اور مشعلِ ہدایت کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ حضرات امت کی رہنمائی دین اور دنیا دونوں کی بہتری کی طرف کرتے ہیں، تمام مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس ادارے کی ہر طرح اعانت کریں، اور ہر شخص کا یہ لازمی فریضہ ہے کہ اس کا خیال رکھے میں اللہ تعالیٰ سے سب کے لئے توفیق اور صلاح کی دعا کرتا ہوں۔

مقبول عبدالکافی

مدرسہ تحفیظ القرآن (مکہ مکرمہ)

آخر میں دو منظوم معائنے پیش ہیں :۔

حاجی ضیاء الاسلام صاحب ضیاؔ رئیس کاندھلہ ضلع مظفر نگر ایک نغز گو شاعر ، علم دوست بزرگ ، جدید تعلیم سے آراستہ اور قدیم مشرقی تہذیب کی دلدادہ شخصیت تھے ، ادبی حلقے انھیں ادب نواز اور ایک پختہ کار شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں ، موصوف ۱۳۴۸ھ میں تشریف لائے ، دارالعلوم کو دیکھ کر آپ کے شاعرانہ قلب میں جو تأثر پیدا ہوا ذیل کی نظم اُن ہی تاثرات کا نتیجہ ہے :۔

خوشا دارالعلومِ دل نشین ست — خجستہ مرکزِ تعلیمِ دین ست

مثالِ قرطبہ در ہند این ست ، — بہ فیضِ مصر و ازہر این چنین ست

بہر سُو جلوۂ دینِ مبین ست — زخوانِ علم ہر کس خوشہ چین ست

حدیثِ رحمۃٌ للعالمین ست — زقال اللہ زبان پُر انگبین ست

زہے خم خانۂ علم و یقین ست — پُر از آبِ بقا ہر ساتگین ست

بہر دل نورِ عرفاں جاگزین ست — سہیلِ نورِ ایماں ہر جبین ست

بہ کارِ خویش ہر رکنِ رکین ست — ز لغزش دور از رحمت قرین ست

بقائے دینِ احمد را حمین ست — کہ ہم روشن ضمیر و ہم امین ست

عجب شانِ مکان و ہم مکین ست — نزولِ فضلِ ربُّ العالمین ست

" اگر فردوس بر روئے زمین ست
ہمین ست و ہمین ست و ہمین ست

ضیاء الاسلام مجسٹریٹ درجۂ اوّل کاندھلہ

۱۶ ر نومبر ۱۹۲۹ء
۱۳۴۸ھ

مولانا ظفر علی خاں مرحوم ایڈیٹر اخبار "زمیندار" لاہور پر دارالعلوم کو دیکھ کر جو تاثر ہوا وہ اُن کی مندرجہ ذیل نظم سے واضح ہے یہ نظم اسی زمانے میں اخبار "زمیندار" لاہور میں شائع ہوئی تھی۔

شاد باش و شاد زی، اے سرزمینِ دیو بند! ہند میں تو نے کیا، اسلام کا جھنڈا بلند

مِلّتِ بیضا کی عزّت کو لگائے چار چاند حکمتِ بطحا کی قیمت کو کیا تو نے دو چند

اِسم تیرا با مسمّیٰ، ضرب تیری بے پناہ دیوِ استبداد کی گردن ہے اور تیری کمند

تیری رجعت پر ہزار اقدام سو جاں سے نثار قرنِ اوّل کی خبر لائی تری اُلٹی زقند

تو علم بردارِ حق ہے، حق نگہباں ہے ترا خیلِ باطل سے پہنچ سکتا نہیں تجھ کو گزند

ناز کر اپنے مقدّر پر کہ تیری خاک کو کر لیا اُن عالمانِ دینِ قیّم نے پسند

جان کر دیں گے جو ناموسِ محمدؐ پر فدا حق کے رستے پر کٹا دیں گے جو اپنا بند بند

کفر نا چاجن کے آگے بارہا تگنی کا ناچ جس طرح جلتے توے پر رقص کرتا ہے سپند

اس میں قاسمؒ ہوں کہ انور شاہؒ و محمود الحسنؒ سب کے دل تھے دردمند اور سب کی فطرت ارجمند

گرئی ہنگامہ تیری ہے حسین احمد سے آج
جن سے پرچم ہے روایاتِ سلف کا سر بلند

مثنوی فروغ

مثنوی فروغ دارالعلوم دیوبند کی ایک قدیم منظوم تاریخ ہے، یہ مثنوی دارالعلوم دیوبند اور اکابرِ دارالعلوم کے ابتدائی حالات کا دل چسپ مرقع ہے، اور چشم دید شہادت ہونے کی وجہ سے مستند ماخذ اور ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے، مثنوی فروغ اس وقت لکھی گئی تھی جب دارالعلوم دیوبند اپنی عمر کی دوسری دہائی سے گزر رہا تھا، یہ وہ زمانہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند" مدرسہ اسلامی عربی دیوبند" کے نام سے موسوم تھا، مگر اس "عالمِ طفلی" ہی میں اس کی غیر معمولی مقبولیت اور شہرت و عظمت سے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ نوخیز پودا بہت جلد ایک تناور درخت بننے والا ہے ؎

بالائے سرش زہوشمندی | می تافت ستارۂ بلندی

معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ مثنوی نے ان آثار کو پوری فراست اور دوربینی سے محسوس کرلیا تھا، انھوں نے اس کی پیش گوئی اس طرح کی ہے ؎

مدرسہ دیبَن[1] کا ہے، اب لاجواب | اور ابھی آیا نہیں اس پر شباب
عالمِ طفلی میں ہے یہ، اُس پر ابھی | دیکھنا اس کو جوانی میں کبھی!
مٹ گئیں سب جہل و بدعت کی رسوم | دیوبند اب ہوگیا دارالعلوم

---

[1] مثنوی فروغ میں دیبَن اور دیوبند دونوں طرح نظم کیا گیا ہے۔ (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

مثنوی فروغ سے دارالعلوم دیوبند کے درس و تدریس، تعلیم و تعلّم کی کیفیت، اس کی شہرت و مرکزیت، دارالعلوم کے بزرگوں و اساتذہ کا علمی تبحر، دارالعلوم کے بزرگوں کے علم و فضل، زہد و تقویٰ کے علاوہ عام مسلمانوں کے دلوں میں اُن کی قدر و منزلت اور دارالعلوم کی نسبت جو تصورات اس وقت قائم تھے ان کا ایک ایسا نقشہ سامنے آتا ہے جو کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتا۔

قیام دارالعلوم کے ابتدائی زمانے ہی میں جہاں دیوبند کے اطراف و جوانب کے علاوہ ملک کے دور دراز خطّوں سے طالبانِ علم آنے شروع ہو گئے تھے، وہیں دارالعلوم دیوبند کی مالی امداد و اعانت کرنے والوں میں دور دراز مقامات کے اہلِ خیر کے شامل ہو جانے سے دارالعلوم دیوبند کو علمی اور تعلیمی لحاظ سے مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

مثنوی فروغ کی وجہ تصنیف

مصنّف نے مثنوی فروغ کی وجہ تصنیف بتلاتے ہوئے لکھا ہے ؎

اور اطراف و جوانب میں ہیں جو! — استعانت مال سے کرتے ہیں وہ

غیر ملکوں کے بہت سے دین دار — جان و دل سے اس کے ہیں خدمتگذار

چاہتا ہوں میں بھی کچھ خدمت کروں — زر نہ ہونے سے مگر مجبور ہوں

اس سبب سے میں نے اے عالی جناب — مدح لکھی تاکہ حاصل ہو ثواب

سب تو دیتے ہیں وہاں مالِ کثیر — پاس میرے ہے یہ تحریرِ حقیر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) عوام تو عام طور پر دِیبَن ہی بولتے ہیں مگر کبھی کبھی اہل علم بھی دیوبند کے بجائے ضرورتِ شعری سے دِیبَن نظم کرتے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰنؒ (والد ماجد مولانا شبیر احمد عثمانیؒ) نے اپنے ایک قصیدے میں دِیبَن ہی لکھا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

ہے یہ دارالعلم شاہا یادگارِ سلیں ÷ کوردہ دِیبَن سا جس سے رشکِ شہرِ طوس ہے

مولانا فضل الرحمٰن کی ایک مثنوی کا تاریخی نام "قصۂ غم دیبن" ہے تفصیل کے لئے "تاریخ دیوبند" سے مراجعت کی جائے۔

گو نہیں مجھ کو سخن میں کچھ شعور   شاعری سے ہوں میں صدہا کوس دور
اس کو لکھا ہے مگر بہرِ ثواب   نظم ہے مہمل کہو یا لاجواب

مثنوی فروغ میں دارالعلوم دیوبند کے حالات کے علاوہ بزرگانِ دارالعلوم میں شیخ المشائخ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی، قدس سرہٗ، قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، حضرت حاجی محمد عابد دیوبندیؒ حضرت مولانا رفیع الدین دیوبندی اور حضرت مولانا سید احمد دہلوی، رحمہم اللہ اور دوسرے اراکینِ دارالعلوم کے فضائل ومناقب بیان کئے گئے ہیں، مناقب کے ضمن میں کچھ ایسی باتیں بھی آگئی ہیں جن سے ان حضرات کے ایسے حالات معلوم ہوتے ہیں جن کا اب تک علم نہ تھا۔

یہ مثنوی دارالعلوم دیوبند کی سب سے زیادہ قدیم منظوم تاریخ ہے، سالانہ رودادوں کے علاوہ اُس زمانے کی اور کوئی تاریخ موجود نہیں ہے، مثنوی فروغ ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء میں مطبع نظامیؒ کان پور میں چھپی ہے، مگر مطبوعہ ہونے کے باوجود نایاب ہے، اس کا نسخہ شاذ ونادر ہی کہیں ملتا ہے، دارالعلوم کے کتب خانے میں اس کا صرف ایک ہی نسخہ ہے جو بہت ہی بوسیدہ ہوچکا ہے، ادب اُردو کی فہرست میں یہ نسخہ نمبر ۳۵، ۶۹/۷، ۸۸ پر درج ہے۔

مثنوی فروغ کے آخری اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ تصنیف کے کئی سال کے بعد چھپنے کی نوبت آئی ہے۔

لہ ہندوستان میں ابتداً جو مطابع قائم ہوئے اُن میں سے مطبع نظامی کان پور بھی تھا، یہ مطبع ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں عبدالرحمٰن خاں شاکر نے قائم کیا تھا، مطبع نظامی نے اپنے دور میں کتابوں کے چھاپنے کا بڑا کام کیا ہے، جب دارالعلوم دیوبند قائم ہوا تو مطبع نظامی کان پور نے اپنی مطبوعات سے دارالعلوم کی بڑی مدد کی تھی، دارالعلوم دیوبند کی ابتدائی رودادوں میں تفصیل سے ان کا ذکر ملتا ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

لکھا ہے :-

میں نے پائی میں یہ لکھ کر مثنوی ۔۔۔ شوقِ دل سے آرزوئے طبع کی

پیر و مرشد نے کیا جب انتقال ۔۔۔ روح کو میری ہوا صدمہ کمال

طبع ہونا کیسا اور کیسی کتاب ۔۔۔ محو دل سے ہو گیا آرام و خواب

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ میرے ایک کرم فرما منشی محمد شاہ میر متوطن جلال آباد نے جو یہاں ریاست میں مقیم ہیں مثنوی کے طبع کرانے کے لئے اصرار کیا اور خود ہی مطبع نظامی کو توجہ دلائی، لکھا ہے :-

پھر انھوں نے ازرہِ لطف و کرم ۔۔۔ خط کیا مطبع نظامی کو رقم

اس کے چھپنے کیلئے واں کو لکھا ۔۔۔ آخرش بر آیا دل کا مدعا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مطبع نظامی کی بہت سی کتابیں دار العلوم دیوبند کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

عبد الرحمٰن خاں شاکر کا ایک فارسی قطعہ تاریخ وفات جو انھوں نے حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی وفات پر لکھا ہے، مثنوی فروغ کے آخر میں درج ہے، قطعۂ تاریخ یہ ہے ؎

آہ قاسم علی فقیہ زماں ۔۔۔ عاشقِ حضرتِ شفیعِ امم

پنجشنبہ جمادی الاولیٰ ۔۔۔ بچہارم روانہ شد بارم

باز احمد علی وحید العصر ۔۔۔ حامیٔ شرعِ سیدِ عالم

در ہمیں ماہ و روزِ شنبہ بود ۔۔۔ بششم در جناں نہاد قدم

ایں دو علامۂ زماں بودند ۔۔۔ حاجی و فقہ داں فرشتہ شیم

در غمِ ایں دو مہرِ شرعِ رسول ۔۔۔ شد بروئے زمیں بپا ماتم

کلکِ شاکر نوشت ایں تاریخ ۔۔۔ رضی اللہ عنہما دائم

۱۲۹۷ھ

ان کے الطاف و توجہ سے چھپی　　　نذر کرتا ہوں اسے احباب کی

دارالعلوم دیوبند کے علاوہ جامع مسجد کی تعمیر کے حالات بھی بیان کئے گئے ہیں، یہ مثنوی کم و بیش ۷۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔

مثنوی فروغ کے مصنّف

مولانا عبدالکریم فروغ دیوبند کے رہنے والے تھے، ان کے والد کا نام مولوی عبدالرحیم تھا، دیوبند کے قریب جانب جنوب تین میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ املیا واقع ہے، یہاں صدیقی شیوخ کا ایک معزز خاندان بارھویں صدی ہجری کے اواخر سے آباد ہے، مولوی عبدالرحیم اسی املیا کے رہنے والے بزرگ تھے، ان کے دو فرزند تھے، مولوی عبدالکریم فروغ اور مولوی فضل عظیم، ان دونوں حضرات نے دیوبند کے محلہ دیوان میں سکونت اختیار کرلی تھی، مولوی عبدالکریم فروغ نے ۱۲۹۶ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، دارالعلوم دیوبند میں داخلے کے لئے اپنے نفس کو اس طرح متوجہ کیا ہے ؎

مدرسے میں علمِ دیں تحصیل کر　　　خدمتِ حضرت میں رہ شام و سحر

دیکھ مجمع ہے وہاں کیسا عجیب　　　جمع ہیں واں کیسے کیسے خوش نصیب

عمر کو تو ان کی صحبت میں گذار　　　تو بھی تا بن جائے کامل دیندار

دارالعلوم سے فراغت کے بعد مولانا عبدالکریم فروغ جودھ پور چلے گئے اور وہاں ریاست میں ملازم ہو گئے، ریاست جودھ پور میں اُن کا قیام قصبہ پالی میں رہا اور وہیں رہتے ہوئے اُنھوں نے مثنوی فروغ لکھی، خود اُن کا بیان ہے ؎

میں نے پالی[1] میں لکھ کر مثنوی　　　شوقِ دل سے آرزوئے طبع کی

---

[1] پالی ریاست جودھ پور کا پہلے ایک قصبہ تھا مگر اب ضلع بن گیا ہے، یہ ایک صنعتی شہر ہے یہ مرفہ حال مسلمانوں کی بستی ہے، یہاں کپڑے کے کئی کارخانے ہیں، پالی میں ایک بڑا مسافر خانہ بھی ہے، پالی ریلوے لائن پر واقع ہے۔

دوسری جگہ کہتے ہیں :۔

مشتعل ہے آتشِ شوق اس قدر　　دل پھُنا جاتا ہے جس سے اور جگر

مثل طائر ہوں میں اور پابی قفس　　اُڑ تو جاؤں پر نہیں کچھ اپنا بس

بختِ بد نے کر دیا ایسا تباہ　　ہو گیا دین مجھے برسوں کی راہ

مولانا عبدالکریم فروغ، حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے حقیقی نانا تھے، وہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ سے بیعت تھے، خود لکھتے ہیں ؎

تھا عجب کچھ ذکر وہ لذت فزا　　پیر و مرشد مولوی یعقوب کا

افسوس ہے کہ مثنوی فروغ کے علاوہ ان کا دوسرا کلام دست یاب نہیں ہے، مولانا عبدالکریم فروغ کے انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی، صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ ان کی عمر زیادہ نہیں ہوئی ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء کے لگ بھگ انھوں نے متھرا میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں۔

تاریخی واقعات کو نظم کا جامہ پہنانا آسان نہیں ہے، مثنوی فروغ کا ہر شعر رواں دواں ہے، جس سے فروغ کے قادرالکلام شاعر ہونے کا ثبوت ملتا ہے، ان کے کلام میں شگفتگی، روانی، بے ساختگی، پختگی اور قوتِ بیان پائی جاتی ہے، قوافی میں آمد اور برجستگی ہے یہ مثنوی مصنف کے دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کے ساتھ والہانہ عقیدت و تعلق کی آئینہ دار ہے۔

مثنوی کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ اس میں کوئی داستان نظم کی جائے، حمد، مناجات نعت، منقبت، مدح اور وجہ تصنیف وغیرہ مضامین مثنوی کے ضروری اجزاء ہوتے ہیں، اس کے علاوہ مثنوی میں رزم و بزم، تصوف و اخلاق وغیرہ مضامین بھی بیان کئے جا سکتے ہیں، مثنوی کے لئے پوری نظم کا ایک ہی بحر میں ہونا ضروری ہے، مثنوی فروغ میں یہ سب اجزاء موجود ہیں، واقعہ نگاری میں تسلسل اور روانی ہے۔

پیر و مرشد سے والہانہ تعلق

اُنھیں اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ (اوّلین صدر مدرسین دارالعلوم دیوبند)

سے بڑا عقیدت مندانہ اور والہانہ تعلق تھا جس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے ہوتا ہے

مجھ کو بھی شوقِ زیارت آپ کا — دل ہی دل میں ہے بہت تڑپا رہا

اب مجھے آفاق میں کوئی بشر — آپ سے ہرگز نہیں محبوب تر

ہے یہی حسرت کہ خدمت میں رہوں — رات دن بس آپ کو دیکھا کروں

حاضرِ خدمت میں رہوں شام و سحر — بہرِ خدمت باندھ لوں اپنی کمر

کفش برداری میسّر ہو مجھے — اے خوشا قسمت زہے طالع مرے

سامنے وہ شکل نورانی رہے — پھر نہ کچھ فکر و پریشانی رہے

اے خوشا طالع زہے انکے نصیب — آپ سے جو رہتے ہیں ہر دم قریب

ہے میسر رات دن قرب آپ سے — لُوٹتے ہیں دین و ایمان کے مزے

پھر لگی ہونے طبیعت بے قرار — حد سے بڑھ جانے لگا پھر اضطرار

مشتعل ہے آتشِ شوق اس قدر — دل بُھنا جاتا ہے جس سے اور جگر

دیکھئے کب ہو طبیعت کو قرار — مطمئن کب ہو دلِ اُمیدوار

کیسا اطمینان اور کیسا قرار — چاہتا ہوں میں تو اُس محفل میں بار

حاضرِ خدمت ہوں جاکر دیوبند — مضطرب چاہے رہوں یاں سے دوچند

اے اثر بخشِ دُعا سے دردمند — مجھ کو بھی جلدی سے پہونچا دیوبند

کیوں کہ یہ میرا دلِ پر اضطراب — ہو رہا ہے اب بہت بے صبر و تاب

پھر مجھے وہ شکل نورانی دکھا — پھر وہی دیدار ہو صبح و مسا

جان و دل اون پر فدا کرتا رہوں — دل سے اُن کا اقتدا کرتا رہوں

سب تو دیکھیں وہ رُخِ رحمت نمط — میں رہوں حسرت ہی حسرت میں فقط

مجھکو ہووے رنج اور انکو سرور — رات دن وہ پاس ہوئے اور میں دور

دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کے حالات اور اُس کے فیوض و برکات کے سلسلے میں لکھا ہے :۔

ہے وہاں اک مدرسہ اسلام کا	جس نے دی آئینہ دیں کو جِلا
ہند میں یوں اُس کی عز و جاہ ہے	جس طرح دنیا میں بیت اللہ ہے
واقفِ دیں کر دیا ہر ایک کو	جہل کی رسمیں گئیں سب محو ہو
ہاتھ سے بھی جو نہ چھوتے تھے کتاب	بن گئے ہیں اب وہ فاضل لاجواب
اب وہ ہیں صہبائے علمیت میں چُور	سَر سے پا تک ہے برستا اُن پہ نُور
نام سے جو علم کے بے علم تھے	اب وہی حفّاظ و علّامہ ہوئے
غیر ملکوں کے بھی صد ہا آدمی	بن گئے یاں آکے عالم متقی
علم کا خانہ بخانہ شور ہے	ہر طرف کو دینِ حق کا زور ہے
مشکِ اذفر ہیں وہیں کی باصفا	ہند کل جس سے معطّر ہو گیا
مدرسے سے فیض پہونچا جس قدر	اہلِ ہند اس سے نہیں ہیں بے خبر
بلکہ اس کی ہی بدولت اور جا	مدرسوں کی پڑ گئی اکثر بِنا
وجہ سے اس مدرسہ کے دور دور	آفتابِ دین کا پہونچا ہے نور
بہرِ تعلیم ایک مکانِ پُر فضا	فضل سے مولا کے ایسا بن گیا
دیکھنے سے جس کے ہو دل کو سرور	اُس نمونہ کا نہ نکلے دور دور
چار جانب ہیں مکاناتِ رفیع	دلکش و بارونق و خوب و وسیع
بیچ میں ہے ایک پاکیزہ چمن	بہجت افزا و سرورِ رُوح و تن

دارالعلوم دیوبند کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

درس گاہوں کو جو جا کر دیکھئے	جی نہ چاہے واں سے اُٹھنے کے لئے
جب مدرس بیٹھ کر کے اپنی جا	درس دیتے ہیں علومِ دین کا

سنکے تفسیر اور حدیثوں کے سبق — آنے لگتی ہے نظر اک شانِ حق
لذتوں سے اس قدر جاتا ہے بھر — قلب میں رہتی نہیں فکرِ دگر
اس مزے کو جانتا ہے میرا جی — ہے طبیعت میں مرے ابتک وہی
طبع کو یاد آتے ہیں وہ ہی مزے — تلملاتی ہے اُنھیں کے واسطے
ان مزوں کا ذکر جو اب آگیا — زخم پر گویا نمک چھڑکا گیا
طالبانِ دیں کا ہے ایسا ہجوم — ہر مکان میں رہتے ہیں اہلِ علوم
شہر میں ایسی نہیں ہے کوئی جا — جس جگہ اُن کا نہو بستر جما
اُنکے رہنے سے ہے برکت کا ظہور — بن گیا ہے ہر مکان دارالسرور
ہیں تہ دل سے سب اہلِ دیوبند — مستعد خدمت کو مثلِ دردمند
رہتے ہیں ان کے لئے سب غمگسار — ان کی حاجت میں شریک کاروبار
اور بھی گو مدرسے اسلام کے — مختلف شہروں میں ہیں قائم ہوئے
ہے مگر جو بات اس میں وہ کہاں — خور کی عالی ہے نہایت مرسے شان
خوبیٔ تعلیم کے شائق ہیں جو — واں سے آتے ہیں یہاں تعلیم کو
مدرسے تھے دیں کے اُن شہروں میں کب — ہوگئے قائم فقط اس کے سبب
وہ ہیں حجرات اور یہ بیتِ عظیم — وہ فروعات اور یہ ہے اصلِ قدیم
نسبت اب اس مدرسے سے انکو کیا — فرق اسمیں اون میں ہے بے انتہا
فرق ہے تقلید اور ایجاد میں — فرق ہے شاگرد اور استاد میں
جو شرف خالق نے دینؔ کو دیئے — وہ فقط اس مدرسے کی وجہ سے
مٹ گئیں سب جہل و بدعت کی رسوم — دیوبند اب ہوگیا دارالعلوم
جمع ہوں کیونکر نہ واں سب خوبیاں — عالمانِ دیں کا مجمع ہے وہاں
کیوں نہ ہو رونق کہ ہے شام و سحر — رونقِ اسلام ہر سو جلوہ گر

سب وہاں رہتے ہیں دنیں راتیں — مسجدوں میں ذکر ہیں طاعات میں

سامنے رہتی ہیں سب کے روز و شب — فقہ تفسیر اور حدیثوں کی کتب

ترمذی کا درس ہوتا ہے کہیں — ہے کوئی مشکوٰۃ سے نعم القریں

اور کوئی شائق جھکائے اپنا فرق — مطلب تفسیرِ قرآں میں ہے غرق

ہو کے محنت سے کوئی مغلوبِ خواب — سو گیا لیکن ہے سینے پر کتاب

ہے کوئی مصروف قرآن و نماز — ذکر میں ہے کوئی با سوز و گداز

اور لگاتا ہے کوئی ہر صبح و شام — ضربِ الا اللہ کی دل پر مدام

اور دوسرے دل سے کوئی متقی — کر رہا ہے حجرے میں ذکرِ خفی

ہے جماعت صالحوں کی جمع واں — ہو سکیں اوصاف کب اُن کے بیاں

وہ ترقی مدرسے کو حق نے دی — جس کا ہمسر ہو نہیں سکتا کوئی

فیضیاب اس سے ہیں اہلِ ہند سب — یہ بھی اک دیُبن پہ ہے انعامِ رب

جانتا تھا کب کوئی دیُبن کا نام — ہو گیا مشہور اب تا روم و شام

ہر طرف سے طالبانِ دینِ حق — پڑھتے ہیں دیُبن میں آکر اب سبق

بے تکلف عیش اور آرام سے — ہوتے ہیں سب مستفیض اسلام سے

ملتی ہے ہر چیز اُن کو بے طلب — پورے ہوتے ہیں حوائج اُنکے سب

معاونین دارالعلوم دیوبند کے فیاضانہ طرزِ عمل کی نسبت لکھتے ہیں:

کی مسلمانوں نے ہمت ہے بہت — دین سے ہے ان کو اُلفت ہی بہت

متقی ہیں جملہ اہلِ دیوبند — کاملا لاسلام اور اقبال مند

علم کی اور عالمانِ دین کی — عظمت ان کی جان و دل میں ہے بسی

دیں انھوں نے ہمتیں اپنی لگا — حامئ ہمت نہ ہو کیوں کر خدا

ہیں مسلمان گرچہ مفلس اور غریب — ہمتیں اُن کو خدا نے دیں عجیب

اُن کو میں اس کے سوا کہتا نہیں | آفریں، صد آفریں، صد آفریں
کیوں نہ ہو یہ ہے اثر اسلام کا | زور ہے ان میں خدا کے نام کا
کر گذرتے ہیں امورات عجیب | ان سے صادر ہوتے ہیں فعلِ غریب
ان کی یہ حقانیت کی ہے دلیل | ہے طرف دار اُن کا خود ربِ جلیل
کہتے ہیں عاجز اگرچہ آپ کو | بادشاہوں سے نہ ہو جو اُن سے ہو
جامع مسجد بھی دی ایسی بنا | جو نہایت ہے وسیع و دلکشا
اور عمارت ایسی عالی شان ہے | جس سے عقلِ منکراں حیران ہے
ہے یہ سب فیضِ محمد مصطفےٰ | ان کی امت کو کیا حق نے عطا
شرق سے تا غرب یہ دینِ نبی | کس طرح پھیلا ہے دیکھو تو سہی
ہے مسلمانوں کو امدادِ خدا | کام لیتا ہے یہ اُن سے کبریا
یہ کرامت ہے اگر سچ پوچھئے | یہ ہدایت ہے اگر سچ پوچھئے
ہے غریبوں کو یہ تائیدِ خدا | مفلسوں سے ورنہ ہو سکتا ہے کیا

حضرت مولانا محمد قاسم قدس سرہٗ

حضرت نانوتوی ؒ کی منقبت ان الفاظ میں کی ہے

پہلے حضرت مولوی صاحب جو تھے | فیض سب کو اُن سے کیا کیا کچھ ہوئے
کر گئے وہ اس جہاں سے انتقال | زندہ ہے آفاق میں اُن کا کمال
میں کروں تعریف ان کی جس قدر | مرتبہ ہے اُن کا اس سے فوق تر
سبع میں کیا خوب ہے ان کی نشست | بر لبِ کوثر محمد قاسم است
مدرسے پر اک توجہ خاص تھی | علم پھیلے تھا یہ منشائے دلی
بس ہوا جو کچھ کہ چاہا تھا وہی | ہر آرزو پوری خدا نے اُن کی کی

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

کی نسبت لکھا ہے:۔

سرپرست اس مدرسے کے اے فروغ — وہ ہیں جنکو دینِ حق میں ہے فروغ
مفتیِ برحق ، محدث مستند — عارف و مقبول درگاہِ صمد
بہرِ اصلاح و برائے انتظام — مدرسے میں آتے رہتے ہیں مدام
مدرسے کے جس قدر ہیں کاروبار — رائے پران کے ہے کل دار و مدار
دین میں رکھتے ہیں ایسا مرتبہ — ہے میسّر اُن کو وصلِ مصطفےٰ
آج وہ مسند نشینِ ملکِ دیں — ہم صفت اپنا کوئی رکھتے نہیں
عالم و فاضل فقیہہ بے بدل — صوفی یکتا محدث باعمل
طالبِ علم احادیثِ رسول — آپ سے کرتے ہیں یہ دولت حصول
وعظ گر سنیئے کسی دن آپ کا — جان و دل کو اس میں آتا ہے مزا
روح ہو جاتی ہے سُنکر بے قرار — دل تڑپنے لگتا ہے سیماب دار
وعظ جس نے سن لیا اک مرتبا — مدتوں دل میں رہا اس کا مزا
کرتے ہیں دائم علاج جسم و روح — ظاہر و باطن کی کھوتے ہیں قبوح

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ

مولانا فروغ نے اپنے مرشد حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کی منقبت بڑی تفصیل سے بیان کی ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

اُن میں ہیں وہ مولوی بے نظیر — پیرِ برحق ، مرشدِ روشن ضمیر
مولوی یعقوب فخرِ اولیا — عارفِ حق جانشینِ مصطفےٰ
رونقِ دیں چشمۂ دین و عمل — بے نظیر و بے عدیل و بے بدل
متقی و صاحبِ قلبِ سلیم — کانِ حلم و معدنِ خُلقِ عظیم

شیخ عالم مقتداؤ پیشوا | روز و شب مصروف طاعاتِ خدا
نام جب لیتے ہیں وہ اللہ کا | دل کو آتا ہے عجیب اس میں مزا
پڑھتا ہے جو آپ کے پیچھے نماز | دل ہے اس کا با خشوع و با نیاز
ایسے بتلاتے ہیں اورادِ خفی | جن سے ہو دم میں صفائی قلب کی
ہے طریقہ ان کا ارشادِ ہدیٰ | داخلِ عادات ہے یادِ خدا
قلب اُن کا ہے پُراز انوارِ غیب | منکشف سینے میں ہیں اسرارِ غیب
اتباعِ سُنت و اعمال و علم | اتقاؤ طاعت و اخلاق و حلم
وہ جو فرماتے ہیں ختم المرسلین | ہیں وہ مثلِ انبیائے سابقین
آپ ہیں دین کو وجہ افتخار | مدرسہ کو باعثِ عزو وقار
آپ ہی ہیں افتخارِ مدرسہ | آپ ہی پر ہے مدارِ مدرسہ
جملہ اہلِ شہر و اہلِ مدرسہ | آپ کا کرتے ہیں دل سے اقتدا

حاجی سیّد محمد عابدؒ

حاجی سید محمد عابدؒ، دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مہتمم تھے بڑے متقی، پرہیزگار اور صاحبِ اثر بزرگ تھے، دارالعلوم کے لئے عوامی چندے کی فراہمی کے طریقے کے آپ ہی موجد تھے ؎

اور حضرت معدنِ لطف و کرم | متقی و حاجیٔ بیت الحرم
ہے محمد اور عابد جن کا نام | حق نے اُن پر کی ہر اک خوبی تمام
کی انھوں نے ہے ریاضت اس قدر | جس سے عاجز رہتے ہیں اکثر بشر
اس قدر طاعات حق لائے بجا | نفس اُن کا حکم میں اُن کے ہوا
ہیں بہت پاکیزہ خصلت نیک خُو | رات دن رہتے ہیں محوِ ذکر ہُو
یادِ حق میں قلب ان کا گرو | مہتمم ہیں جامع مسجد کے وہ
مدرسے میں دل سے وہ عالی مقام | رہتے ہیں دائم شریکِ انتظام

اُن کی برکت ہے یہ مسجد مدرسہ ۔ ہے ترقی روز افزوں پر سدا
ہمتِ باطن کا ہے ان کے اثر ۔ جس سے دین میں ہوئی یہ کرّوفر
اجر اُن کو اُن کی نیت کا ملے ۔ حق انھیں اس کی جزائے خیر دے
یہ ترقی دین کی اُن سے ہوئی ۔ ایسی ہمت کر سکے گا کیا کوئی

مولوی رفیع الدینؒ

دار العلوم کے دوسرے مہتمم تھے ، حضرت شاہ عبد الغنی مجددیؒ سے مجازِ بیعت تھے ، دار العلوم نے ان کے زمانۂ اہتمام میں بڑی ترقی کی ہے

مہتمم بھی اس کے ہیں خوش انتظام ۔ مولوی صاحب رفیع الدین نام
صاحبِ عقل و تدابیرِ متین ۔ خیر خواہِ دینِ ختم المرسلین
فرضِ منصب کو ادا کرتے ہیں وہ ۔ سعی اُن کی حشر میں مشکور ہو

مولانا سیّد احمد دہلوی

دار العلوم دیو بند کے اوّلیں اساتذہ میں تھے ریاضی میں انھیں یدِ طولیٰ حاصل تھا ۔

فاضل و علامہ اُستادِ ذکی ۔ مولوی سیّد احمد دہلوی
حفظ ہے گویا کہ ان کو ہر کتاب ۔ ہیں وہ ہر اک علم و فن میں لاجواب
خُلق کیا اللہ نے اُن کو دیا ۔ حِلم کیا کچھ اُن کو فرمایا عطا
پارسا و تابعِ شرعِ نبی ۔ صاحبِ اسلام کامل متقی
اس قدر ہے انکے دل میں عاجزی ۔ گاہ مسجد میں امامت تک نہ کی
اور سب کے پیچھے ازراہِ نیاز ۔ پڑھتے ہیں وہ صاحبِ باطن نماز

مثنوی فروغ دار العلوم دیو بند کی ایک قیمتی اور نایاب دستاویز ہے اس کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اس گراں قدر اور تاریخی و ادبی سرمائے کی حفاظت کی جائے !

ضمیمہ اوّل

گوشوارہ آمد وصرف وتعداد کتب

از ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء لغایۃ ۱۳۹۶ھ / ۱۹۷۶ء

اعداد وشمار کسی حقیقت کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہیں، آیئے ہم بھی اعداد وشمار پر ایک نظر ڈال لیں

نمبر شمار	سن ہجری	سن عیسوی	آمد	صرف	صرفہ تعمیرات	تعداد کتب	کیفیت
۱	۱۲۸۳ھ	۱۸۶۶ء	۶۴۹ - ۴ - ۰	۳۹۳ - ۱۲ - ۳	۰	۰	۱۲۹۳ھ تک
۲	۱۲۸۴ھ	۱۸۶۷ء	۱۲۷۵ - ۱ - ۹	۸۰۹ - ۱۵ - ۳	۰	۰	دارالعلوم دیوبند کی
۳	۱۲۸۵ھ	۱۸۶۸ء	۱۴۱۱ - ۱۴ - ۹	۱۳۴۳ - ۳ - ۳	۰	۰	کوئی عمارت تعمیر
۴	۱۲۸۶ھ	۱۸۶۹ء	۱۷۸۰ - ۶ - ۶	۱۵۶۴ - ۴ - ۹	۰	۰	نہیں ہوئی
۵	۱۲۸۷ھ	۱۸۷۰ء	۱۵۵۶ - ۴ - ۹	۱۵۳۲ - ۲ - ۹	۰	۰	
۶	۱۲۸۸ھ	۱۸۷۱ء	۱۰۶۹ - ۱۰ - ۰	۱۵۱۳ - ۶ - ۱۱	۰	۰	

نمبر شمار	سن ہجری	سن عیسوی	آمد	صرف	صرفہ تعمیرات	تعداد کتب	کیفیت
۷	۱۲۸۹ھ	۱۸۷۲ء	۱۸۱۰-۶-۰	۱۶۸۱ ۱۲ ۱۰	۰	۰	
۸	۱۲۹۰ھ	۱۸۷۳ء	۱۷۸۰-۱۳-۶	۱۶۰۶ ۱۲ ۰	۰	۰	
۹	۱۲۹۱ھ	۱۸۷۴ء	۲۴۲۶-۰-۰	۲۰۴۸ ۵ ۰		۰	
۱۰	۱۲۹۲ھ	۱۸۷۵ء	۲۲۰۰-۹-۹	۲۰۵۴ ۱۱ ۰	{	۰	
۱۱	۱۲۹۳ھ	۱۸۷۶ء	۱۸۱۱-۹-۱۰	۲۱۶۷ ۱۲ ۵		۰	
۱۲	۱۲۹۴ھ	۱۸۷۷ء	۱۷۳۹-۸-۹	۲۰۳۰ ۹ ۱۰	۱۳۹۹۱-۲-۹	۰	
۱۳	۱۲۹۵ھ	۱۸۷۸ء	۳۰۹۷-۵-۰	۲۱۶۷ ۱۴ ۳		۰	
۱۴	۱۲۹۶ھ	۱۸۷۸ء	۲۰۰۳-۶-۹	۲۷۰۴ ۵ ۳	}	۰	
۱۵	۱۲۹۷ھ	۱۸۷۹ء	۲۲۵۶-۰-۹	۲۴۲۵ ۲ ۶	۲۲۹۵-۱۱-۷	۰	
۱۶	۱۲۹۸ھ	۱۸۸۰ء	۲۸۴۵-۱۴-۳	۲۵۸۰ ۱۰ ۰	۱۳۷۶-۷-۱۱	۰	
۱۷	۱۲۹۹ھ	۱۸۸۱ء	۳۰۷۶-۱۴-۶	۲۸۶۷ ۱۰ ۳	۲۹۳۰-۰-۶	۲۵۶۶	
۱۸	۱۳۰۰ھ	۱۸۸۲ء	۶۲۷۷-۱۰-۴	۵۷۹۳ ۱۱ ۱	۱۹۴۸-۱-۳	۲۸۴۲	
۱۹	۱۳۰۱ھ	۱۸۸۳ء	۶۰۳۱-۱۳-۰	۷۰۳۵ ۱۵ ۹	۲۴۵۸-۴-۹	۳۱۵۱	

نمبرشمار	سن ہجری	سن عیسوی	آمد	صرف	صرف تعمیرات	تعداد کتب	کیفیت
۲۰	۱۳۰۲ھ	۱۸۸۴ء	۴۴۳۱۴ - ۱۰ - ۰	۴۶۶۳۴ - ۱۲ - ۳	۷۶۷ - ۷ - ۳	۳۳۵۳	
۲۱	۱۳۰۳ھ	۱۸۸۵ء	۶۷۶۱ - ۱۱ - ۶	۶۴۷۰ - ۱۳ - ۵	۱۳۱۲ - ۱۰ - ۹	۳۷۳۶	
۲۲	۱۳۰۴ھ	۱۸۸۶ء	۶۵۰۴ - ۲ - ۱۰	۶۰۴۶ - ۵ - ۴	۱۲۵۳ - ۱۰ - ۷	۳۷۸۸	
۲۳	۱۳۰۵ھ	۱۸۸۷ء	۷۱۷۱ - ۸ - ۰	۷۴۵۱ - ۱۵ - ۲	۲۱۵۰ - ۶ - ۸	۳۹۷۳	
۲۴	۱۳۰۶ھ	۱۸۸۸ء	۷۹۷۴ - ۲ - ۹	۶۵۵۸ - ۹ - ۱۰	۱۴۶۶ - ۱۱ - ۶	۴۱۲۴	
۲۵	۱۳۰۷ھ	۱۸۸۹ء	۵۹۵۹ - ۳ - ۶	۵۸۵۹ - ۷ - ۶	۱۰۵۵ - ۳ - ۱۱	۴۲۶۹	
۲۶	۱۳۰۸ھ	۱۸۹۰ء	۵۴۹۷ - ۱۱ - ۹	۵۶۵۷ - ۴ - ۴	۱۱۴ - ۱ - ۹	۴۵۸۸	
۲۷	۱۳۰۹ھ	۱۸۹۱ء	۶۱۸۰ - ۳ - ۳	۷۷۸۸ - ۱۰ - ۹	۱۰۲۷ - ۱۵ - ۶	۴۷۱۸	
۲۸	۱۳۱۰ھ	۱۸۹۲ء	۶۶۰۸ - ۷ - ۶	۶۶۵۲ - ۶ - ۳	۱۰۲۶ ۱۵ ۳	۴۷۶۷	
۲۹	۱۳۱۱ھ	۱۸۹۳ء	۷۵۳۱ - ۷ - ۱۱	۷۴۷۲ - ۲ - ۸	۱۸۱ ۶ ۰	۵۰۳۰	
۳۰	۱۳۱۲ھ	۱۸۹۴ء	۵۵۱۱ - ۹ - ۰	۷۹۶۷ - ۱۱ - ۳	۲۱ ۰ ۶	۵۱۱۸	
۳۱	۱۳۱۳ھ	۱۸۹۵ء	۶۰۷۷ - ۳ - ۲	۵۲۵۲ - ۱۴ - ۶	۲۸ ۵ ۳	۵۲۳۸	
۳۲	۱۳۱۴ھ	۱۸۹۶ء	۶۳۰۶ - ۹ - ۳	۵۹۶۲ - ۱ - ۶	۱۵۱ ۲ ۹	۵۳۲۱	

نمبر شمار	سن ہجری	سن عیسوی	آمد			صرف			صرفہ تعمیرات			تعداد کتب	کیفیت
۳۳	۱۳۱۵ھ	۱۸۹۷	۳	۴	۱۰۴۸۷	۶	۹	۸۱۹۲	۰	۱۰	۱۸۶۱	۵۸۷۲	
۳۴	۱۳۱۶ھ	۱۸۹۸	۰	۱۳	۱۰۹۶۴	۳	۶	۱۰۳۱۳	۰	۱۵	۳۹۸۷	۶۰۱۵	
۳۵	۱۳۱۷ھ	۱۸۹۹	۹	۷	۹۴۶۶	۰	۸	۱۱۶۷۶	۳	۳	۱۴۰۴	۶۳۰۱	
۳۶	۱۳۱۸ھ	۱۹۰۰	۹	۵	۵۳۷۲	۳	۸	۹۳۱۵	۰	۲	۱۳۰۴	۶۷۷۸	
۳۷	۱۳۱۹ھ	۱۹۰۱	۸	۰	۹۱۶۶	۲	۸	۷۴۶۰	۰	۰	۱۰۴۰	۷۱۵۳	
۳۸	۱۳۲۰ھ	۱۹۰۲	۳	۱۰	۸۱۱۵	۶	۶	۶۸۷۵	۳	۰	۶۱۶	۷۳۷۹	
۳۹	۱۳۲۱ھ	۱۹۰۳	۳	۷	۷۰۱۹	۰	۱۲	۷۸۶۲	۳	۱۴	۱۳	۷۹۹۹	
۴۰	۱۳۲۲ھ	۱۹۰۴	۹	۱۰	۹۵۵۹	۶	۲	۸۵۱۳	۶	۱۵	۱۷۶	۸۱۵۷	
۴۱	۱۳۲۳ھ	۱۹۰۵	۸	۲	۹۱۱۷	۱۱	۰	۱۰۹۱۴	۶	۲	۳۳۹	۸۳۴۰	
۴۲	۱۳۲۴ھ	۱۹۰۶	۱۰	۷	۱۴۱۸۱	۸	۱۱	۱۳۲۵۹	۰	۷	۲۷۴۸	۸۶۶۳	
۴۳	۱۳۲۵ھ	۱۹۰۷	۳	۶	۱۳۱۳۴	۰	۱۱	۱۹۷۰۶	۶	۱۴	۶۸۹۹	۹۰۶۰	
۴۴	۱۳۲۶ھ	۱۹۰۸	۰	۰	۱۵۹۹۰	۶	۸	۱۴۲۴۲	۳	۷	۳۴۴۷	۹۴۱۰	
۴۵	۱۳۲۷ھ	۱۹۰۹	۳	۵	۳۲۰۵۵	۳	۱۲	۲۸۳۲۶	۶	۱۵	۱۴۳۲۴	۹۶۷۴	

نمبر شمار	سن ہجری	سن عیسوی	آمد	صرف	صرفہ تعمیرات	تعداد کتب	کیفیت
۴۶	۱۳۲۸ھ	۱۹۱۰ء	۵۵۸۱۱-۲-۰	۵۵۲۲۱-۹-۴	۹۸۷۵-۳-۹	۱۰۳۱۲	
۴۷	۱۳۲۹ھ	۱۹۱۱ء	۳۵۳۴۴-۱-۸	۲۱۷۱۱-۱۰-۷	۱۰۰۷۲-۲-۶	۱۱۲۵۱	
۴۸	۱۳۳۰ھ	۱۹۱۱ء	۳۸۶۷۹-۲-۹	۳۵۸۸۹-۷-۶	۱۲۲۲۲-۶-۹	۱۳۹۳۸	
۴۹	۱۳۳۱ھ	۱۹۱۲ء	۴۰۱۳۱-۷-۴	۴۶۸۷۵-۱۳-۷	۲۲۶۵۲-۱-۲	۱۴۹۲۴	
۵۰	۱۳۳۲ھ	۱۹۱۳ء	۵۳۲۰۶-۱۵-۶	۴۸۸۹۵-۱-۴	۱۹۸۹۲-۲-۶	۱۵۷۰۸	
۵۱	۱۳۳۳ھ	۱۹۱۴ء	۴۵۳۷۸-۴-۵	۴۱۹۳۹-۵-۹	۱۱۵۳۷-۲-۰	۱۷۶۸۶	
۵۲	۱۳۳۴ھ	۱۹۱۵ء	۴۸۱۲۳-۴-۶	۵۵۷۴۲-۵-۰	۱۳۶۷۵-۴-۰	۱۸۲۸۶	
۵۳	۱۳۳۵ھ	۱۹۱۶ء	۸۹۹۱۷-۱۲-۶	۶۱۶۶۲-۰-۳	۱۴۶۳۳-۴-۳	۲۱۱۵۵	
۵۴	۱۳۳۶ھ	۱۹۱۷ء	۶۳۰۲۱-۱-۷	۶۴۶۲۷-۴-۷	۱۸۹۲۰-۴-۶	۲۲۰۵۵	
۵۵	۱۳۳۷ھ	۱۹۱۸ء	۶۳۸۱۸-۴-۱۱	۵۷۵۸۴-۱۵-۱۱	۱۱۲۳۶-۳-۳	۲۴۶۵۳	
۵۶	۱۳۳۸ھ	۱۹۱۹ء	۵۴۵۳۲-۶-۳	۶۹۶۵۸-۷-۹	۱۴۵۱۰-۶-۳	۲۵۳۶۹	
۵۷	۱۳۳۹ھ	۱۹۲۰ء	۶۲۰۸۵-۶-۵	۶۲۰۱۱-۱۳-۴	۱۱۱۰۴-۱۲-۰	۲۵۶۰۹	
۵۸	۱۳۴۰ھ	۱۹۲۱ء	۸۲۶۲۱-۱۳-۷	۶۸۳۲۳-۱-۱۰	۶۴۷۷-۵-۹	۲۶۲۳۲	

نمبر شمار	سن ہجری	سن عیسوی	آمد	صرف	صرفہ تعمیرات	تعداد کتب	کیفیت
۵۹	۱۳۴۱ھ	۱۹۲۲ء	۵۹۱۳۳ ۱۲ ۷	۶۲۳۹۹ ۱۳ ۶	۹۰۳۰ ۷ ۹	۲۸۸۵۶	
۶۰	۱۳۴۲ھ	۱۹۲۳ء	۹۴۴۵۹ ۱۱ ۲	۷۹۱۲۱ ۵ ۴	۱۴۸۵۱ ۱۵ ۳	۲۹۹۸۱	
۶۱	۱۳۴۳ھ	۱۹۲۴ء	۷۳۱۷۷ ۴ ۰	۹۹۱۷۷ ۹ ۹	۲۵۹۱۸ ۱۵ ۳	۳۱۱۸۶	
۶۲	۱۳۴۴ھ	۱۹۲۵ء	۸۲۸۸۹ ۱۳ ۱۱	۷۸۷۷۱ ۳ ۲	۱۶۴۱۲ ۱۲ ۶	۳۳۹۱۴	
۶۳	۱۳۴۵ھ	۱۹۲۶ء	۵۲۲۱۶ ۱۴ ۱۱	۷۹۳۶۷ ۸ ۵	۱۲۵۶۶ ۰ ۹	۳۴۷۶۰	
۶۴	۱۳۴۶ھ	۱۹۲۷ء	۵۷۳۶۵ ۸ ۱۰	۵۳۹۶۴ ۱۳ ۱۰	۴۸۰۵ ۰ ۰	۳۵۵۳۸	
۶۵	۱۳۴۷ھ	۱۹۲۸ء	۵۸۱۸۱ ۹ ۹	۶۳۱۷۷ ۴ ۹	۴۳۸۱ ۹ ۳	۳۵۷۲۲	
۶۶	۱۳۴۸ھ	۱۹۲۹ء	۵۰۲۶۲ ۶ ۶	۴۷۸۸۴ ۸ ۶	۴۱۲۵ ۱۴ ۳	۳۶۳۳۶	
۶۷	۱۳۴۹ھ	۱۹۳۰ء	۵۴۱۳۷ ۰ ۰	۵۳۴۳۰ ۰ ۰	۳۸۵۸ ۹ ۹	۳۸۰۶۵	
۶۸	۱۳۵۰ھ	۱۹۳۱ء	۴۴۷۰۵ ۰ ۰	۴۶۲۹۶ ۰ ۰	۴۳۷۴ ۳ ۶	۳۸۷۲۳	
۶۹	۱۳۵۱ھ	۱۹۳۲ء	۴۴۷۰۷ ۰ ۰	۴۹۳۷۷ ۰ ۰	۴۲۹۸ ۳ ۳	۴۰۰۷۶	
۷۰	۱۳۵۲ھ	۱۹۳۳ء	۵۴۲۳۴ ۰ ۰	۵۴۰۱۶ ۰ ۰	۴۷۶۴ ۵ ۹	۴۱۲۹۴	
۷۱	۱۳۵۳ھ	۱۹۳۴ء	۵۱۱۳۶ ۰ ۰	۵۱۷۰۳ ۰ ۰	۳۶۳۳ ۶ ۹	۴۲۶۹۹	

نمبر شمار	سن ہجری	سن عیسوی	آمد	صرف	صرفہ تعمیرات	تعداد کتب	کیفیت
۷۲	۱۳۵۴ھ	۱۹۳۵ء	۶۴۷۳۲ — ۰ — ۰ — ۰	۵۰۹۰۱ — ۰ — ۰ — ۰	۳۶۶۱ — ۱۰ — ۰	۴۳۴۰۲	
۷۳	۱۳۵۵ھ	۱۹۳۶ء	۵۸۶۴۳ — ۰ — ۰ — ۰	۶۳۴۲۷ — ۰ — ۰	۷۵۴۵ — ۴ — ۹	۴۴۵۲۸	
۷۴	۱۳۵۶ھ	۱۹۳۷ء	۷۶۲۱۳ — ۰ — ۰ — ۰	۷۶۴۴۸ — ۰ — ۰	۱۴۲۶۰ — ۱۵ — ۹	۴۵۳۸۱	
۷۵	۱۳۵۷ھ	۱۹۳۸ء	۷۷۴۴۷ — ۰ — ۰ — ۰	۸۰۶۷۹ — ۰ — ۰	۱۷۷۸۷ — ۹ — ۶	۴۶۷۴۰	
۷۶	۱۳۵۸ھ	۱۹۳۹ء	۸۲۰۲۲ — ۵ — ۱	۶۷۰۳۵ — ۱ — ۱۰	۵۲۳۱ — ۸ — ۳	۴۹۰۸۰	
۷۷	۱۳۵۹ھ	۱۹۴۰ء	۸۶۱۸۵ — ۲ — ۸	۷۹۸۹۹ — ۰ — ۵	۸۸۱۸ — ۸ — ۶	۵۰۷۴۵	
۷۸	۱۳۶۰ھ	۱۹۴۱ء	۱۲۰۱۹۵ — ۱۱ — ۴	۱۰۳۵۴۵ — ۲ — ۳	۲۳۴۱۴ — ۱۲ — ۰	۵۲۵۹۷	
۷۹	۱۳۶۱ھ	۱۹۴۲ء	۱۲۰۴۶۵ — ۲ — ۷	۱۲۵۲۲۱ — ۱۵ — ۹	۳۳۴۴۳ — ۱ — ۳	۵۴۲۰۰	
۸۰	۱۳۶۲ھ	۱۹۴۳ء	۱۶۵۳۹۸ — ۴ — ۷	۱۳۵۷۰۳ — ۶ — ۸	۱۳۱۹۱ — ۷ — ۳	۵۵۲۷۰	
۸۱	۱۳۶۳ھ	۱۹۴۳ء	۲۷۶۳۳۸ — ۰ — ۷	۲۸۹۰۷۵ — ۱۵ — ۱۰	۱۵۳۴۱ — ۱ — ۳	۵۶۸۴۰	
۸۲	۱۳۶۴ھ	۱۹۴۴ء	۳۰۲۷۲۰ — ۷ — ۳	۲۰۵۵۷۳ — ۱۴ — ۱۰	۲۱۲۴۷ — ۳ — ۱۰	۵۷۶۴۷	
۸۳	۱۳۶۵ھ	۱۹۴۵ء	۲۶۹۷۴۳ — ۱ — ۵	۲۷۴۳۲۲ — ۶ — ۱	۲۰۷۶۰ — ۱۴ — ۰	۵۸۴۴۶	
۸۴	۱۳۶۶ھ	۱۹۴۶ء	۲۶۲۵۸۳ — ۱۰ — ۴	۳۰۱۷۱۲ — ۱ — ۷	۱۹۱۳۴ — ۹ — ۰	۵۸۷۹۰	

نمبر شمار	سن ہجری	سن عیسوی	آمد	صرف	صرفہ تعمیرات	تعداد کتب	کیفیت
۸۵	۱۳۶۷ھ	۱۹۴۷ء	۲۷۱۸۱۲ ۹ ۶	۳۱۱۸۷۴ ۱۱ ۹	۲۸۶۷۷ ۱ ۳	۶۲۲۸۰	
۸۶	۱۳۶۸ھ	۱۹۴۸ء	۲۴۴۷۶۰ ۱۱ ۵	۳۱۱۰۵۴ ۱ ۶	۲۹۴۳۴ ۰ ۶	۶۴۳۰۹	
۸۷	۱۳۶۹ھ	۱۹۴۹ء	۲۶۲۸۶۵ ۰ ۸	۲۶۲۳۳۳ ۱ ۶	۱۱۱۴۵ ۴ ۰	۶۵۸۱۰	
۸۸	۱۳۷۰ھ	۱۹۵۰ء	۳۰۷۳۰۲ ۱۵ ۰	۲۷۰۶۴۵ ۵ ۹	۱۴۱۵۹ ۱۱ ۳	۶۶۸۱۰	
۸۹	۱۳۷۱ھ	۱۹۵۱ء	۲۸۱۵۹۹ ۷ ۱	۳۱۶۶۹۶ ۱۲ ۰	۳۱۸۸۰ ۹ ۰		
۹۰	۱۳۷۲ھ	۱۹۵۲ء	۳۷۰۵۳۵ ۱۵ ۳	۴۱۵۹۰۲ ۰ ۰	۱۵۰۱۴ ۹ ۳	۶۸۷۴۰	
۹۱	۱۳۷۳ھ	۱۹۵۳ء	۴۱۱۳۷۹ ۵ ۴	۴۲۴۷۱۲ ۱۵ ۳	۱۸۰۶۷ ۱۴ ۹	۶۹۵۵۰	
۹۲	۱۳۷۴ھ	۱۹۵۴ء	۴۱۷۱۱۷ ۸ ۵	۴۳۵۷۲۸ ۱۳ ۶	۱۹۹۰۶ ۱۱ ۳	۷۱۲۳۰	
۹۳	۱۳۷۵ھ	۱۹۵۵ء	۴۲۲۲۴۴ ۹ ۱۱	۴۹۲۴۱۷ ۱۵ ۹	۲۹۱۹۴ ۳ ۳	۷۱۶۱۰	
۹۴	۱۳۷۶ھ	۱۹۵۶ء	۴۲۵۳۱۲ ۱۱ ۱	۴۶۱۳۶۴ ۳ ۶	۲۹۴۳۸ ۸ ۶	۷۲۴۲۳	
۹۵	۱۳۷۷ھ	۱۹۵۷ء	۴۷۸۶۶۹ ۴ ۶	۵۹۶۸۱۸ ۱ ۲	۷۲۶۹۴ ۱۵ ۹	۷۳۰۳۰	
۹۶	۱۳۷۸ھ	۱۹۵۸ء	۵۰۳۸۷۶ ۸ ۹	۵۸۳۰۹۱ ۸ ۲	۶۸۵۴۱ ۰ ۹	۷۶۰۰۰	
۹۷	۱۳۷۹ھ	۱۹۵۹ء	۵۲۲۳۳۵ ۵ ۱۱	۵۲۳۹۱۱ ۱۰ ۹	۹۸۹۴ ۰ ۰	۷۹۲۷۰	

نمبر شمار	سن ہجری	سن عیسوی	آمد	صرف	صرف تعمیرات	تعداد کتب	کیفیت
۹۸	۱۳۸۰ھ	۱۹۶۰ء	۵۹۷۱۲۵ — ۱۵ پیسے	۵۵۸۸۷۱ ۶۰ پیسے	۲۸۴۱۸ ۱۵-۳	۸۰۳۹۰	
۹۹	۱۳۸۱ھ	۱۹۶۱ء	۶۲۴۴۷۰ ″ ۲۲	۵۹۰۸۸۱ ۹۴	۴۳۹۸۱	۸۱۶۶۴	
۱۰۰	۱۳۸۲ھ	۱۹۶۲ء	۶۸۷۲۲۶ ۱۹	۶۴۵۰۴۶ ۳۱	۵۰۷۴۲ ۸۳	۸۲۳۵۰	
۱۰۱	۱۳۸۳ھ	۱۹۶۳ء	۷۰۳۶۹۵ ۹۴	۷۲۲۲۱۱ ″ ۹۶	۸۲۳۹۰ ۱۹	۸۴۴۵۲	
۱۰۲	۱۳۸۴ھ	۱۹۶۴ء	۸۰۸۶۸۰ ″ ۶۵	۷۸۰۵۹۵ ″ ۱۱	۳۲۱۱۲ ۳۹	۸۵۲۲۰	
۱۰۳	۱۳۸۵ھ	۱۹۶۵ء	۹۴۳۳۶۴ ″ ۵۴	۸۶۹۷۸۲ ″ ۴	۵۷۸۰۲ ۲۳	۸۶۳۴۰	
۱۰۴	۱۳۸۶ھ	۱۹۶۶ء	۹۰۷۰۲۱ ۳۳	۹۱۵۵۳۵ ″ ۸۳	۴۶۰۴۱ ۳۶	۸۸۵۹۰	
۱۰۵	۱۳۸۷ھ	۱۹۶۷ء	۱۰۲۷۵۱۱ ″ ۴۲	۱۰۳۳۰۰۸ ″ ۷۱	۲۴۶۸۳	۸۹۷۸۰	
۱۰۶	۱۳۸۸ھ	۱۹۶۸ء	۱۰۲۰۹۱۴ ″ ۴۸	۹۱۳۵۹۰ ″ ۱۳	۴۵۴۸۵ ۶۵	۹۱۱۰۰	
۱۰۷	۱۳۸۹ھ	۱۹۶۹ء	۱۲۷۵۷۷۳ ″ ۳۰	۱۰۹۱۵۲۵ ″ ۶۸	۵۷۷۸۴ ۳۴	۹۱۷۸۳	
۱۰۸	۱۳۹۰ھ	۱۹۷۰ء	۱۱۲۶۴۷۶ ″ ۸۸	۱۱۴۹۲۸۷ ″ ۳۹	۷۳۱۶۲ ۹۷	۹۳۸۴۰	
۱۰۹	۱۳۹۱ھ	۱۹۷۱ء	۱۱۳۰۵۸۶ ″ ۸۸	۱۲۵۸۳۳۶ ″ ۲۴	۱۶۱۷۸۶ ۵۶	۹۵۸۹۰	
۱۱۰	۱۳۹۲ھ	۱۹۷۲ء	۱۲۷۶۸۹۶ ″ ۷۹	۱۲۰۲۲۲۴ ″ ۷۹	۱۱۷۳۷ ۱۲	۹۷۷۱۰	
۱۱۱	۱۳۹۳ھ	۱۹۷۳ء	۱۴۵۹۱۸۸ ″ ۷۷	۱۳۲۴۲۷۸ ″ ۶۶	۴۸۸۲۵ ۴۳	۹۹۸۱۰	
۱۱۲	۱۳۹۴ھ	۱۹۷۴ء	۱۸۶۳۷۲۷ ″ ۲۲	۱۶۶۳۵۲۱ ″ ۵	۵۵۰۵۲ ۰۵	۱۰۱۲۷۰	
۱۱۳	۱۳۹۵ھ	۱۹۷۵ء	۲۰۱۰۴۳۷ ″ ۵۵	۲۱۹۹۴۲۲ ″ ۱۵	۱۱۳۲۵۲ ۰۰	۱۰۲۵۹۰	
۱۱۴	۱۳۹۶ھ	۱۹۷۶ء	۱۹۰۰۳۵۱ ″ ۱۳	۲۳۳۹۰۱۳ ″ ۲۳	۳۲۶۵۱۴ ۸۸	۱۰۴۳۷۰	

ضمیمہ دوم

گوشوارہ تعلیمی و انتظامی

از ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۶ء لغایۃ ۱۳۹۶ھ ۱۹۷۶ء

نمبر شمار	سن ہجری	سن عیسوی	تعداد مدرسین	تعداد ملازمین	تعداد طلباء	تعداد فضلاء	سرپرست	اہتمام	صدارت تدریس	کیفیت
۱	۱۲۸۳ھ	۱۸۶۶ء	۶	۱	۷۸	۰	حضرت مولانا محمد قاسمؒ	حضرت حاجی سید محمد عابدؒ	حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ	
۲	۱۲۸۴ھ	۱۸۶۷ء	۶	۱	۱۰۰	۳	〃	حضرت مولانا محمد رفیع الدینؒ	〃	
۳	۱۲۸۵ھ	۱۸۶۸ء	۶	۱	۱۱۴	۳	〃	〃	〃	
۴	۱۲۸۶ھ	۱۸۶۹ء	۹	۱	۹۲	۰	〃	حضرت حاجی سید محمد عابدؒ	〃	
۵	۱۲۸۷ھ	۱۸۷۰ء	۹	۱	۸۷	۶	〃	〃	〃	
۶	۱۲۸۸ھ	۱۸۷۱ء	۹	۲	۱۰۶	۰	〃	حضرت مولانا محمد رفیع الدینؒ	〃	
۷	۱۲۸۹ھ	۱۸۷۲ء	۵	۲	۱۴۵	۱	〃	〃	〃	
۸	۱۲۹۰ھ	۱۸۷۳ء	۶	۲	۸۳	۲	〃	〃	〃	
۹	۱۲۹۱ھ	۱۸۷۴ء	۱۰	۳	۱۸۳	۲	〃	〃	〃	
۱۰	۱۲۹۲ھ	۱۸۷۵ء	۱۰	۳	۱۷۸	۰	〃	〃	〃	

نمبر شمار	سن ہجری	سن عیسوی	تعداد مدرسین	تعداد ملازمین	تعداد طلباء	تعداد فضلاء	سرپرست	اہتمام	صدارت تدریس	کیفیت
۱۱	۱۲۹۳ھ	۱۸۷۶ء	۸	۳	۱۹۸	۷	حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ	״	״	
۱۲	۱۲۹۴ھ	۱۸۷۷ء	۱۴	۴	۲۱۵	۱	״	״	״	
۱۳	۱۲۹۵ھ	۱۸۷۸ء	۱۴	۳	۱۸۸	۵	״	״	״	
۱۴	۱۲۹۶ھ	۱۸۷۸ء	۱۱	۳	۱۶۲	۲	״	״	״	
۱۵	۱۲۹۷ھ	۱۸۷۹ء	۱۱	۳	۱۸۶	۳	״	״	״	
۱۶	۱۲۹۸ھ	۱۸۸۰ء	۱۰	۳	۲۲۲	۲	حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	״	״	
۱۷	۱۲۹۹ھ	۱۸۸۱ء	۱۰	۲	۱۸۷	۱۲	״	״	״	
۱۸	۱۳۰۰ھ	۱۸۸۲ء	۱۰	۴	۱۷۰	۹	״	״	״	
۱۹	۱۳۰۱ھ	۱۸۸۳ء	۱۰	۴	۱۵۲	۱۱	״	״	״	
۲۰	۱۳۰۲ھ	۱۸۸۴ء	۱۱	۷	۱۵۹	۲	״	״	حضرت مولانا سید احمد دہلویؒ	
۲۱	۱۳۰۳ھ	۱۸۸۵ء	۱۲	۷	۱۷۲	۶	״	״	״	
۲۲	۱۳۰۴ھ	۱۸۸۶ء	۱۰	۷	۱۹۵	۵	״	״	״	
۲۳	۱۳۰۵ھ	۱۸۸۷ء	۱۴	۷	۲۱۵	۵	״	״	״	

نمبر شمار	سن ہجری	سن عیسوی	تعداد مدرسین	تعداد ملازمین	تعداد طلباء	تعداد فضلاء	سرپرست	اہتمام	صدارت تدریس	کیفیت
۲۴	۱۳۰۶ھ	۱۸۸۸ء	۱۱	۷	۱۹۰	۶	حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	حضرت حاجی سید محمد عابدؒ	"	
۲۵	۱۳۰۷ھ	۱۸۸۹ء	۱۰	۷	۱۷۸	۴	"	"	"	
۲۶	۱۳۰۸ھ	۱۸۹۰ء	۹	۸	۲۷۲	۲۶	"	"	شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی	
۲۷	۱۳۰۹ھ	۱۸۹۱ء	۱۱	۶	۲۶۴	۳۱	حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	حضرت حاجی سید محمد عابدؒ	"	
۲۸	۱۳۱۰ھ	۱۸۹۲ء	۱۲	۵	۲۸۸	۲۹	"	حاجی فضل حقؒ	"	
۲۹	۱۳۱۱ھ	۱۸۹۳ء	۱۳	۷	۲۹۸	۲۱	"	مولانا محمد منیر نانوتویؒ	"	
۳۰	۱۳۱۲ھ	۱۸۹۴ء	۱۳	۷	۲۹۳	۳۲	"	حضرت مولانا حافظ محمد احمدؒ	"	
۳۱	۱۳۱۳ھ	۱۸۹۵ء	۱۲	۸	۲۲۴	۳۲	"	"	"	
۳۲	۱۳۱۴ھ	۱۸۹۶ء	۱۳	۱۰	۲۴۱	۹	"	"	"	
۳۳	۱۳۱۵ھ	۱۸۹۷ء	۱۱	۷	۲۳۹	۲۰	"	"	"	
۳۴	۱۳۱۶ھ	۱۸۹۸ء	۱۲	۵	۲۹۲	۱۸	"	"	"	
۳۵	۱۳۱۷ھ	۱۸۹۹ء	۱۲	۵	۲۴۴	۱۷	"	"	"	
۳۶	۱۳۱۸ھ	۱۹۰۰ء	۱۱	۷	۲۵۴	۳۰	"	"	"	

نمبر شمار	سن ہجری	سن عیسوی	تعداد مدرسین	تعداد ملازمین	تعداد طلباء	تعداد فضلاء	سرپرست	اہتمام	صدارت تدریس	کیفیت
۳۷	۱۳۱۹ھ	۱۹۰۱ء	۱۲	۷	۱۵۱	۲۶	حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	حضرت مولانا حافظ محمد احمدؒ	〃	
۳۸	۱۳۲۰ھ	۱۹۰۲ء	۱۲	۷	۲۸۲	۲۶	〃	〃	〃	
۳۹	۱۳۲۱ھ	۱۹۰۳ء	۱۳	۷	۳۱۰	۳۶	〃	〃	〃	
۴۰	۱۳۲۲ھ	۱۹۰۴ء	۱۳	۸	۲۸۴	۳۵	〃	〃	〃	
۴۱	۱۳۲۳ھ	۱۹۰۵ء	۱۲	۸	۳۲۵	۳۰	〃	〃	〃	
۴۲	۱۳۲۴ھ	۱۹۰۶ء	۱۳	۷	۲۷۴	۲۴	حضرت گنگوہیؒ کے بعد باضابطہ سرپرست کوئی نہیں ہوا، البتہ حضرت شیخ الہند کو سرپرست سمجھا گیا، حضرت شیخ الہندؒ کے زمانۂ نظر بندی میں حضرت مولانا عبدالرحیم رائے پوری سرپرست منتخب کئے گئے	〃	〃	
۴۳	۱۳۲۵ھ	۱۹۰۷ء	۱۲	۸	۲۹۲	۵۱		〃	〃	
۴۴	۱۳۲۶ھ	۱۹۰۸ء	۱۲	۸	۲۹۴	۳۵		〃	〃	
۴۵	۱۳۲۷ھ	۱۹۰۹ء	۱۷	۸	۳۶۱	۲۸		〃	〃	
۴۶	۱۳۲۸ھ	۱۹۱۰ء	۱۸	۷	۴۲۵	۵۰		〃	〃	
۴۷	۱۳۲۹ھ	۱۹۱۱ء	۱۶	۱۲	۴۶۲	۵۰		〃	〃	
۴۸	۱۳۳۰ھ	۱۹۱۱ء	۱۹	۱۱	۵۶۸	۵۴		〃	〃	
۴۹	۱۳۳۱ھ	۱۹۱۲ء	۲۲	۱۲	۶۳۰	۴۳		〃	〃	

نمبر شمار	سن ہجری	سن عیسوی	تعداد مدرسین	تعداد ملازمین	تعداد طلباء	تعداد فضلاء	سرپرست	اہتمام	صدارت تدریس	کیفیت
۵۰	۱۳۳۲ھ	۱۹۱۳ء	۲۲	۱۷	۵۸۶	۵۵	"	حضرت مولانا محمد احمدؒ	"	
۵۱	۱۳۳۳ھ	۱۹۱۴ء	۱۹	۱۶	۵۶۲	۵۱	"	"	"	
۵۲	۱۳۳۴ھ	۱۹۱۵ء	۲۱	۲۴	۵۹۷	۵۰	"	"	"	
۵۳	۱۳۳۵ھ	۱۹۱۶ء	۲۱	۲۹	۵۹۷	۴۲	"	"	"	
۵۴	۱۳۳۶ھ	۱۹۱۷ء	۲۰	۳۱	۶۰۱	۷۳	"	"	"	
۵۵	۱۳۳۷ھ	۱۹۱۸ء	۲۳	۳۹	۶۲۱	۷۰	"	"	"	
۵۶	۱۳۳۸ھ	۱۹۱۹ء	۲۲	۲۷	۶۰۱	۴۶	حضرت شیخ الہندؒ	حضرت مولانا حافظ محمد احمدؒ	حضرت مولانا سید محمد انور شاہؒ	
۵۷	۱۳۳۹ھ	۱۹۲۰ء	۲۵	۲۵	۵۵۶	۶۴	"	"	"	
۵۸	۱۳۴۰ھ	۱۹۲۱ء	۲۴	۲۵	۵۸۰	۷۰	"	"	"	
۵۹	۱۳۴۱ھ	۱۹۲۲ء	۲۲	۲۷	۷۲۲	۴۴	"	"	"	
۶۰	۱۳۴۲ھ	۱۹۲۳ء	۲۳	۲۹	۷۹۵	۷۲	"	"	"	
۶۱	۱۳۴۳ھ	۱۹۲۴ء	۲۴	۲۹	۸۳۰	۷۸	"	"	"	
۶۲	۱۳۴۴ھ	۱۹۲۵ء	۲۷	۳۳	۵۸۰	۹۶	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علیؒ	"	"	

نمبر شمار	سن ہجری	سن عیسوی	تعداد مدرسین	تعداد ملازمین	تعداد طلبا	تعداد فضلا	سرپرست	اہتمام	صدارت تدریس	کیفیت
۶۳	۱۳۴۵ھ	۱۹۲۶ء	۲۷	۳۱	۵۹۹	۱۰۴	″	حضرت مولانا محمد احمدؒ	حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ	
۶۴	۱۳۴۶ھ	۱۹۲۷ء	۲۹	۴۹	۵۱۴	۳۴	″	″	″	
۶۵	۱۳۴۷ھ	۱۹۲۸ء	۲۲	۴۴	۷۹۰	۵۸	″	″	″	
۶۶	۱۳۴۸ھ	۱۹۲۹ء	۱۸	۳۲	۸۴۰	۶۵	″	حضرت مولانا حبیب الرحمنؒ	″	
۶۷	۱۳۴۹ھ	۱۹۳۰ء	۲۴	۳۲	۹۴۲	۸۹	″	حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ	″	
۶۸	۱۳۵۰ھ	۱۹۳۱ء	۲۶	۲۶	۱۰۰۲	۹۱	″	″	″	
۶۹	۱۳۵۱ھ	۱۹۳۲ء	۲۳	۲۸	۱۱۳۸	۱۲۴	″	″	″	
۷۰	۱۳۵۲ھ	۱۹۳۳ء	۲۵	۳۰	۱۱۴۲	۱۵۳	″	″	″	
۷۱	۱۳۵۳ھ	۱۹۳۴ء	۲۷	۳۵	۱۱۱۴	۱۳۶	″	″	″	
۷۲	۱۳۵۴ھ	۱۹۳۵ء	۲۷	۳۶	۱۱۹۶	۱۸۹	″	″	″	
۷۳	۱۳۵۵ھ	۱۹۳۶ء	۲۵	۳۹	۱۱۶۶	۱۵۳	″	″	″	
۷۴	۱۳۵۶ھ	۱۹۳۷ء	۲۵	۴۱	۱۳۸۹	۱۷۸	″	″	″	
۷۵	۱۳۵۷ھ	۱۹۳۸ء	۲۹	۴۴	۱۴۴۷	۱۸۵	″	″	″	

نمبر شمار	سن ہجری	سن عیسوی	تعداد مدرسین	تعداد ملازمین	تعداد طلباء	تعداد فضلاء	سرپرست	اہتمام	صدارت تدریس	کیفیت
۷۶	۱۳۵۸ھ	۱۹۳۹ء	۲۷	۸۸	۱۴۱۶	۱۸۰	"	حضرت مولانا محمد طیب صاحب	"	
۷۷	۱۳۵۹ھ	۱۹۴۰ء	۲۸	۱۱۱	۱۵۰۲	۱۴۴	"	"	"	
۷۸	۱۳۶۰ھ	۱۹۴۱ء	۳۳	۸۴	۱۵۸۰	۱۹۱	"	"	"	
۷۹	۱۳۶۱ھ	۱۹۴۲ء	۳۳	۷۶	۱۲۶۵	۲۰۵	"	"	"	
۸۰	۱۳۶۲ھ	۱۹۴۳ء	۴۰	۷۸	۱۱۶۴	۱۹۴	"	"		
۸۱	۱۳۶۳ھ	۱۹۴۳ء	۳۷	۸۹	۱۳۲۶	۱۵۷	"	"	"	
۸۲	۱۳۶۴ھ	۱۹۴۴ء	۳۵	۸۴	۱۵۰۹	۱۵۶	"	"	"	
۸۳	۱۳۶۵ھ	۱۹۴۵ء	۳۶	۹۸	۱۴۴۲	۱۹۶	"	"	"	
۸۴	۱۳۶۶ھ	۱۹۴۶ء	۳۵	۱۱۵	۱۱۳۴	۲۰۸	"	"	"	
۸۵	۱۳۶۷ھ	۱۹۴۷ء	۳۶	۱۱۱	۱۱۶۳	۱۱۷	"	"	"	
۸۶	۱۳۶۸ھ	۱۹۴۸ء	۳۳	۱۰۰	۱۱۰۳	۱۶۴	"	"	"	
۸۷	۱۳۶۹ھ	۱۹۴۹ء	۳۵	۹۲	۱۰۷۱	۱۵۶	"	"	"	
۸۸	۱۳۷۰ھ	۱۹۵۰ء	۳۶	۹۷	۱۲۰۶	۱۱۹	"	"	"	

نمبر شمار	سن ہجری	سن عیسوی	تعداد مدرسین	تعداد ملازمین	تعداد طلباء	تعداد فضلاء	سرپرست	اہتمام	صدارت تدریس	کیفیت
۸۹	۱۳۷۱ھ	۱۹۵۱ء	۳۴	۱۱۷	۱۲۰۴	۱۲۷	″	حضرت مولانا محمد طیب صاحب		
۹۰	۱۳۷۲ھ	۱۹۵۲ء	۳۴	۱۱۱	۱۲۵۲	۱۴۱	″	″	″	
۹۱	۱۳۷۳ھ	۱۹۵۳ء	۴۱	۱۱۳	۱۱۹۱	۱۲۱	″	″	″	
۹۲	۱۳۷۴ھ	۱۹۵۴ء	۴۳	۱۲۹	۱۳۶۲	۱۵۰	″	″	″	
۹۳	۱۳۷۵ھ	۱۹۵۵ء	۴۳	۱۳۹	۱۳۲۷	۱۴۶	″	″	″	
۹۴	۱۳۷۶ھ	۱۹۵۶ء	۴۳	۱۴۹	۱۳۰۹	۱۴۸	″	″	″	
۹۵	۱۳۷۷ھ	۱۹۵۷ء	۴۵	۱۴۲	۱۳۰۹	۱۸۵	″	″	مولانا محمد ابراہیمؒ	
۹۶	۱۳۷۸ھ	۱۹۵۸ء	۴۴	۱۵۱	۱۳۳۲	۱۶۷	″	″	″	
۹۷	۱۳۷۹ھ	۱۹۵۹ء	۴۱	۱۹۰	۱۴۸۰	۱۴۹	″	″	″	
۹۸	۱۳۸۰ھ	۱۹۶۰ء	۴۱	۱۹۵	۱۵۳۷	۱۹۰	″	″	″	
۹۹	۱۳۸۱ھ	۱۹۶۱ء	۴۱	۱۹۷	۱۵۲۴	۲۲۲	″	″	″	
۱۰۰	۱۳۸۲ھ	۱۹۶۲ء	۴۱	۲۰۰	۱۵۲۲	۲۴۸	″	″	″	
۱۰۱	۱۳۸۳ھ	۱۹۶۳ء	۵۳	۱۶۰	۱۵۶۹	۱۵۸	″	″	″	

نمبر شمار	سن ہجری	سن عیسوی	تعداد مدرسین	تعداد ملازمین	تعداد طلباء	تعداد فضلاء	سرپرست	اہتمام	صدارت تدریس	کیفیت
۱۰۲	۱۳۸۴ھ	۱۹۶۴ء	۴۵	۱۶۳	۱۵۷۷	۲۲۶	〃	حضرت مولانا محمد طیب صاحب	〃	
۱۰۳	۱۳۸۵ھ	۱۹۶۵ء	۴۵	۱۶۶	۱۵۶۳	۲۶۳	〃	〃	〃	
۱۰۴	۱۳۸۶ھ	۱۹۶۶ء	۴۴	۱۶۴	۱۶۴۸	۳۰۴	〃	〃	〃	
۱۰۵	۱۳۸۷ھ	۱۹۶۷ء	۴۷	۱۶۸	۱۴۵۴	۲۳۰	〃	〃	〃	
۱۰۶	۱۳۸۸ھ	۱۹۶۸ء	۴۶	۱۷۸	۱۵۵۲	۲۹۱	〃	〃	حضرت مولانا فخر الدین احمدؒ	
۱۰۷	۱۳۸۹ھ	۱۹۶۹ء	۴۵	۱۷۳	۱۵۷۱	۲۷۰	〃	〃	〃	
۱۰۸	۱۳۹۰ھ	۱۹۷۰ء	۴۳	۱۷۲	۱۴۸۰	۲۵۲	〃	〃	〃	
۱۰۹	۱۳۹۱ھ	۱۹۷۱ء	۴۲	۱۷۵	۱۴۵۸	۳۰۲	〃	〃	〃	
۱۱۰	۱۳۹۲ھ	۱۹۷۲ء	۵۵	۱۵۹	۱۶۰۱	۳۲۶		〃	〃	
۱۱۱	۱۳۹۳ھ	۱۹۷۳ء	۵۹	۱۷۰	۱۵۴۸	۲۵۳	〃	〃	حضرت مولانا سید فخر الحسن صاحب	
۱۱۲	۱۳۹۴ھ	۱۹۷۴ء	۵۹	۱۶۶	۱۵۱۱	۲۹۹	〃	〃	〃	
۱۱۳	۱۳۹۵ھ	۱۹۷۵ء	۶۰	۱۷۷	۱۶۱۲	۳۳۹	〃	〃	〃	
۱۱۴	۱۳۹۶ھ	۱۹۷۶ء	۶۰	۱۹۳	۱۵۸۱	۳۴۳	〃	〃	〃	

مصارف پر ایک نظر

مذکورہ بالا گوشواروں کے اعداد و شمار سے واضح ہے کہ ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۹۶ھ تک ۱۱۴ سال کی مدت میں دار العلوم دیوبند کے مجموعی مصارف کی میزان ۲۸۳۳۰۸۲۱٫۶۲ روپے ہے اور اس مدت میں فضلائے دار العلوم دیوبند کی مجموعی تعداد ۱۱۵۲۴ ہے، اگر ان مصارف کو فضلائے دار العلوم دیوبند پر تقسیم کیا جائے تو فی نفر ۲۴۵۸ روپے ۴۲ پیسے اخراجات ہوئے۔ یہ ۸ سالہ نصاب تعلیم کے مصارف ہیں، یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ فضلائے دار العلوم دیوبند کی اس تعداد (۱۱۵۲۴[له]) میں وہ طلباء شامل نہیں ہیں جنھوں نے دورۂ حدیث سے پہلے اپنی تعلیم چھوڑ دی یا وہ دورۂ حدیث کے سالانہ امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے، یا جنھوں نے محض قرآن شریف ناظرہ پڑھا یا حفظ کیا یا جنھوں نے صرف جدید ادبِ عربی، درجہ فارسی درجہ تجوید، درجہ اُردو دینیات جامعہ طبیہ، درجہ خوش نویسی اور دار الصنائع وغیرہ درجات سے فراغت حاصل کی۔ اگر ان سب کو بھی شامل کیا جائے جن کی تعداد کم و بیش فضلائے دار العلوم دیوبند ہی کی تعداد کے برابر ہے اور دار العلوم کے کم و بیش مصارف بہرحال اُن پر بھی ہوئے ہیں تو مذکورہ بالا اخراجات کا اوسط فی نفر ہزار بارہ سو روپے سے زیادہ نہ ہوگا۔ اِس رقم میں طالب علم کے کھانے، کپڑے، رہنے سہنے، نقد وظائف کے اخراجات اور طلباء کے لئے صحت و صفائی اور روشنی وغیرہ کے انتظامات شامل ہیں، اس کے علاوہ تعمیرات کے مجموعی مصارف

[له] جلد اوّل میں فضلائے دار العلوم کی تعداد میں کتابت کی غلطی ہوگئی ہے، صحیح تعداد یہی ہے جو اوپر درج ہے۔

(۲۳۶،۴۲۲ روپے) اساتذہ اور کارکنوں کے مشاہرے، طلبار کے لئے کتابوں کی فراہمی اور کتابوں کی جلد بندی وغیرہ کے علاوہ دوسرے متفرق اخراجات بھی اسی میں شامل ہیں، تو یہ اوسطِ مصارف اور بھی کم ہو جاتا ہے جسے بلا مبالغہ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی للّٰہیت خلوصِ نیت اور کرامت ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے مصارف کی یہ رقم اس قدر کم ہے جس پر مشاہدے کے بغیر یقین کرنا مشکل ہے، اتنی ارزاں اور کفائت شعارانہ تعلیم مدارسِ دینیہ کے علاوہ کہیں اور نہ مل سکے گی، مدارسِ دینیہ کی یہ خصوصیت بلاشبہ بہت بڑا کارنامہ ہے، اس خصوص میں دارالعلوم دیوبند نے جس حیرت انگیز کفائت شعاری، فقیرانہ زندگی اور سادہ معاشرت کے ساتھ جس اعلیٰ ترین دینی تعلیم کا انتظام کیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے!

چنانچہ ایک مرتبہ صوبۂ متحدہ (موجودہ اُتر پردیش) کے گورنر سرجان اسٹریچی کے سکریٹری جان پامر نے دارالعلوم دیوبند کی اعلیٰ تعلیم کو دیکھ کر کہا تھا کہ :-

> "جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپے کے صَرف سے ہوتا ہے وہ یہاں صِرف چند روپے میں ہو رہا ہے مُسلمانوں کے لئے اس سے بہتر کوئی تعلیم گاہ نہیں ہو سکتی ـــــ بلکہ اگر کوئی غیر مُسلم بھی یہاں تعلیم پائے تو نفع سے خالی نہیں ہے[۱]"

---

[۱] تفصیل کے لئے جلد اوّل باب دوم میں ۱۲۹۱ھ کے حالات ملاحظہ فرمائیے۔

ایک اقتباس

علمائے دیوبند کا اعتدال

"علامہ خالد محمود ایم۔اے، سابق پروفیسر مرے کالج سیال کوٹ (پاکستان) عالی مغربی تعلیم یافتہ ایک ذی علم شخصیت ہیں، انہیں اُردو اور انگریزی تقریر و تحریر میں بڑی دستگاہ حاصل ہے، وہ مدت سے بغرض تبلیغ اسلام انگلستان میں مقیم ہیں، علامہ موصوف نے علمائے دیوبند کی نسبت اپنے جن دقیع اور متوازن تاثرات کا اظہار فرمایا ہے، وہ یہ ہیں"

علمائے دیوبند دین کے سمجھنے سمجھانے میں نہ تو اُس طریق کے قائل ہیں جو ماضی سے یکسر کٹا ہو، کیونکہ وہ مسلسل رشتہ نہیں، ایک نئی راہ ہے اور نہ وہ اس افراط کے قائل ہیں کہ رسم و رواج اور تقلید آباء کے تحت ہر بدعت کو اسلام میں داخل کر دیا جائے، جن اعمال میں تسلسل نہ ہو اور وہ تسلسل خیر القرون تک مسلسل نہ ہو وہ اعمال اسلام نہیں ہو سکتے، یہ حضرات اس تقلید کے پوری طرح قائل اور پابند ہیں، جو قرآن و حدیث کے سرچشمہ سے فقہ اسلام کے نام پر چلتی آئی ہے، قرآن کریم تقلید آباء کی صرف اسی بناء پر مذمت کرتا ہے کہ وہ آباء عقل و اہتداء کے نور سے خالی ہوں۔

اولوکان اباؤھم لا یعقلون شیئًا ولا یھتدون (پ ۲) ترجمہ:۔ بھلا اگرچہ انکے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ راہ کو جانتے ہوں۔

ائمہ سلف اور فقہائے اسلام جو علم و اہتداء کے نور سے منور تھے، انکی پیروی نہ صرف یہ کہ مذموم نہیں بلکہ عین مطلوب ہے اور ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ صرف پیغمبروں ہی کی نہیں، صدیقین

شہدا، اور صالحین کے راستے پر چلنے کی بھی ہر نماز میں رب العزت سے درخواست کریں، کیونکہ یہی صراط مستقیم ہے۔

اھدنا الصراط المستقیم ہ صراط الذین انعمت علیھم (پ ۱) ترجمہ:۔ اے اللہ! چلا ہمیں سیدھی راہ پر، راہ ان لوگوں کی جن پر تونے انعام کیا۔

اس مسلکِ اعتدال کیوجہ سے علمائے دیوبند دینی بے قیدی اور خود رائی سے بھی محفوظ رہے اور شرک و بدعت کے اندھیرے بھی اُنھیں اپنے جال میں نہ کھینچ سکے، ان کے اعمال وافکار سے اسلام کا تسلسل بھی قائم رہا اور کوئی غیر مسلسل نظریہ وعمل دین کے نام سے اسلام میں داخل بھی نہ ہونے پایا، یہ حضرات علم وعمل کے تسلسل سے اسلام کے چراغ روشن کرتے گئے اور تاریخ دیوبند پر نظر کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام واقعی ایک زندہ دین ہے، جو ان حضرات سے لے کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہدِ سعادت مہد تک مسلسل ہے۔

اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کا طبقہ علمائے دیوبند کی روسے اُمت کے لئے روحِ رواں کی حیثیت رکھتا ہے، جس سے اس امت کی باطنی حیات وابستہ ہے جو اصل حیات ہے، اس لئے علمائے دیوبند ان کی محبت وعظمت کو تحفظِ ایمان کے لئے ضروری سمجھتے ہیں، مگر غلو کے ساتھ اس محبت وعقیدت میں انھیں ربوبیت کا مقام نہیں دیتے، ان کی تعظیم شرعاً ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس کے معنی عبادت کے نہیں لیتے کہ انھیں یا ان کی قبروں کو سجدہ ورکوع یا طواف ونذر یا منت وقربانی کا محل بنا لیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ حضرت سید احمد کبیر رفاعیؒ حضرت شیخ علی ہجویریؒ، حضرت شیخ معین الدین چشتیؒ، حضرت امام ربانی مجدد الفِ ثانیؒ اور حضرت الامام المحدث شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے صحیح جانشین اور اُنکے فیوض سے زندگی کے خاکوں میں اتباعِ سنت کا رنگ بھرنے والے یہی بزرگانِ کرام ہیں، ان حضرات کا فیضِ روحانی اعمالِ تسخیر سے نہیں، اعمالِ سنت سے قائم ہے اور یہ حضرات باقاعدہ چشتی سُہروردی، نقشبندی اور قادری نسبتوں سے انتساب رکھتے ہیں، بلکہ اگر انصاف سے دیکھا

جائے تو حکمت اور تزکیہ نفوس کا یہ رستہ اب صرف اسی مسلک کے لوگوں سے آباد ہے، یہ حضرات علم و عمل ہر دو ابواب میں اسنادی پہلو قائم رکھتے ہیں، بدعات کی روک تھام میں بھی یہ حضرات اسی لئے پیش پیش رہے کہ اُن کے اعمال کا اسنادی پہلو کہیں موجود نہ تھا اور یہ تردید بھی نئی نہیں بلکہ حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندیؒ (مجدد الفِ ثانی) بھی اسی رنگ میں بدعات کی تردید فرماتے رہے ہیں۔

"اجتناب از اسم و رسم بدعت تا از بدعتِ حسنہ در رنگ بدعت سیئہ احتراز ننماید بوئے ازیں دولت بمشام جان او نرسد و ایں معنی امروز متعسر است کہ عالم در دریائے بدعت غرق گشتہ است بظلمات بدعت آرام گرفتہ کرا مجال است کہ دم از رفع بدعت زند و باحیائے سنت لب کشاید اکثر علماء ایں وقت رواج دہندہائے بدعت اند و محو کنندہ ہای سنت بدعتہائے پہن شدہ را تعامل خلق دانستہ بجواز بلکہ باستحسان آں فتوے مے دہند و مردم را ببدعت دلالت می نمایند" (مکتوب ۵۴ دفتر دوم حصہ ہفتم)

ترجمہ: بدعت کے نام اور عمل سے بھی پرہیز لازم ہے جبتک بدعت حسنہ سے بھی اسی طرح پرہیز نہ کرے جسطرح بدعت سیئہ سے پرہیز کیجاتی ہے، روحانیت کی بُو طالب کے دماغ تک نہیں پہنچ سکتی اور یہ بات آج بہت مشکل ہوگئی ہے ایک جہان بدعت کے دریا میں ڈوب رہا ہے اور لوگ بدعت کے اندھیروں میں آرام لے رہے ہیں، کس کی مجال ہے کہ بدعت کے خلاف دم مارے اور احیائے سنت کیلئے زبان کھولے اسوقت اکثر مولوی بدعتوں کو رواج دے رہے ہیں اور سنتوں کو مٹا رہے ہیں، رواج یافتہ بدعتوں کو تعامل قرار دیکر انکے جائز بلکہ بہتر ہونیکا فتویٰ دے رہے ہیں اور لوگوں کو بدعت کی راہ دکھا رہے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جن علماء ربانی کی تمنا کی تھی کہ احیائے سنت کے لئے زبان کھولنے والے اور بدعات کے خلاف دم مارنے والے کہاں ہیں؟ ان کی یہ تمنا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندان اور اسی تحریک کی نشاۃ ثانیہ حضرات اکابرِ دیوبند سے پوری ہوئی۔

فللہ المنۃ۔

مآخذ و مراجع

۱ الشورۃ الہندیہ ۔ مولانا فضلِ حق خیرآبادی، مطبوعہ مدینہ پریس بجنور

۲ ارواحِ ثلاثہ ۔ مجموعہ روایات امیر شاہ خاں، مطبوعہ آزاد پریس دیوبند

۳ اشرف السوانح ۔ خواجہ عزیزالحسن مجذوب شائع کردہ کتب خانہ اشرفیہ دہلی

۴ انوارِ قاسمی ۔ مولانا انوار الحسن شیرکوٹیؒ، مطبوعہ لاہور

۵ ایضاح البخاری ۔ مرتبہ مولانا ریاست علی، مطبوعہ آزاد پریس دیوبند ۱۳۸۰ھ

۶ پروفیسر ہمایوں کبیر دارالعلوم دیوبند میں از سیّد محبوب رضوی
شائع کردہ دارالعلوم دیوبند

۷ تاریخ دیوبند ۔ سیّد محبوب رضوی ۔ طبع دوم آزاد پریس دیوبند ۱۹۷۲ء

۸ تاریخ مظاہر علوم سہارن پور ۔ از حضرت مولانا محمد زکریا صاحب، کتب خانہ
اشاعت العلوم سہارنپور

۹ تحریک شیخ الہندؒ ۔ مرتبہ مولانا محمد میاں دیوبندی ۔ شائع کردہ الجمعیۃ بکڈپو
دہلی ۱۹۷۵ء

۱۰ تذکرہ ساداتِ رضویہ دیوبند ۔ سیّد محبوب رضوی، مطبوعہ محبوب پریس دیوبند

۱۱ تذکرۃ العابدین ۔ مولوی نذیر احمد دیوبندی ، مطبوعہ دلی پرنٹنگ پریس دہلی ۱۳۳۴ھ

۱۲ تذکرہ مولانا فضل رحمٰن ، مولانا سیّد ابوالحسن ندوی مطبوعہ لکھنؤ

۱۳ تقریر مبارک حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی ۔ مرتبہ مولانا محمد طاہر قاسمی
مطبع قاسمی دیوبند ۱۳۵۳ھ

۱۴ جامع المجدّدین ۔ مولانا عبدالباری ندوی ۔ نامی پریس لکھنؤ

۱۵ حیات شیخ الہند ۔ مولانا میاں سید اصغر حسین دیوبندی ۔ شائع کردہ
کتب خانہ اصغریہ دیوبند ۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۹ء

۱۶ دارالعلوم کی سو سالہ زندگی ۔ از حضرت مولانا محمد طیّب صاحب ، شائع کردہ
دارالعلوم دیوبند

۱۷ دارالعلوم دیوبند کا نصاب تعلیم ۔ شائع کردہ دارالعلوم دیوبند مطبوعہ ۱۳۹۷ھ

۱۸ ذاتی ڈائری ۔ مولانا عبیداللہ سندھی ۔ سندھ ساگر اکیڈیمی لاہور

۱۹ رجسٹر نقول اسناد ۔ دارالعلوم دیوبند ۔ غیر مطبوعہ

۲۰ روداد ہائے دارالعلوم دیوبند ۱۲۸۳ھ لغایۃ ۱۳۶۰ھ و ۱۳۷۱ھ لغایۃ ۱۳۹۰ھ

۲۱ روداد دارالعلوم دیوبند ۔ تحصیل غلّہ ۱۳۳۲ھ و ۱۳۷۴ھ

۲۲ رودادِ عمل دارالعلوم دیوبند ۔ ۱۳۸۳ھ لغایۃ ۱۳۹۶ھ

۲۳ سرگذشت مجاہدین ۔ مولانا غلام رسول مہر ۔ مطبوعہ علمی پریس لاہور ۱۳۵۶ھ

۲۴ سوانح قاسمی ۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی ۔ مطبوعہ نیشنل پریس دیوبند

۲۵ سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری ۔ مطبوعہ شاہی پریس لکھنؤ ۱۹۶۴ء

۲۶ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ
مرکنٹائل پریس لاہور ۱۹۴۴ء

۲۷ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ۔ مرتبہ مولانا ظفیر الدین صدیقی شائع کردہ دارالعلوم دیوبند

۲۸ فتاویٰ رشیدیہ ۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ۔ مکتبہ رحیمیہ دہلی

۲۹ فہرست مطبوعات و مخطوطات، کتب خانہ دارالعلوم دیوبند، مرتبہ مولانا ظفیرالدین صدیقی ۱۹۷۳ء

۳۰ کاغذات محفوظ محافظ خانہ دارالعلوم دیوبند

۳۱ کتاب معائنہ، دارالعلوم دیوبند (غیر مطبوعہ)

۳۲ مآثرِ صدیقی ۔ نواب علی حسن خاں ۔ نول کشور پریس لکھنؤ

۳۳ مآثرالکرام ۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی ۔ مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ ۱۳۲۸ھ

۳۴ مثنوی فروغ ۔ مولانا عبدالکریم فروغ دیوبندی، مطبوعہ مطبع نظامی کانپور ۱۳۰۳ھ

۳۵ مجموعہ فتاویٰ ۔ مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلیؒ، مطبوعہ علوی پریس لکھنؤ

۳۶ مجموعہ مکاشفات استدراک الامیر من اسرار اللطیف الخبیر ۔ مولانا میر باز خاں مطبوعہ بلالی اسٹیم پریس ساڈھورہ

۳۷ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی

۳۸ مکتوباتِ نبوی، سید محبوب رضوی، مطبوعہ محبوب پریس دیوبند

۳۹ مکتوبات یعقوبی ۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مطبوعہ دلّی پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۲۹ء

۴۰ منتخب التواریخ ۔ ملا عبدالقادر بدایونی ۔ مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ

۴۱ مولانا محمد احسن نانوتوی ۔ محمد ایوب قادری، مطبوعہ جاوید پریس کراچی ۱۹۶۶ء

۴۲ میری داستانِ حیات ۔ مصنفہ راجہ مہندر پرتاپ

۴۳ نزہت الخواطر ۔ مولانا حکیم عبدالحیٔؒ ——— مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد دکن

۴۴ نقشِ حیات ۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ، مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۵۴ء ۱۳۷۳ھ

۴۵ وحدت الوجود والشہود ، ترجمہ ثناء الحق دیوبندی ، مطبوعہ ایجوکیشنل پریس کراچی

۴۶ ہندوستان کا نصابِ درس اور اس کے تغیرات ، مولانا حکیم سید عبدالحی مطبوعہ تنویر پریس لکھنؤ

رسائل واخبارات

---

۱ الجمعیۃ (روزنامہ) دہلی ۔ نومبر ۱۹۷۱ء

۲ العلم (ماہنامہ) کراچی جنوری تا مارچ ۱۹۶۰ء

۳ القاسم (ماہنامہ) ذیقعدہ ۱۳۳۰ھ

۴ دارالعلوم دیوبند (ماہنامہ) جمادی الاولیٰ ۱۳۷۳ھ ، سید محمد ازہر شاہ قیصر

۵ رہبر (اخبار) بمبئی یکم اپریل ۱۹۴۵ء ، ایڈیٹر مسز کلثوم سایانی

۶ مدینہ (اخبار) بجنور ۱۹۴۹ء